تعلیم پائے ہوئے طبقہ نے ملک کے عوام سے الگ تھلگ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس ملک میں جہاں اور بہت سی ذاتیں تھیں وہاں انگریزی تعلیم یافتوں کی ایک ذات اور بن گئی جس کی پوری توجہ "تعلیم" سے زیادہ "ڈگری یافت" پر رہی۔ غرض کہ اس تعلیمی نظام سے افراد کو فائدہ ہوا ہو تو ہوا ہو لیکن قومی اعتبار سے اتنا فائدہ نہ ہوا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ قومی لحاظ سے ہندوستان کا تعلیمی معیار پچھلی ایک صدی میں دنیا کے دوسرے متمدن ملکوں کے مقابلہ میں انتہا درجہ پست رہا اور اب بھی ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک اس تعلیمی نظام پر عاید ہوتی ہے جو میکالے کی یادداشت کے بموجب بنٹنک نے ہندوستان میں رائج کیا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ انگریزی زبان کی ترویج سے اہل ہند کو بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ چاہے وہ ایک محدود طبقہ ہی کو کیوں نہ ہو لیکن مغربی ادب اور سائنس سے جو واقفیت حاصل ہوئی اس کا اثر لازمی طور پر قومی شعور پر پڑا۔ کسی قومی زبان کے موجود نہ ہونے کے باعث ملک کے ایک حصہ کے ہندوستانی دوسرے حصوں کے ابنائے وطن سے انگریزی کے ذریعے خیال کا تبادلہ کرنے لگے۔ لیکن سب سے زیادہ فائدہ اس نئی تعلیمی حکمت عملی سے انگریزی حکومت کو حاصل ہوا۔ اسے اب اپنے دفتروں کے کام کے لئے کم تنخواہ پر انگریزی جاننے والے ملنے لگے۔ بنٹنک نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اگر معمولی معمولی عہدوں پر بھی انگریزوں کو رکھا گیا تو حکومت کا مالیہ اتنا زیر بار ہو جائے گا کہ اس کو سنبھالنا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کی یہ تجویز گہری مصلحت پر مبنی تھی کہ کارنوالس کی حکمت عملی کے خلاف اہل ہند کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا جائے بشرطیکہ عام اصول حکومت کا تعین اعلیٰ انگریز افسر کرتے رہیں۔ نئے تعلیمی نظام سے اہل ہند کے اوسط طبقہ کے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی۔ میکالے اور بنٹنک کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام پر ہندوستان میں گزشتہ سو سال سے زائد سے عمل ہو رہا ہے، اگرچہ اس

دوران میں اس میں کبھی کبھی تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ حکومت نے مشرقی علوم کی حوصلہ افزائی بنٹنگ کے جانے کے بعد ہی شروع کردی تھی اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کے کمپنی اپنے آپ کو سخت پیچیدگیوں میں پھنسا لے گی۔ چنانچہ لارڈ آکلینڈ نے اس امر کا یقین دلایا کہ مشرقی علوم کے جو مدرسے ہیں ان کی امداد کی جائے گی تاکہ اعلیٰ قابلیت کے استادوں سے استفادہ کیا جا سکے۔ نیز اس بات کی وضاحت کی گئی کہ وسطانی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے لئے مادری زبان کا استعمال مناسب ہے۔

خارجی حکمت عملی بنٹنگ اور رنجیت سنگھ کی ملاقات۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کا عہد حکومت وہ زمانہ ہے جبکہ روس کی قوت وسط ایشیا میں روز بروز بڑھ رہی تھی اور انگریزی حکومت کو بجا طور پر اس کی طرف سے بڑا کھٹکا تھا کہ کہیں وہ ہندوستان کی سرحد تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کی تربیت یورپین اصول کے مطابق کرائی تھی اور خود اس کی نگرانی اپنے ذمہ لی تھی۔ اس نے دو فرانسیسی افسروں ونتورا اور الارڈ کو جو نپولین کی فوج میں افسروں کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اپنی ملازمت میں لے لیا تھا۔ پنجاب کے دوسرے سرداروں کو نیچا دکھانے کے بعد اس نے کشمیر اور افغانستان کی سرحد کے علاقے جن میں پشاور شامل تھا فتح کر لئے تھے۔ اگرچہ سید احمد شہید اور شاہ محمد اسمٰعیل نے رنجیت سنگھ کے خلاف سرحد کے پٹھانوں کو جہاد کے لئے ابھارا اور شروع میں انھیں بھی کامیابی ہوئی لیکن مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سکھ فوجوں نے انھیں شکست دی اور وہ دونوں جنگ میں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد رنجیت سنگھ کی گرفت پشاور اور دوسرے سرحدی علاقوں پر مضبوط ہوگئی اور وہاں کے رہنے والوں پر اس نے بڑے ظلم ڈھائے[1]۔ اس کی سالانہ آمدنی تقریباً ڈھائی کروڑ روپے

[1] Henry Lawrence, An Adventurer in the Punjab, Ch. II.

تھی اور کہا جاتا ہے کہ دس کروڑ سے زائد روپیہ اس کے خزانہ میں نقد موجود تھا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزی قوت اور وسیلوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں اس نے امرتسر کے مقام پر انگریزوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا کہ وہ ستلج کے پار اپنا مرکز قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا کمپنی کی حکومت بھی رنجیت سنگھ سے بگاڑ نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ وہ ملک کے دوسرے حصوں میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی فکر میں تھی۔ بنٹنک کے عہد حکومت میں مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) کے صدر نے بادشاہ ولیم چہارم کے ایماء پر رنجیت سنگھ کو چند اعلیٰ قسم کے گھوڑے بطور تحفہ کے روانہ کئے۔ اس کے چند مہینے بعد اکتوبر ۱۸۳۱ء میں دریائے ستلج کے کنارہ روپڑ کے مقام پر بنٹنک اور رنجیت سنگھ کی ملاقات ہوئی۔ دونوں طرف سے انواع واقسام کے قیمتی تحفے پیش کئے گئے۔ ایک ہفتہ تک دید، بازدید اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کمپنی اور رنجیت سنگھ کے درمیان سیاسی تعلقات مضبوط کئے جائیں اور ان میں دوستی ہمیشہ برقرار رہے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ محض دوستی کو مضبوط کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی دید اور بازدید کی غالباً ضرورت نہ تھی۔ ممکن ہے کہ افغانستان کے معاملے بنٹنک اور رنجیت سنگھ دونوں کی بحث میں آئے ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ شاہ شجاع اس زمانے میں لدھیانہ میں انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ روپڑ میں رنجیت سنگھ اور بنٹنک کی اکتوبر ۱۸۳۱ء میں جب ملاقات ہوئی تو اس سے کچھ پہلے شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ سے اپنا افغانستان کا کھویا ہوا تخت واپس لینے کے متعلق سیاسی بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس میں شبہ نہیں شاہ شجاع نے جب بنٹنک کو اس ضمن میں براہ راست لکھا تھا تو اس نے اس کے معاملے میں دخل دینے سے انکار کیا تھا۔ بنٹنک کو حکومت انگلستان

لہ H. Beveridge, A Comprehensive History of India, Vol. III, p. 228

سے صرف یہ ہدایتیں ملی تھیں کہ وہ وسط ایشیا اور افغانستان کے سیاسی حالات سے باخبر رہے۔ ممکن ہے کہ شاہ شجاع رنجیت سنگھ کے توسط سے انگریزی حکومت کو آمادہ کرانا چاہتا ہو کہ وہ اس کا تخت و تاج واپس دلانے میں اسے مدد دے۔ لیکن اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء میں شاہ شجاع نے سندھ کے امیروں کی تھوڑی بہت امداد سے قندھار پر چڑھائی کی لیکن امیر دوست محمد خاں نے اس کو شکست دے کر قلات کی طرف بھگا دیا جہاں سے وہ لدھیانہ واپس آگیا اور مناسب حالات کا انتظار کرنے لگا۔

سندھ کے امیروں سے معاہدہ

امیران سندھ کے علاقوں پر کچھ عرصے سے رنجیت سنگھ کا دانت تھا۔ دریائے انڈس کے کنارہ شکارپور کی تجارتی منڈی کی ساکھ اس زمانے میں مشہور تھی اور وسط ایشیا سے لے کر بنگال تک وہاں کے تاجروں کی ہنڈیاں چلا کرتی تھیں۔ رنجیت سنگھ یہ بھی جانتا تھا کہ سندھ کے امیروں کے پاس فوج ناکافی ہے اور خزانہ میں بیس کروڑ سے زائد رقم جمع ہے۔ ان تمام معاملوں کی اطلاع برنس کے ذریعہ سے حکومت ہند کو پہنچ چکی تھی معلوم ہوتا ہے کہ بنٹنک اور رنجیت سنگھ کی ملاقات کے دوران میں سندھ کا معاملہ بھی زیر بحث آیا ہوگا اس لئے کہ ملاقات کے دو مہینے بعد بنٹنک نے کرنل پوٹنگر کو سندھ کے امیروں کی خدمت میں تجارتی معاہدہ کی غرض سے روانہ کیا تاکہ معاملے ایک فیصل شدہ صورت اختیار کرلیں اور سندھ میں رنجیت سنگھ کے اقدام کا راستہ بند ہو جائے۔ سندھ کے امیروں نے شروع میں کرنل پوٹنگر کی درخواست کو شبہ کی نظر سے دیکھا اس واسطے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر کمپنی سے کسی قسم کا تعلق قائم ہو گیا اور کچھ رعایتیں دے دی گئیں تو آئندہ کے مطالبوں کے لئے راہ کھل جائے گی۔ لیکن زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے آخر انھوں نے ایک تجارتی معاہدہ پر دستخط کر دئے اور دریائے سندھ میں کمپنی کو جہاز رانی کی اجازت مل گئی۔ یہ بھی طے ہوا کہ انگریزی مال پر امیران سندھ جو محصول لگائیں گے

اس کا تعین کر دیا جائے گا۔ محصول کی رقم برائے نام تھی۔ معاہدہ میں یہ شرط بھی رکھی گئی کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مقبوضات کا احترام کریں گے اور الحاق کی غرض سے دست درازی نہیں کریں گے۔ لیکن اس شرط پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس معاہدے کے گیارہ سال بعد سندھ کا پورا علاقہ برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا جو کمپنی کے سیاسی اخلاق پر ایک بدنما دھبہ رہے گا۔ بنٹنک نے خاص طور کرنل ویڈ کو اپنی جانب سے رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا تاکہ سندھ کے معاہدے کے متعلق اگر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو تو اس کو دور کر دے۔ رنجیت سنگھ کو یقین دلایا گیا کہ سندھ کی جہاز رانی سے اس کے مفاد کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اودھ کے معاملات

کچھ عرصے سے اودھ کے معاملات میں خرابی پیدا ہو رہی تھی۔ نواب نصیر الدین کا زیادہ وقت عیش و عشرت میں گزر رہا تھا۔ انتظام کی ابتری اس درجہ پر پہنچ گئی کہ بڑے بڑے زمینداروں نے مالگزاری ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بغیر فوج کشی اور تشدد کے محاصل وصول نہیں ہو سکتے تھے۔ بنٹنک نے خود اودھ کا دورہ کیا اور وہاں کی بدنظمی کا اس کو یقین ہو گیا تو اس نے نواب کو صاف الفاظ میں آگاہ کیا کہ اگر جلد اصلاح کی صورت نہ نکلی تو ملک کا انتظام اس کے ہاتھ سے لے لیا جائے گا۔ اس فہمائش کا یہ اثر ہوا کہ نواب نے میر مہدی علیخاں کو جسے اس نے برطرف کر دیا تھا وزارت سپرد کی۔ میر مہدی علی خاں پر انگریزی حکومت کو بھروسا تھا۔ اس نے معاملات کی درستی میں اپنی خداداد قابلیت کو صرف کیا اور نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اصلاح کی۔ چونکہ انگریزی رزیڈنٹ کی اس کو حمایت حاصل تھی اس لئے اس نے نواب کے ذاتی اخراجات اور محل کی فضول خرچیوں میں بھی کمی کی جو نواب کو بہت ناگوار ہوا۔ چنانچہ نواب نے اس کے خلاف یہ الزام لگا کر کہ اس نے نواب کی والدہ کا تذکرہ مناسب ادب و آداب سے نہیں کیا اور نواب کے والد ماجد کی تصویر کی توہین کی اس کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ بنٹنک نواب کی مرضی کے خلاف وزیر کی تائید

نہیں کر سکتا تھا۔ میر مہدی علیخاں استعفیٰ دینے کے بعد برطانوی علاقہ میں رہنے لگا۔ اودھ کی بد انتظامیوں کے متعلق بنٹنک نے مجلس نظما کو پورا کچا چٹھا لکھ بھیجا چنانچہ مجلس نظما نے اس کو مجاز گردانا کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو اودھ کو برطانوی ہند میں ملحق کر لے اور نواب کی گزر بسر کے لئے وظیفہ مقرر کر دے۔ لیکن بنٹنک نے صرف اتنا کیا کہ مجلس نظما سے جو مراسلہ اسے موصول ہوا تھا اس کے خلاصے سے نواب کو مطلع کر دیا اور اس کے ساتھ اس نے توقع ظاہر کی کہ بہت جلد اودھ میں ایسی انتظامی اصلاحیں کی جائیں گی جن سے رعایا کی فلاح اور بہبود کی ترقی ہو گی۔ اودھ کے معاملوں میں آئندہ اور زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور بیس سال بعد ڈلہوزی نے اس کو برطانوی ہند میں ملحق کر لیا۔

حیدرآباد کے امراء اور پامر اینڈ کمپنی

پامر اینڈ کمپنی کا سرکار نظام پر جو قرض تھا اس کی ادائی حکومت ہند نے شمالی سرکار کے لگان کی پیش کش کی رقم سے کر دی تھی۔ لیکن حکومت کے قرضے کے علاوہ پامر اینڈ کمپنی کی بعض امراء پر بھی بڑی بڑی رقمیں قرض تھیں۔ سر چارلس مٹکاف نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کی حیثیت سے پامر اینڈ کمپنی کی زیادہ ستانیوں کا اچھی طرح سے بھرم کھول دیا تھا۔ خود انگلستان میں بھی رائے عامہ اس ساہوکارہ کے سخت خلاف ہو گئی تھی۔ چنانچہ مجلس نظما (کورٹ آف ڈائرکٹرز) نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ چونکہ پامر اینڈ کمپنی نے پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے اس قانون کی خلاف ورزی کی ہے جس کی رو سے اس کی صراحت کی گئی تھی کہ ہز مجسٹی ملک معظم کی حکمرانی میں رہنے والا کوئی فرد یکم اگست ۱۷۷۴ء کے بعد سے ہندوستان میں ۱۲ فی صدی شرح سود پر قرض دینے کا مجاز نہ ہو گا۔ لیکن اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو اس کا قرضہ منسوخ سمجھا جائے گا اور اسے اس ضمن میں مطالبہ کا کوئی حق نہیں رہے گا لیکن پامر اینڈ کمپنی نے جب اس معاملہ کی انگلستان کی عدالت میں اپیل کی تو ججوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجلس نظما نے جس قانون کا حوالہ دیا ہے اس کا اطلاق

برطانوی ہند کے لئے ہے نہ کہ خود مختار والیان ملک کے علاقوں کے لئے۔
مجلس نظما نے جب یہ اعلان کر دیا کہ پامر اینڈ کمپنی کے قرض کے مطالبے ناجائز ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مقروض لوگوں کو ایک بہانہ مل گیا اور وہ قرض کی ادائی میں ٹالم ٹول کرنے لگے۔ حیدرآباد میں منیر الملک پر قرضہ کی بڑی رقم تھی۔ پامر اینڈ کمپنی نے کوشش کی کہ حکومت ہند کے ذریعہ سے سرکار نظام پر زور ڈلوائے کہ مقروض امرا کا قرض ادا کیا جائے۔ مجلس نظماء نے پامر اینڈ کمپنی کے قرضہ کے ناجائز ہونے کا اعلان کر دیا۔ بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) اس اعلان کے خلاف تھا۔ اس اختلاف نے سخت صورت اختیار کر لی۔ جولائی سنہ ۱۸۳۰ء میں مجلس نظما نے گورنر جنرل کو بھیجنے کے لئے مراسلہ کا یہ مسودہ تیار کیا کہ پامر اینڈ کمپنی کے قرضوں کی وصولیابی میں حکومت ہند کو مطلق دلچسپی نہیں لینی چاہئے بورڈ آف کنٹرول نے مراسلہ کی عبارت اس طرح بدل دی کہ رزیڈنٹ حیدرآباد کو اختیار دینا چاہئے کہ وہ پامر اینڈ کمپنی کے قرضے وصول کرنے میں جو اثر استعمال کر سکتا ہے کرے۔ اس پر مجلس نظما نے بڑی نکتہ چینی کی آخر اس تو تو میں میں کا یہ نتیجہ ہوا کہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ مارچ سنہ ۱۸۳۲ء میں بورڈ آف کنٹرول نے مجلس نظماء کو پامر اینڈ کمپنی کے قرضوں کے تعلق دوسرا مسودہ تیار کرنے کی ہدایت دی۔ یہ مسودہ جب تیار کر کے بورڈ کو بھیجا گیا تو اس کو بھی رد کر دیا گیا۔ آخر بورڈ آف کنٹرول نے من مانے طور پر اپنی ذمہ داری پر یہ فیصلہ کر دیا کہ چونکہ معاملہ حکومت برطانیہ اور سرکار نظام دونوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے بورڈ کی رائے قطعی ہوگی۔ اس مراسلہ میں سرکار نظام کے سامنے تصفیہ کی دو صورتیں پیش کی گئیں۔ یا تو معاملہ ایک کمیشن کے سپرد کیا جائے جو تحقیق کر کے اپنی تنقیحیں پیش کرے یا ثالثی کے ذریعہ فیصلہ کر دیا جائے۔ کمیشن کی صورت میں ارکان کو گورنر جنرل نامزد کرے گا اور ثالثی کی صورت میں بھی ثالث کو وہی مقرر کریگا۔ سرکار نظام سے توقع کی جائے گی کہ جلد سے جلد اس معاملہ کا تصفیہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ سرکار نظام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ مجلس نظماء نے غلطی سے پامر اینڈ کمپنی کے جائز مطالبوں کے خلاف اعلان

کر دیا اس لئے سرکار نظام کے ایک اندرونی معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت ہوئی جس کی نوعیت سفارش کی تصور کرنی چاہیئے۔

مجلس نظماء نے بورڈ کے اس رویہ کو آئین کے خلاف بتایا اور یہ استدلال کیا کہ بورڈ کو یہ حق تو ہے کہ مجلس نظماء کے کسی ایسے مراسلہ کے الفاظ میں ترمیم یا تبدیلی کر سکے جس کا تعلق ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کے سول، فوجی یا مالی معاملات سے ہو۔ بورڈ صلح، جنگ یا دیسی والیان ملک سے سیاسی گفت و شنید میں مجلس نظماء سے بے مشورہ کئے براہ راست احکام بھیج سکتا ہے لیکن اگر کوئی ایسی صورت نہ ہو تو اس کو ایسا کرنے کا آئینی حق حاصل نہیں ہے۔ مگر پامر اینڈ کمپنی کے قرضے کی وصول یابی کا معاملہ متذکرہ بالا شقوں میں سے کسی کے تحت نہیں آسکتا اس لئے بورڈ آف کنٹرول مجاز نہیں کہ اس ضمن میں راست احکام بھیجے۔ چونکہ بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز دونوں اپنی اپنی رائے پر اڑے ہوئے تھے اس لئے معاملہ شاہی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے بورڈ آف کنٹرول کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ سے بورڈ آف کنٹرول کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اور چونکہ قانون کے الفاظ میں ابہام پایا جاتا تھا اس لئے پارلیمنٹ میں اس کی ترمیم اس طور پر کر دی گئی کہ بورڈ آف کنٹرول کو تمام پبلک نوعیت کے معاملوں میں قطعی احکام نافذ کرنے کا دستوری اختیار حاصل ہو گیا۔ بورڈ آف کنٹرول کے منشاء کے بموجب پامر اینڈ کمپنی کے قرضے جو حیدرآباد میں تھے ان میں سے بیشتر رزیڈنٹ کے اثر سے وصول ہو گئے اور جو رہ گئے وہ رہ گئے۔[1]

الحاقات

اگرچہ لارڈ ولیم بنٹنک کی حکمت عملی توسیع سلطنت کی نہ تھی پھر بھی بعض الحاقات اسکے عہد حکومت میں کئے گئے۔ شمال مشرقی بنگال کے کوہستانی علاقہ میں کچار کی ریاست کا راجا ۱۸۳۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ ریاست میں ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ رعایا کی خواہش کے بموجب اس ریاست کو بنٹنک نے انگریزی علمداری میں شامل کرنیکا حکم دیدیا۔ اگرچہ اس ریاست کے الحاق کی یہ تھی کہ انگریز سرمایہ داروں

[1] Beveridge, A Comprehensive History of India Vol. III, p. 218.

نے چائے کی کاشت میں ایک کروڑ روپے سے زیادہ کا سرمایہ یہاں لگایا۔ یہاں کا کوہستانی علاقہ چائے کی کاشت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ چونکہ چائے کا استعمال انگلستان اور یورپ کے دوسرے حصوں میں بہت بڑھ رہا تھا اس لیے اس کی کاشت میں آئندہ اور زیادہ منافع کی توقع تھی۔ کچھار کے علاوہ جنوبی ہند میں کورگ کی ریاست کا بھی الحاق ہوا جو ساحل ملابار پر ریاست میسور اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔ اس ریاست کو انگریزوں نے ٹیپو سلطان سے بچایا تھا اور انگریزی حکومت نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہاں کچھ عرصہ سے بڑی بد انتظامی پھیلی ہوئی تھی۔ راجا بڑا بدمزاج اور بے رحم تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے متعدد افراد کو مروا ڈالا جب گورنر مدراس نے سمجھایا تو راجا نے نہایت گستاخانہ جواب دیا۔ آخر گورنر جنرل کے حکم سے راجا کو ہٹا کے کورگ کی ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ یہ علاقہ قہوہ کی کاشت کے لئے خاص طور پر موزوں تھا اور بہت سے انگریز سرمایہ داروں نے اس میں اپنا سرمایہ لگایا۔ کورگ کا انتظام ایک چیف کمشنر کے سپرد کر دیا گیا۔

میسور میں اس زمانہ میں راجا کرشن راج کی حکومت تھی جو ظالم اور رعایا کی بھلائی کا کچھ خیال نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دیوان پورنیا کو الگ کر دیا اور خود حکومت کا کاروبار چلانے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔ سر طامس منرو گورنر مدراس نے ہر چند راجا کو سمجھایا کہ اپنے معاملے درست کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا۔

اس کے عہد حکومت میں اعلیٰ عہدے بکنے اور رعایا پر نئے نئے محاصل لگائے جانے لگے۔ آخر تنگ آکر رعایا نے بغاوت کر دی۔ انگریزی فوج کی مدد سے بغاوت فرو کی گئی اور ایک اعلان کر دیا گیا کہ جس شخص کو شکایت ہو وہ برطانوی حکام کے روبرو پیش کرے۔ رعایا نے انگریز حکام پر بھروسا کیا اور اپنی شکایتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ انگریزی حکومت کو جب ریاست میسور کے اصلی حالات کا براہ راست علم ہوا تو بنٹنک نے باوجود

اس کے کہ وہ عدم مداخلت کے اصول کا قائل تھا عارضی طور پر میسور کے پورے علاقے کو برطانوی اقتدار کے تحت کر لینے کا اعلان کر دیا۔ راجا کے لئے چار لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جتنی مالگزاری وصول کی جائے گی اس کا ⅕ حصہ اس کے لئے خاص کر دیا گیا۔ ریاست میسور کا انتظام آئندہ پچاس سال تک انگریزی حکومت کے تحت رہا۔ بعد میں لارڈ رپن کے عہد حکومت میں ریاست جائز وارث کو واپس کر دی گئی۔

لارڈ ولیم بنٹنگ اگرچہ امن و سلامتی کی حکمت عملی کا دعویدار تھا اور چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں جہاں تک ہو سکے کسی قسم کا دخل نہ دے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی اس پالیسی سے بے جا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور بعض ریاستوں میں انتظامی ابتری پھیل گئی ہے تو اس نے عدم مداخلت کے اصول کو ترک کر دیا۔ اس نے جے پور جودھ پور اودے پور کوٹہ' بوندی اور مرہٹوں میں بھونسلا' ہلکر اور سیندھیا کے معاملات میں موثر طور پر دخل دیا تاکہ وہاں کی انتظامی ابتری دور ہو کر رعایا کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔

مغل شہنشاہ کی شکایتیں

اس زمانے میں بہادر شاہ مغلوں کا آخری بادشاہ لال قلعہ میں حکمران تھا۔ اس کی حیثیت انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار کی رہ گئی تھی۔ اگرچہ ظاہری شاہی اختیارات اسے حاصل تھے لیکن حقیقت میں دہلی کے انگریز رزیڈنٹ کے رحم و کرم پر اس کا انحصار تھا۔ اس کو انگریزی حکومت سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ جن علاقوں کی آمدنی اس کے لئے خاص کر دی گئی تھی ان کے لگان میں جب اضافہ ہوا تو وہ چاہتا تھا کہ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا جائے۔ انگریزی حکومت کو غالباً اس جائز مطالبہ کو ماننے میں انکار نہ ہوتا لیکن اختلاف اس بات پر ہوا کہ بہادر شاہ جس چیز کو اپنا ذاتی حق سمجھتا تھا اسے انگریزی حکومت اپنی عنایت جتانا چاہتی اور یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ حقیقت میں انکا وظیفہ خوار ہے[1]۔

---

[1] Beveridge, A Comprahensive History of India III, p. 212.

بہادر شاہ نے انگریزی حکومت کے اس برتاؤ کو اپنی ذلت خیال کیا اور راجا رام موہن رائے کو آمادہ کیا کہ وہ انگلستان جاکر اس کے معاملہ کو ارباب اقتدار کے روبرو پیش کرے۔ حکومت ہند کو اس پوری کارروائی کی مطلق اطلاع نہیں دی گئی۔ راجا رام موہن جب سنہ ۱۸۳۱ء میں انگلستان پہنچے تو حکومت انگلستان نے انھیں بہادر شاہ کا بھیجا ہوا سفیر ماننے سے انکار کیا جب تک کہ وہ حکومت ہند کی توثیق نہ حاصل کریں۔ راجا رام موہن رائے نے باوجود ان تمام دشواریوں کے جو نوکر شاہی اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ پیش کیا کرتی ہے بہادر شاہ کے معاملہ میں انگلستان کی رائے عامہ کی ہمدردی حاصل کر لی لیکن حکومت انگلستان اور بورڈ آف کنٹرول نے بہادر شاہ کی کارروائی کو خلاف ضابطہ قرار دیا اور اس لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ راجا رام موہن رائے کی قابلیت اور سیرت اعلیٰ تھی۔ یہ برہمو سماج کے بانی تھے۔ انگلستان کے سفر کے دوران میں انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کا اپنی تقریروں میں اظہار کیا جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ ستمبر سنہ ۱۸۳۳ء میں وہ بخار میں مبتلا ہوئے اور برسٹل کے مقام پر ان کا انتقال ہوا غرضکہ بہادر شاہ کو راجا رام موہن رائے کی سفارت سے جو انگلستان بھیجی گئی تھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا بلکہ الٹا نقصان یہ ہوا کہ لارڈ ولیم بنٹنک اس بالا بالا کارروائی پر بہت بگڑا۔ چنانچہ شمالی ہند کا جب وہ دورہ کر رہا تھا تو دہلی بھی گیا لیکن معمول کے خلاف بہادر شاہ سے ملاقات نہیں کی اور اس طرح اپنی ناراضی ظاہر کی۔ ہندوستان میں عام طور پر بہادر شاہ کے ساتھ ہمدردی اس لئے اور بھی کی گئی کہ انگریزی رزیڈنٹ اپنے اقتدار کو ہر کس وناکس پر جتانا چاہتا تھا۔ بنٹنک نے اسکو واپس بلا کر دوسرا رزیڈنٹ مقرر کر دیا۔[۱]

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان دخانی جہازوں کی آمد و رفت سنہ ۱۸۳۴ء	انگلستان اور ہندوستان کے درمیان جہازوں کی

[۱] Auber, Rise and Progress of the British Power in India, II, p. 622.

آمد و رفت میں اس زمانے میں کم و بیش ایک طرف سے پانچ مہینے لگ جاتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں کلکتہ کی پبلک نے ان جہاز رانوں کے لئے جو انگلستان اور ہندوستان کے درمیان بحری سفر کو جلد تر طے کر سکیں چندہ کر کے انعام مقرر کئے۔ چندہ کرنے والوں نے اعلان کیا کہ اگر کوئی جہاز ایک طرف سے بحری سفر ۷۰ دن میں طے کرے تو اسکو خاص طور پر انعام دیا جائے گا۔ کپتان جونسن نے اپنے جہاز انٹر پرائزز کے ذریعہ یہ کوشش کی کہ راس امید کے گرد ہو کر اپنے سفر کو ۷۰ دن میں طے کر سکے لیکن اس کو ایک سو تیرہ دن لگ گئے۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے اس معاملہ میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور مجلس نظما سے پوچھ گچھ کے بعد ۲۰ ہزار روپیہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مسافت کم کرنے کی تجویز کو فروغ دینے کے لئے خاص کر دیا۔ چنانچہ بحر قلزم کے راستہ سے تجربہ کرنے کا ارادہ کیا گیا اور چارلس ٹن کا ایک دخانی جہاز جو بمبئی میں بنایا گیا تھا سوئز روانہ ہوا۔ بمبئی سے سوئز تک کا سفر ایک مہینے میں طے ہو گیا۔ نہر سوئز ابھی نہیں کھدی تھی۔ خشکی کا تھوڑا سا سفر کرنے کے بعد بحر قلزم سے انگلستان تک سفر کیا گیا۔ اسی طرح تین تجربے کئے گئے۔ حکومت ہند اس نتیجہ پر پہنچی کہ بحر قلزم کے راستہ سے ہندوستان اور انگلستان کی بحری مسافت ۵۵ روز میں آسانی سے طے کی جا سکتی ہے۔ پارلیمنٹ نے بھی اس مسئلہ کی طرف توجہ کر کے یہ تجویز منظور کی کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان دخانی جہازوں کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ قائم کرنا قومی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ اس تجربہ میں خرچ کافی ہو رہا تھا اس لئے مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) نے سرد مہری سے کام لیا جس کی وجہ سے وہی پرانے راس امید کے راستے سے بحری آمد و رفت ہونے لگی۔ آخر کار جب نہر سوئز ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تو انگلستان اور ہندوستان کے درمیاں مسافت تین ہفتوں میں اور بعد میں

لہ [1] Auber, Rise and Progress of the British Power in India II. p. 641

اس سے بھی کم عرصے میں طے ہونے لگی۔

سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل کی حیثیت سے۔

لارڈ ولیم بنٹنک کی صحت کچھ عرصے سے خراب رہنے لگی تھی۔ اس نے مجلس نظما کو ۱۸۳۵ء میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد مستعفی ہونے والا ہے۔ چنانچہ مسٹر الفنسٹن کے انکار کرنے پر مجلس نظماء نے سر چارلس مٹکاف کو جو صوبہ آگرہ کا گورنر تھا عارضی طور پر گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ وہ اس زمانے کے سب سے زیادہ قابل اور تجربہ کار انگریز عہدہ داروں میں شمار ہوتا تھا۔ مجلس نظما کی یہ خوشی تھی کہ سر چارلس مٹکاف کو بعد میں مستقل طور پر گورنر جنرل کر دیا جائے لیکن بورڈ آف کنٹرول نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور یہ استدلال پیش کیا کہ گورنر جنرل کے عہدہ پر کمپنی کے کسی ملازم کا فائز ہونا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ یہ عہدہ کسی اعلیٰ درجہ کے انگریز مدبر کے لیے خاص ہونا چاہئے۔ ابھی یہ مسئلہ حکومت انگلستان کے زیر غور ہی تھا کہ کس کو بنٹنک کا جانشین بنایا جائے سر چارلس مٹکاف کے بعض عمل اصول سے جو اہل ہند کے حق میں مفید تھے انگلستان کے قدامت پسند طبقے اس سے ناراض ہو گئے۔

اخباروں کی آزادی

سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل ہونے کے بعد ان امتناعی احکام کو منسوخ کر دیا جو اخباروں پر لارڈ ولزلی کے زمانے سے عاید کیئے گئے تھے اور جن کی وجہ سے اخباروں کی تنقید کرنے کی آزادی چھن گئی تھی۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے اپنے عہد حکومت میں نظم ونسق کی اکثر غیر ضروری قیدوں کو ہٹا دیا تھا۔ چنانچہ مٹکاف کی رائے میں اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ اخباروں کو تنقید کرنے کے حق سے محروم رکھا جائے۔ اصل میں ولزلی نے سنہ ۱۷۹۹ء میں فوجی اور انتظامی اغراض کے تحت اخباروں پر قیدیں لگائی تھیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے یہ اصول مقرر کیا کہ اگر کوئی انگریز اخبار نویس قواعد کی خلاف ورزی کرے تو اسکو انگلستان واپس بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ اس اصول پر بعد میں عمل بھی ہوا۔ سر چارلس مٹکاف کا خیال تھا کہ بنٹنک نے اگرچہ عملی طور پر ہر قسم کی سیاسی پابندیوں سے بیزاری

ظاہر کی تھی لیکن قانونی طور پر سیاسی پابندیاں موجود تھیں اور خاص طور پر اخبارات پر جنھیں دور کرنا چاہیئے۔ ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے نافذ ہونے کے بعد انگریزوں کو ہندوستان میں آزادی کے ساتھ رہنے اور بسنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ دو سال کے عرصے میں جو انگریز کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں میں تجارتی اغراض کے لئے ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ انھیں آزادیٔ تحریر و تقریر کے وہی حقوق اس ملک میں بھی ملنے چاہئیں جو انھیں دوسرے برطانوی مقبوضات میں حاصل تھے۔ سر چارلس مٹکاف ہمیشہ سے لبرل رجحانات کا شخص تھا۔ اس نے اپنی عارضی گورنر جنرل کے زمانے میں ایک ضابطہ نافذ کیا جس کی رو سے اخباروں پر قیدیں لگانے والے اگلے قوانین منسوخ کر دئیے گئے اور مطبعوں کو خیالات کی اشاعت کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس نے دیسی زبانوں میں بغیر کسی اجازت نامہ کے اخبارات شائع کرنے کی اجازت دیدی اور اس طرح نامہ نگاروں اور اخبار کے مدیروں پر اظہار خیال کی پہلی سی روک ٹوک نہ رہی۔ اس اصلاح کی وجہ سے انگریزی اور دیسی اخباروں کو اس کا موقع ملا کہ اپنے خیالات بے کسی خوف کے حکومت کے سامنے پیش کر سکیں اور اس کی انتظامی کارروائیوں پر تنقید کر سکیں۔ سر چارلس مٹکاف کی اس اہم اصلاح پر انگلستان کے قدامت پسند انگریز اس سے بہت ناراض ہو گئے اور اس طرح اس کی آئندہ ترقی کی راہ بند ہو گئی۔ چنانچہ گورنر جنرل اور مجلس نظما میں اس مسئلہ پر اختلاف ہو گیا جس کے باعث سر چارلس مٹکاف کو گورنر جنرل کے عہدے پر مستقل نہیں کیا گیا۔ لبرل جماعت کے باا ثر اشخاص نے بھی سر چارلس مٹکاف کے طرز عمل کو ضرورت سے زیادہ ترقی پسند سمجھا۔ چنانچہ لبرل وزارت نے اس کے بجائے لارڈ آکلینڈ کو مستقل گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ مٹکاف صوبہ آگرہ کی گورنری پر واپس چلا گیا۔ لیکن جب مدراس کی گورنری خالی ہوئی اور مجلس نظما نے اس کے حقوق کا کوئی خیال نہ کیا تو وہ مستعفی ہو گیا۔ اس کا امکان ہے کہ اگر آکلینڈ کی جگہ مٹکاف کو گورنر جنرل مقرر کیا جاتا تو پہلی جنگ افغانستان کے افسوس ناک واقعات

پیش نہ آتے۔ مجلس نظماء نے ایک نہایت تجربہ کار اور کار دان افسر کی خدمتوں کو کھو دیا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کی خدمتیں حاصل کیں جو ہندوستان کے مسائل سے بالکل ناواقف تھا۔ مٹکاف کی قابلیت کی قدر افزائی بعد میں اس کو کناڈا کا گورنر جنرل بنا کر کی گئی۔
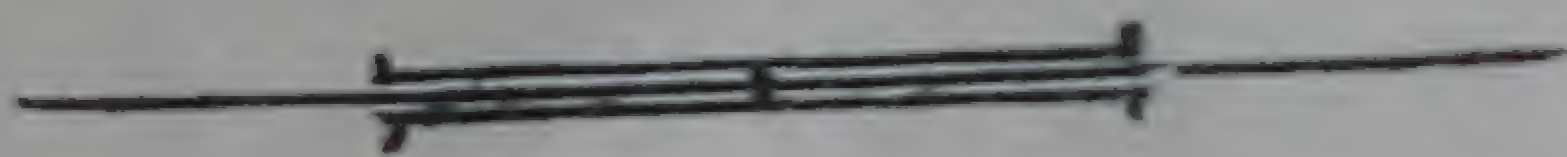
تیرھواں باب

افغانستان اور پنجاب کے معاملے

لارڈ آکلینڈ ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء

لارڈ آکلینڈ نے انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے مجلس نظماء کی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی بڑی آرزو ہے کہ گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ کروڑوں ہندوستانیوں کو اچھی حکومت کی برکتوں سے آشنا کرے اور تعلیم کو ترقی دینے کے وسیلے مہیا کرے۔ چنانچہ اپنا عہد حکومت شروع کرنے کے بعد اس نے ایک حد تک اپنی ان آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ لارڈ آکلینڈ کو خود اپنی ذات اور اپنی رائے پر بھروسا نہ تھا اسلئے اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی انتظامی اصلاحوں کی تکمیل کرتا جنگ افغانستان کا واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے انگریزی حکومت کو ایسی ذلت اٹھانی پڑی کہ پہلے کبھی ہندوستان میں نہیں اٹھائی تھی۔

لارڈ آکلینڈ نے میکالے سے مشورہ کرنے کے بعد جو قانونی رکن تھا یہ قانون منظور کیا کہ آئندہ صدر عدالت کو اپیل کے پورے اختیارات

ملنے چاہئیں اور اس کا اختیار سماعت صرف دیسی باشندوں کے مقدموں تک ہی نہ ہو بلکہ یورپین باشندوں کے مقدمے بھی اس کے روبرو پیش ہوا کریں گے۔ اب تک قاعدہ یہ چلا آتا تھا کہ یورپین باشندوں کے مقدمے کی اپیل کلکتہ کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوا کرتی تھی۔ میکالے نے اس کی طرح وضاحت کی کہ "اگر صدر عدالت اس لائق ہے کہ رعایا کے زیادہ حصے کی دادرسائی کے فرائض انجام دے سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ مٹھی بھر آدمیوں کو اس کی سماعت کی حدوں سے باہر رکھا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی اعلیٰ ترین عدالت پر بھروسا نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں ہم ہندوستان کے دیسی باشندوں سے بھی یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اس پر بھروسا رکھیں"۔ غرضکہ حکومت ہند نے جب بذریعہ قانون صدر عدالت کے اختیارات میں توسیع کی تو کلکتہ کے یورپین باشندوں نے اس کو اپنی توہین خیال کیا اور میکالے کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ لیکن لارڈ آکلینڈ نے میکالے کی پوری طرح تائید کی اور قانون مذکور نافذ ہو گیا۔ میکالے یورپین باشندوں کی اس مخالفت سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ وہ مستعفی ہو کر انگلستان چلا گیا۔ اس نے تعزیرات ہند کے لئے بہت کافی مواد مرتب کیا جسے بعد میں اس کے جانشینوں نے استعمال کر کے اس کے کام کی تکمیل کی۔

تعلیمی امور میں لارڈ ولیم بنٹنک جس نئی پالیسی کی داغ بیل ڈال گیا تھا اس کو ترقی دینے کی لارڈ آکلینڈ نے پوری کوشش کی اور میکالے کے مشورہ کے مطابق سرکاری مدرسوں میں انگریزی تعلیم کی توسیع اور ترویج کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ بنٹنک کے عہد میں کلکتہ میں جو میڈیکل کالج قایم ہوا تھا اسی طرح کے میڈیکل کالج مدراس اور بمبئی میں بھی قایم کئے گئے۔

دیسی ریاستیں

لارڈ آکلینڈ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں دخل دینے کے اصول کا قائل تھا۔ جولائی ۱۸۳۷ء میں جب نصیر الدین حیدر والی اودھ کا انتقال ہوا تو اس کی جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا

بادشاہ بیگم جسے جانشین بنانا چاہتی تھیں اس کو انگریزی رزیڈنٹ کرنل جان لو نواب بنانے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نواب نصیرالدین حیدر کے چچا نصیرالدولہ کو جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزی فوج کی مدد سے نصیرالدولہ کو تخت نشین کرا دیا۔ بادشاہ بیگم اور اس کے حامیوں کو گرفتار کر کے کانپور بھیج دیا گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے احکام کے بموجب نئے والئی اودھ نے حکومت برطانیہ سے اپنے معاہدے کی تجدید کی جس کے بموجب انگریزی فوج کے اخراجات میں اضافہ کیا گیا اور نظم و نسق کے معاملوں میں بھی حکومت ہند کی دخل دہی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔[1]

اودھ کے علاوہ لارڈ آکلینڈ نے ریاست ستارہ، اندور، اور کرنول کے اندرونی معاملوں میں دخل دیا۔ ستارہ کے راجا کو برطرف کر کے اس کے بھائی شاہ جی کو گدی پر بٹھایا۔ اندور کے راجا نے حکومت ہند کا اشارہ پاکر اپنے وزیروں کو بدل دیا اور بہتر انتظام کی کوشش کی۔ نواب کرنول نے انگریزی دخل دہی کی مخالفت کی تو حکومت مدراس کے حکم کے بموجب اس کے خلاف فوج کشی کر کے اس کو الگ کر دیا گیا اور اس کی ریاست احاطہ مدراس میں شامل کر لی گئی۔

افغانستان کے امور نپولین اعظم کے زوال کے بعد یورپ میں صرف روس کی قوت ایسی تھی جو ایشیا میں انگریزی شہنشاہیت کی مدمقابل بن سکتی تھی۔ خاص کر وسط ایشیا پر روسی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہندوستان کی شمال مغربی سرحد روسی فوجوں کی زد میں آگئی تھی۔ روسیوں نے دریائے جیحون کے کنارہ پر قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کر لیا تھا اور روسی مدبر ایران اور افغانستان میں اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ روسی خطرہ کے باعث انگریزی حکومت

---

[1] Beveridge, A Comprehensive History of India Vol. III, p. 266.

کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ افغانستان کے معاملوں سے جہاں روسی اثر آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا چشم پوشی کر سکے۔ ۱۸۳۷ء میں الگزنڈر برنس حکومت افغانستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قایم کرنے کی غرض سے کابل پہنچا۔ وہ اس سے پہلے بھی افغانستان، ایران اور وسط ایشیا کا سفر کر چکا تھا تاکہ ان علاقوں کی سیاسی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ لارڈ آکلینڈ نے دوست محمد خاں والیٔ افغانستان کے نام جو خط دیا اس میں تجارت کے اقتصادی فائدوں کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "آپ کی روشن خیالی کے آگے یہ بات واضح ہو گئی کہ تجارت پر قوموں کی فلاح و ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔ تجارت کے ذریعہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ اپنے زائد از ضرورت مال کا تبادلہ کرتی ہے۔ اس طرح قومی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور تمدن کی آسائشیں اور برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ برطانوی حکومت کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ ان ملکوں میں جو سلطنت برطانیہ کے پڑوس میں ہیں تمدن کی آسائشوں اور برکتوں کو وسعت دے۔ انگریزی حکومت صرف اپنے واسطے منافع نہیں چاہتی بلکہ وہ چاہتی ہے کہ ایشیا کے تمام ملکوں کی فلاح اور بہبود کی ترقی ہو اور ان میں امن و امان قایم ہو[^1]"

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ برنس کی سفارت محض تجارتی اغراض کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کی تہ میں سیاسی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ چنانچہ خود برنس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند رسمی ملاقاتوں کے بعد اس کی گفتگو کا موضوع سیاسی معاملات رہے۔ امیر دوست محمد خاں کے پیش نظر اس زمانے میں رنجیت سنگھ سے پشاور کا شہر واپس لینا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت رنجیت سنگھ پر اثر ڈال کر اس کو پشاور واپس دلا دے۔ لیکن برنس نے بتایا کہ برطانوی حکومت دوسری خود مختار

---

[^1]: Beveridge, A Comprehensive History of India Vol. III, p. 297.

ریاستوں کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ رنجیت سنگھ پر کسی قسم کا سیاسی اثر ڈالا جائے۔ برنس کی سیاسی گفت و شنید ابھی جاری ہی تھی کہ شاہ ایران اور روس کے سفیر بھی کابل پہنچ گئے۔ امیر دوست محمد خاں نے برنس کو پھر یقین دلایا کہ اگر انگریزی حکومت رنجیت سنگھ سے پشاور واپس دلانے کا وعدہ کرے تو وہ حکومت ایران اور حکومت روس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہیں قایم کرے گا اور ایران اور روسی سفیروں کو سرسری ملاقات کے بعد رخصت کر دے گا۔ برنس نے لارڈ آکلینڈ کو افغانستان کے اصلی حالات سے آگاہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ امیر دوست محمد خاں کے دوستانہ پیشکش کو قبول کرے اور اس کے ساتھ سیاسی ارتباط قایم کرنے کے متعلق ہدایتیں روانہ کرے۔ امیر دوست محمد خاں نے لارڈ آکلینڈ کے جواب کے انتظار میں روسی سفیر ویکٹووچ کو اب تک باریابی کا موقع نہیں دیا تھا تاکہ برنس کے ساتھ جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہ ہو۔ لیکن لارڈ آکلینڈ اور اس کی کونسل کے ارکان نے امیر دوست محمد خاں کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ گورنر جنرل کی طرف سے امیر دوست محمد خان کو جو خط بھیجا گیا اس کا انداز تحکمانہ تھا جس کی وجہ سے افغانستان کے حکمران خاندان کے ہر فرد کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت اور حقارت کی آگ بھڑک اٹھی۔ برنس کابل سے ہندوستان واپس آ گیا۔ اس کی واپسی کے بعد روسی سفیر ویکٹووچ کا دربار کابل میں بڑی عزت و شان کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ غرضکہ لارڈ آکلینڈ کی پالیسی سے افغانستان کی خارجی سیاست بڑی حد تک روس کے زیر اثر آ گئی۔ روسی سفیر نے رنجیت سنگھ کے خلاف شاہ ایران اور روسی حکومت کی مدد کا دوست محمد خاں کو یقین دلایا بشرطیکہ وہ انگریزی حکومت سے بے تعلق ہو جائے۔

اسی اثناء میں شاہ ایران نے شہر ہرات پر چڑھائی کر دی جو مغربی افغانستان کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کا حکمران کامران شاہ بڑا ظالم اور

عیش پسند تھا۔ روسی اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ روسی سفیر مقیم طہران سیمونووچ نامی چاہتا تھا کہ ہرات پر اہل ایران کا قبضہ ہو جائے تاکہ روسی اثر مغربی افغانستان تک اس طرح بالواسطہ پہنچ جائے۔ ہرات کا محل وقوع فوجی نقل و حرکت کے اعتبار سے وسط ایشیا میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ انگلستان کی ہدایت کے بموجب انگریزی سفیر مقیم طہران مسٹر ایم نیل نے شاہ ایران کو ہرات پر چڑھائی کرنے سے باز رکھنا چاہا لیکن شاہ پر روسی اثر اتنا غالب تھا کہ اس نے اس کی ایک نہ سنی اور پچاس ہزار فوج اور پچاس توپیں لے کر نومبر ۱۸۳۷ء میں ہرات کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ محصورین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ شاہ ایران چاہتا تھا کہ کسی بہانے سے محاصرہ اٹھا لے لیکن روسی اثر کی وجہ سے وہ جو چاہتا تھا نہیں کر سکتا تھا۔ حکومت انگلستان کے ایما پر لارڈ آکلینڈ نے خلیج فارس میں بمبئی کے ساحل سے بحری بیڑا بھیجدیا تاکہ شاہ ایران کو بتا دیا جائے کہ اگر اس نے ہرات کا محاصرہ فوراً نہ اٹھا لیا تو اسے برطانوی حکومت کی سخت ناخوشی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ شاہ ایران جو محاصرہ اٹھانے کے لئے بہانے کی تلاش میں تھا اس کو اب تو بڑا اچھا بہانہ مل گیا۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۸۳۸ء کو ایرانی لشکروں کو ہرات سے واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ اس ناکام محاصرہ کی وجہ سے شاہ ایران اور اس کے روسی مشیروں کی بڑی سبکی ہوئی۔

لیکن روسی ریشہ دوانی افغانستان میں برابر جاری رہی۔ روسی سفیر ویکیٹووچ نے والئی افغانستان اور ملک کے دوسرے بااثر لوگوں سے اپنے تعلقات بڑھا لئے تھے اور ان تعلقات سے سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وسط ایشیا اور ایران اور افغانستان میں روسی اثر کے بڑھنے سے برطانوی حکومت کو سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ برطانوی کابینہ نے اعلان کر دیا کہ ہمارے مشرقی مقبوضات کی حفاظت اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ایسے حکمران کا اقتدار قایم ہو جو ہمارا ہمدرد ہو اور اسطرف

سے حملے کی صورت میں مدافعت کرنے پر آمادہ ہو بجائے ایسے حکمران کے جو ہماری مخالف قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح سے کھیلے۔ اس اعلان کے ساتھ لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ کو برطانوی کابینہ نے حکم دیا کہ وہ افغانستان کے معاملوں میں ایسی قطعی مداخلت کرے کہ انگریزی قوم کے مفاد کا پوری طرح سے تحفظ ہو جائے۔ لارڈ پامرسٹن نے انگلینڈ کو افغانستان کی غیر تشفی بخش حالت کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ وسط ایشیا کی طرف سے دشمن کے قدم بڑھانے کی جو آہٹ سنائی دے رہی ہے اس کی طرف سے بے توجہی نہ برتے۔
گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کی یہ رائے تھی کہ جب تک دوست محمد خان کو افغانستان کے تخت و تاج سے الگ کر کے شاہ شجاع کو جو انگریزوں کا دوست تھا اقتدار نہ دلایا جائے اس وقت تک افغانستان کے معاملات میں یکسوئی کی امید رکھنا بیکار ہے۔ چنانچہ جون ۱۸۳۸ء میں حکومت ہند، رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع میں اتحاد ثلاثہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ شاہ شجاع افغانستان کا حکمران ہونے کے بعد روسیوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ انگریزی حکومت اور رنجیت سنگھ فوجی مدد سے اسکو تخت افغانستان پر بٹھائیں گے۔ رنجیت سنگھ نے فوجی مدد اس شرط پر دینا منظور کی کہ شاہ شجاع دربار لاہور کے اقتداری حقوق اس تمام علاقے پر تسلیم کرے گا جو دریائے انڈس کے پار واقع ہے اور جس میں پشاور بھی شامل ہے۔ غرضکہ اتحاد ثلاثہ کے طے ہو جانے کے بعد دوست محمد خاں کے خلاف فوج کشی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔
جب اتحاد ثلاثہ کی شرطوں کا انگلستان میں علم ہوا تو بعض حلقوں میں اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ چنانچہ الفنسٹن نے جو افغانستان کے حالات سے بخوبی واقف تھا صاف طور پر اپنے بیان میں کہہ دیا کہ شاہ شجاع برطانوی سنگینوں کے بل بوتے پر زیادہ عرصے تک تخت افغانستان پر نہیں بٹھایا جا سکے گا۔ لارڈ ولزلی اور لارڈ ولیم بنٹنک نے افغانستان پر فوج کشی کرنے کے منصوبے کو سخت حماقت سے تعبیر کیا۔ ڈیوک آف ولنگٹن نے جو

مشرق کے حالات سے نہ صرف باخبر تھا بلکہ عملی فوجی تجربہ رکھتا تھا
پیشین گوئی کردی تھی کہ افغانستان میں اگر انگریز کوئی حکومت قایم کرنے کا ارادہ
رکھتے ہیں تو انھیں اس کے لئے تیار ہو جانا چاہئے کہ وہاں ہمیشہ فوج کشی
کرتے رہیں اس واسطے کہ بے اس کے ان کی بنائی ہوئی حکومت
قایم نہیں رہ سکے گی۔ لیکن لبرل وزارت اس پر تلی ہوئی تھی کہ افغانستان
کے معاملہ میں قطعی یکسوئی ہو جانی چاہئے اور اس کی صورت سوائے اس کے
اور کوئی نظر نہیں آتی تھی کہ وہاں ایسے شخص کو برسر اقتدار کیا جائے جو انگریز
قوم کو اپنا محسن سمجھتا ہو۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر سر جان ہاب ہاوس نے
افغانستان پر مہم روانہ کرنے کی باقاعدہ اجازت گورنر جنرل کو روانہ کردی۔
فوج کشی شروع ہونے سے پہلے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے اعلان کیا کہ
فوجی اجتماع کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہرات کا جو محاصرہ ایرانی فوجوں نے روسی ایما پر کر رکھا
ہے اس کو بے اثر بنا دیا جائے اور ایرانی فوج کو مجبور کردیا جائے کہ وہ محاصرہ اٹھالے۔ لیکن واقعہ
یہ ہے کہ ہرات کا محاصرہ اُٹھ چکا تھا اور روسی خطرہ بڑی حد تک دور ہوگیا تھا اس واسطے کہ
برطانوی حکومت کے احتجاج پر روسی حکومت نے اپنے سفیر کو افغانستان سے واپس بلالیا تھا۔
لیکن باوجود اس کے نومبر ۱۸۳۸ء میں حکومت ہند نے اعلان کیا کہ اگرچہ
ہرات کا محاصرہ اٹھ چکا ہے لیکن برطانوی حکومت نے شاہ شجاع اور
رنجیت سنگھ کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ یہ
بڑی بے عزتی کی بات ہوگی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی فوج کا افغانستان
پر حملہ کسی اعتبار سے بھی حق بجانب نہیں تھا۔ دوست محمد خاں بحیثیت حکمران
کے اپنے اہل ملک کی نظروں میں وقعت رکھتا تھا۔ اس نے افغانستان کی
سیاسی افراتفری اور انتشار کو بڑی حد تک اپنی دور اندیش پالیسی کی بدولت
دور کردیا تھا۔ ایک آزاد حکمران کی طرح اس کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی مصلحتوں
کے مدنظر چاہے روس کے ساتھ اور چاہے ایران سے دوستانہ معاہدے
کرے۔ انگریزی حکومت کو وسط ایشیا کا چودھری کس نے بنایا تھا کہ وہ جو حکم
دے اسی کے مطابق افغانستان چلے۔ پھر برطانوی حکومت دوست محمد خاں

کے مقابلہ میں جس شخص کو افغانستان کے تخت و تاج کے لئے کھڑا کر رہی تھی وہ افغانیوں کی نظر میں اخلاقی حیثیت سے گرا ہوا تھا۔ شاہ شجاع کمزور کیرکٹر کا شخص تھا۔ وہ انگریزوں اور سکھوں کا وظیفہ خوار تھا۔ غیور افغان یہ کس طرح گوارہ کر سکتے تھے کہ ایسے شخص کو اُن پر اُن کی مرضی کے خلاف مسلط کیا جائے۔

نومبر ۱۸۳۸ء میں پنجاب میں فیروز پور کے مقام پر برطانوی سپاہ اور رنجیت سنگھ کی فوجوں کا اجتماع ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ بڑا ہوشیار تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ افغانستان کے خلاف جنگی کارروائیوں کے لئے پنجاب کو مرکز بنایا جائے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے اشارہ پر پنجاب کے بجائے سندھ کو جنگی کارروائیوں کا مرکز قرار دیا گیا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں دشواری تھی۔ لیکن لارڈ آکلینڈ کو اپنے وفادار دوست رنجیت سنگھ کے اصرار پر یہ بات ماننی پڑی۔ اس نے اپنے سکرٹری میک ناٹن کے ذریعے سندھ کے انگریزی سفیر کو کہلا بھیجا کہ سندھ کے امیروں کو اطلاع دے دی جائے کہ موجودہ فوجی ضرورتوں کے مدنظر معاہدہ کی وہ دفعہ جس میں دریائے انڈس کی راہ سے جنگی ساز و سامان بھیجنے کی ممانعت کی گئی ہے اسوقت تک معطل سمجھنی چاہئے جب تک کہ افغانستان کی مہم سر نہ ہو جائے میک ناٹن نے امیران سندھ سے مطالبہ کیا کہ وہ شاہ شجاع کو پچیس لاکھ روپے ادا کریں جو پیشکش کا بقایا ان پر عرصے سے چلا آرہا تھا۔ سندھ کسی زمانے میں کابل کا باجگزار تھا لیکن اب مدت سے وہ خود مختار ہو گیا تھا۔ شاہ شجاع کو پنجاب آکر جب روپے کی ضرورت ہوئی تو اس نے امیران سندھ سے تیس لاکھ روپیہ اس شرط پر طلب کیا تھا کہ وہ آئندہ دعوے سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جائے گا اگر اس کو یہ رقم ادا کر دی گئی۔ چنانچہ سندھ کے امیروں کے پاس شاہ شجاع کی تحریر مع اس کی مہر اور دستخط کے موجود تھی جس میں اس نے فارغ خطی لکھدی تھی۔ اس دستاویز کو دیکھ کر مطالبہ میں کوئی جان باقی نہیں رہی۔ میک ناٹن کی جب یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو اس نے امیران سندھ کو عہد معاونت کرنے پر مجبور کیا جس کی رو سے تین لاکھ روپے سالانہ فوجی اخراجات کے ضمن میں واجب الادا

ریا گیا۔ شروع شروع میں تو سندھ کے امیروں نے اس معاہدہ کو ماننے
ے انکار کیا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایسا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار
ی نہیں تو انھوں نے دستخط کردیے اور پہلے سال کی مقررہ رقم بھی ادا
ی۔[1]

دریائے انڈس کو پار کرنے کے بعد شمالی ہند کی انگریزی فوج سر ولوبی کاٹن
سرکردگی میں اور بمبئی کی فوج سر جان کین کے ماتحت افغانستان میں
ل ہوئی۔ درۂ بولان کے راستے سے قندھار پر چڑھائی کر دی گئی۔ ۲۵؍اپریل ۱۸۳۹ء
شجاع کی قندھار میں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اگرچہ سفر میں انگریزی
ن کو سخت مصیبت اٹھانی پڑی لیکن افغانوں نے ان کا اب تک
ں مقابلہ نہیں کیا۔ دوست محمد خاں کے بیٹے حیدر خاں نے غزنی میں
بند ہو کر مزاحمت کی ٹھانی۔ اس کے پاس چھے مہینے کی رسد موجود
۔ لیکن شاہی خاندان کا ایک افسر انگریزوں سے مل گیا اور قلعہ کا سارا
انھیں بتا دیا۔ چنانچہ ایک کمزور مقام پر فصیل میں رخنہ ڈال دیا گیا
لعہ فتح ہو گیا۔ دوست محمد خاں نے یہ خبر سن کر کابل خالی کر دیا اور بخارا
رف چلا گیا۔ ۷؍اگست ۱۸۳۹ء کو شاہ شجاع بڑی شان و شوکت کے
کابل میں داخل ہوا۔ کرنل آوٹ رم نے دوست محمد خاں کا کچھ دور
کیا لیکن پھر اس خوف سے کہ کہیں آگے بڑھنے میں مصیبتیں نہ ہوں واپس
شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کے بعد انگریزی افواج کو جن کے ساتھ
ر سکھ فوجیں بھی تھیں ہندوستان واپس آجانا چاہیے تھا۔ لیکن حکومت ہند
حکام صادر کئے کہ اگر شاہ شجاع کو بے یار و مددگار کابل میں چھوڑ کر برطانوی
واپس گئی تو پھر اس پر جلا وطنی لازمی ہو جائے گی اور برطانوی حکومت کی سخت
ہوگی۔ اس لئے جب تک حالات میں پائیداری نہ ہو جائے انگریزی
ں کو افغانستان میں ٹھہرنا چاہیے۔

[1] Thornton, The History of the British Empire in India Vol. VI p. 411.

تعلق بالکل منقطع نہ ہو جائے۔ جنرل ناٹ اس وقت قندھار میں تھا۔ اس کی حالت جنرل سیل سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس نے سوچا کہ اسکا کابل جانا بے سود ہوگا اس واسطے کہ اس کے پاس جنگی سامان بالکل نہیں تھا۔ اس دوران میں کابل میں انگریز افسروں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ ہر طرف سے رسد کٹ گئی۔ کمک کہیں سے ملی نہیں۔ غرضکہ ان حالات میں مجبور ہو کر میکناٹن نے وہ سب شرطیں مان لیں جو افغان سرداروں نے پیش کیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ جلد سے جلد تمام انگریز فوجوں کو ہندوستان واپس بھیجدیا جائے گا۔ دوست محمد خاں کو رہا کر کے اس کو تخت افغانستان پر بٹھا دیا جائے گا۔ شاہ شجاع کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ چاہے تو انگریزی فوج کے ہمراہ ہندوستان چلا جائے یا افغانستان میں رہے۔ آخری صورت میں اس کو گزر بسر کے لئے وظیفہ کر دیا جائے گا۔ چار انگریز افسر بطور یرغمال افغان سرداروں کے حوالے کئے جائیں گے۔ افغانوں نے انگریزی فوج کی واپسی کے وقت رسد پہنچانے کا وعدہ کیا۔ باوجود اس معاہدہ کے جو میکناٹن اور افغان سرداروں کے درمیان طے ہوا دونوں اپنی اپنی کارروائیوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں لگے رہے میکناٹن نے اپنے میر منشی موہن لال کے ذریعہ بعض افغان سرداروں کو دوست محمد خاں کے بیٹے محمد اکبر خاں کے خلاف کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ محمد اکبر خاں کو کہلا بھیجا کہ اگر وہ شاہ شجاع کی بادشاہت کو مان لے تو اس کو انگریز وزیر بنا لینے کو تیار رہیں۔ برطانوی حکومت فوراً تیس لاکھ روپیہ یک مشت محمد اکبر خاں کو فوجی اخراجات کی پابجائی کے لئے دے گی اور سالانہ چار لاکھ روپے بطور نذرانہ دیا کرے گی۔ محمد اکبر خاں نے میکناٹن کو مجلس مشاورت میں طلب کیا۔ جب وہ تین انگریز افسروں کے ساتھ پہنچا تو انھیں قتل کرا دیا گیا۔ انگریزی فوج میں سخت انتشار اور سراسیمگی پھیل گئی میجر پوٹنگر نے میکناٹن کے سفارتی عہدہ کو قبول کیا۔ اس نے بھی مجبور ہو کر افغان سرداروں کی شرطیں اسی طرح تسلیم کر لیں جس طرح سے میکناٹن نے تسلیم کی تھیں۔ افغانوں نے مزید شرطیں پیش کیں کہ انگریزی فوج کے پاس جتنی نقد رقم اور

جتنا بھی سامان ہے وہ سب ان کے حوالے کر دیا جائے اور جتنے شادی شدہ
افسر تھے وہ یرغمال کے طور پر اپنے بال بچوں کے ساتھ کابل میں چھوڑ دئے جائیں۔
۴ر جنوری ۱۸۴۲ء صلح نامہ پر دستخط ہوئے جس پر اٹھارہ افغان سرداروں نے
اپنی مہریں ثبت کیں۔ اس صلح نامے پر دستخط ہونے کے دو روز بعد سولہ ہزار انگریزی
فوج کابل سے روانہ ہوئی۔ راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا لیکن پھر بھی کوشش
تھی کہ نقل و حرکت جتنی تیزی سے ممکن ہو کرنی چاہئے۔ کابل کے باہر پہنچتے ہی
افغانوں نے پہاڑوں میں چھپ کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ انگریزی فوج
میں انتہائی بے ترتیبی اور ابتری پیدا ہو گئی۔ غرضکہ افغانوں نے راستے کے
ہر درے کی پوری طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ محمد اکبر خاں برابر انگریزی فوج کے
پیچھے پیچھے رہا اور پھر پوٹنگر سے کہہ کر انگریز عورتوں اور بچوں کو تباہی سے بچا لیا۔
گندمک تک پہنچتے پہنچتے گیارہ ہزار فوج میں سے صرف بیس افسر اور ۴۵
گورہ سپاہی باقی رہ گئے۔ ان کا تھکا ماندہ قافلہ جب جلال آباد کی طرف
انتہائی بے کسی کی حالت میں روانہ ہوا تو صرف ایک ڈاکٹر برائڈن کے
علاوہ باقی سب کا خاتمہ ہو چکا تھا! جلال آباد پر جنرل سیل نے بڑی بہادری
سے اب تک اپنا قبضہ قایم رکھا تھا۔

اس تباہی اور شکست کی خبر جب انگلستان پہنچی تو ہل چل مچ گئی۔ اگرچہ اس
تمام مصیبت کا سبب انگریز سپہ سالار اور افسروں کی باہمی نا اتفاقی اور نا اہلی
تھی لیکن انگلستان کی رائے عامہ نے لارڈ آکلینڈ کو اس ساری خرابی کا
ذمہ دار ٹھرایا۔ چنانچہ مجلس نگران نے اس کو فوراً واپس آنے کا حکم بھیج دیا
اور اس کی جگہ لارڈ ایلن برا کو گورنر جنرل مقرر کر کے ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔
لارڈ ایلن برا مجلس نگران کا صدر رہ چکا تھا اور اس لئے ہندوستان کے حالات
اور آئین حکومت کا براہ راست علم رکھتا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر وہ چاہتا
تھا کہ افغانوں سے لڑائی فوراً موقوف کر دی جائے۔ لیکن سر دست
وہ ابھی اس اصول پر عمل نہ کر سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی فوجوں کو افغانستان
سے واپس بلانے سے پہلے وہاں انگریزوں کے کھوئے ہوئے وقار کو قایم

کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ جنرل پولک نے درۂ خیبر سے گزر کر جلال آباد کی گھری ہوئی فوج کو کمک پہنچائی اور جنرل ناٹ نے غزنی پر حملہ کر کے شہر کو جلا دیا اور قلعہ کو مسمار کر ڈالا۔ پولک اور ناٹ کی فوجیں کابل تک بڑھتی چلی گئیں۔ کابل میں جو انگریزی قیدی تھے انھیں رہا کیا گیا۔ کابل کے بازار و تل کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ افغانوں کو مرعوب کیا جائے اور انگریزوں کی پچھلے دنوں جو بے رعبی ہوئی تھی اس کی تلافی ممکن ہو لیکن اس قسم کی کارروائیوں کا افغانوں پر الٹا ہی اثر ہوا۔ ان میں انگریزوں کے خلاف اور زیادہ نفرت پھیل گئی۔ شاہ شجاع کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کا بیٹا فتح جنگ جنرل پولک کی پناہ میں آ گیا تھا جنرل پولک نے کابل پر دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد بالا حصار میں باقاعدہ اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی تھی[1] لیکن جب فتح جنگ کو معلوم ہوا کہ انگریزی فوج زیادہ دنوں تک کابل میں ٹکنے والی نہیں تو اس نے جنرل پولک کے ساتھ ہندوستان جانے کی خواہش کی اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اس کا کیا حشر ہو گا۔ جب وہ تاج شاہی کے لئے آمادہ نہ ہوا تو اس کے چھوٹے بھائی شاہ پور کو افغانستان کا حکمران تسلیم کیا گیا لیکن وہ بھی انگریزی فوج کی واپسی پر پشاور چلا گیا۔

اس دوران میں لارڈ النبرا انگریزی فوج کی کابل تک پیش قدمی سے اندیشہ مند تھا۔ اگرچہ یہ کمک کی فوج کافی ساز و سامان سے لیس ہو کر ہندوستان سے روانہ ہوئی تھی لیکن افغانستان کے حالات کچھ ایسے پیچیدہ تھے کہ گورنر جنرل کو اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا کہ یہ فوج عرصے تک افغانوں سے لڑ سکے گی۔ غزنی اور کابل کی شاندار کامیابیوں کے ساتھ گورنر جنرل کو یہ بھی اطلاع پہنچی تھی کہ قندھار کے قریب جنرل آکلینڈ کی فوج کو سخت شکست کھانی پڑی اور وہ کوئٹہ کی جانب پسپائی کی حالت میں روانہ

[1] Cambridge History of India, Vol. V, p. 519.

ہو چکی تھی۔ غرضکہ افغانستان کے حالات ایسے غیر یقینی تھی کہ ایلن برا جلد سے جلد انگریزی فوجوں کو ہندوستان بلالینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کمانڈر ان چیف کو اس کے متعلق احکام بھیجدیے۔ جنرل پولک اور جنرل ناٹ دونوں اس کے خلاف تھے کہ انگریزی فوجوں کو فوراً ہندوستان واپس بلالیا جائے اس واسطے کہ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے افغانستان کی صورت حالات پر پوری طرح قابو پالیا ہے۔ اگر اس وقت واپسی ہوئی تو اس کا مطلب شکست سمجھا جائے گا اور ایشیا میں انگریزوں کے اقتدار اور وقار کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ چنانچہ دونوں جنرلوں نے فوری واپسی کے احکام کو کچھ عرصے کے لئے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوگیا کہ گورنر جنرل نے فوجیں واپس بلانے کے متعلق جو ارادہ کرلیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو واپسی کا انتظام کیا گیا۔ اہل ہند کو اپنی کامیابی اور فتح مندی کا یقین دلانے کیلئے انگریزی فوج محمود غزنوی کے مقبرہ کے صندلی دروازوں کو اپنے ساتھ لیتی آئی جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ سومنات سے انھیں لے گیا تھا۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط تھا۔ غرضکہ واپسی پر ان دروازوں کی شہرت کا شمالی ہند میں خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا تاکہ انگریزی فتح مندی کا لوگوں کو یقین ہو جائے۔ لیکن تشہیر کی یہ سب تدبیریں ناکام رہیں۔ برطانوی حکومت کی جنگِ افغانستان میں جو بے رعبی ہو چکی تھی اب اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔

لارڈ ایلنبرا نے افغانستان سے واپس آنے والی فوج کا استقبال فیروزپور میں کیا۔ وہاں ایک بڑا جشن منایا۔ دریائے ستلج کے کنارے سیکڑوں ہاتھیوں کا جلوس نکالا گیا۔ واپس آنے والے افسروں کے شامیانوں پر پھریرے اڑائے گئے جن پر ان مقامات کے نام جلی حروف میں لکھے گئے تھے جہاں جہاں انھوں نے افغانوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اس موقع پر گورنر جنرل نے ایک اعلان کیا جس میں بڑے فخر سے بیان کیا گیا کہ انگریزی سپاہ اپنے ہمراہ افغانستان سے سومنات کے کواڑ لائی ہے اور آٹھ صدی پہلے کی توہین کا بدلہ لے لیا گیا۔

عملی طور پر لارڈ الن برا نے افغانستان کے معاملے میں یکسوئی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا کہ حکومت ہند حکومت افغانستان سے دوستانہ تعلقات قایم کرنا چاہتی ہے۔ وہ افغانستان کی ہر اس حکومت کو تسلیم کرنے کو تیار ہے جسے افغانی لوگ پسند کرتے ہوں۔ چنانچہ امیر دوست محمد خاں کو رہا کر دیا گیا۔ وہ ۱۸۴۳ء کے شروع میں افغانستان پہنچ گیا اور اپنی حکومت کی تنظیم شروع کر دی۔ اس وقت افغانستان کو برطانوی حلقۂ اثر میں لانے کا اصول ترک کر دیا گیا۔ لیکن چالیس سال بعد حکومت ہند نے پھر اس قسم کی غلطی کی جس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت جب لارڈ الن برا سے امیر دوست محمد خاں کی رخصتی ملاقات ہوئی تو لارڈ موصوف نے اس سے ہندوستان اور اس کے حکمرانوں کے متعلق رائے دریافت کی۔ امیر صاحب نے سادگی سے کہا کہ آپ کی قوت کے وسیلے حیرت انگیز ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ باوجود ان وسائل دولت کے اس کی کیا ضرورت ہوئی کہ ایک مفلوک الحال اور سنگلاخ خطے پر چڑھائی کر کے مجھے وہاں کی حکومت سے محروم کیا جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ لارڈ آکلینڈ اور انگلستان کی لبرل حکومت نے افغانستان پر چڑھائی کر کے انتہائی کوتاہ نظری کا ثبوت دیا۔ چار سال کی لگاتار پریشانیوں میں سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوا کہ تقریباً بیس ہزار جانیں کھپ گئیں اور کوئی بیس کروڑ روپے کے قریب ضائع ہوئے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کی افغانی پالیسی سے برطانوی اقتدار اور وقار کو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا میں سخت صدمہ پہنچا۔ حکومت ہند کا یہ فرض تھا کہ وہ انگلستان کی حکومت کو ان تمام خطروں اور دشواریوں سے آگاہ کرتی جو افغانستان میں پیشقدمی کرنے سے لازمی طور پر پیدا ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ حکومت انگلستان روس کے خوف سے افغانستان میں اقدامی پالیسی چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنی خارجی مصلحتوں کے آگے ہندوستان کے مفاد کی پروا نہیں کی اور ان مشکلوں کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جو اس میں پوشیدہ تھیں۔ لیکن پھر بھی

حکومت ہند اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتی کہ اس نے پوری طرح اپنا نقطہ نظر حکومت انگلستان کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ممکن ہے کہ حکومت ہند کو وہ ذلت نہ اٹھانی پڑتی جو اسے برداشت کرنی پڑی۔

سندھ کا الحاق

جنگ افغانستان کے موقع پر لارڈ آکلینڈ نے سندھ کے حکمرانوں کو مجبور کیا کہ وہ معاہدے کے ذریعے امدادی فوج اپنے علاقے میں رکھیں۔ جنگ کے دوران میں سندھ فوجی نقل وحرکت کا مرکز بنا دیا گیا اور یہاں کے حکمرانوں نے اس وقت بھی انگریزی حکومت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی جب کہ وہ افغانستان میں سخت مصیبت میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے برطانوی حکومت نے سندھ کے حکمرانوں کی نیک نیتی کی قدر نہیں کی۔ جنگ افغانستان میں سندھ کو مرکز بنانے سے برطانوی حکومت کو جو سہولتیں حاصل ہوئیں ان کی وجہ سے اس کی نیت بگڑی اور سندھ پر وہ للچائی نظریں ڈالنے لگی۔ افغانستان سے فوجیں واپس بلانے کے فیصلے کے ساتھ لارڈ النبرا ارادہ کر چکا تھا کہ پچھلے چند سال میں انگریزوں نے سندھ میں جو قابل قدر حیثیت حاصل کرلی ہے اس سے بھی دستبردار نہ ہونا چاہئے اور جن مقاموں پر انگریزی فوجوں نے عارضی قبضہ کر لیا تھا وہاں مستقل قبضہ ہوجائے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کئی حیلے تراشے گئے۔

لارڈ النبرا نے جنگ افغانستان کے بعد یہ دعوی کیا کہ سندھ کے امیروں نے برطانوی حکومت کی جیسی مدد کرنی چاہئے تھی ویسی نہیں کی اور افغانوں سے درپردہ ساز باز کیا۔ لیکن ان الزاموں کی باقاعدہ جانچ نہیں کی گئی۔ انھیں دیدہ و دانستہ مبہم رکھا گیا تاکہ بغیر کسی قسم کی تحقیقات کے حکومت ہند من مانے طور پر امیران سندھ کے ساتھ برتاؤ کرے۔ سر چارلس نیپیر نے جسے گورنر جنرل نے ۱۸۴۲ء میں سندھ فوجی اور سیاسی نظم ونسق کے کامل اختیارات کے ساتھ اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجا تھا امیران سندھ کو قصوروار ٹھہرایا اور ان پر غداری کا الزام لگایا۔ سر چارلس نیپیر نے یک طرفہ فیصلہ کردیا کہ امیران سندھ نے ۱۸۳۹ء کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی کی ہے جو ان کے اور برطانوی حکومت کے

درمیان طے ہوا تھا۔ اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ اگر ہم اپنے معاہدوں کی لفظی پابندی کے پیچھے پڑے رہیں گے تو ہم سندھ میں اپنی قوت اور اثر کو کبھی بھی نہیں بڑھا سکیں گے۔ چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ انگریزی حکومت کو چاہئے کہ فوراً ان مقاموں پر قبضہ کرلے جہاں اس وقت اس کے فوجی مرکز قائم تھے۔ گورنر جنرل نے سرچارلس نیپیر کو اختیار دے دیا کہ وہ سندھ کے امیروں سے ایک نیا معاہدہ کرے۔ اس معاہدہ کی رو سے ۳ لاکھ سالانہ کی ادائی کے بجائے جو امدادی فوج کے ضمن میں امیران سندھ ادا کیا کرتے تھے ان علاقوں کو انگریزی عملداری میں ملا لیا گیا جہاں انگریزی فوجوں کے مرکز بنائے گئے تھے۔ انھیں سکہ سازی کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ یہ بھی لازم کیا گیا کہ دریائے سندھ میں جو برطانوی جہاز چلیں انھیں ہر قسم کی رسد اور ایندھن وغیرہ مہیا کیا جائے۔ امیروں نے سکہ سازی کے حق سے محروم ہونا گوارا نہ کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ برطانوی حکومت ان کی تباہی پر تلی ہوئی ہے تو انھوں نے بھی لڑنے کی تیاری شروع کر دی صحرائے سندھ میں قلعہ امام گڑھ کا محل وقوع فوجی لحاظ سے اہم تھا۔ چنانچہ سرچارلس نیپئر نے سب سے پہلے اس قلعہ کی تسخیر کا عزم کیا تاکہ امیران سندھ پر واضح ہوجائے کہ وہ برطانوی حکومت کی قوت اور وسیلوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ انگریزی فوجیں جب چار دن کی ریگستانی مسافت طے کرنے کے بعد اس قلعہ میں پہنچیں تو اس کو خالی پایا۔ مقابلے کے لیے فوج تو کجا چڑیا تک نہ تھی۔ بارود خانہ میں جو بارود تھی اس کے ذریعہ قلعہ کو اڑا دیا گیا۔ بالائی سندھ کے علاقوں کو ضبط کرکے سرچارلس نیپئر نے حکم جاری کر دیا کہ یہاں کی رعایا سوائے برطانوی حکومت کے کسی دوسرے کو کسی قسم کا محصول نہ ادا کرے۔ میجر آؤٹرم کے کہنے پر سندھ کے امیروں نے معاہدے کے مسودے پر دستخط کر دیے۔

سرچارلس نیپئر کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے سندھ کی رعایا میں انگریزوں کے خلاف انتقامی جذبات بھڑک اٹھے! اگرچہ امیران سندھ نے میجر آؤٹرم کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ حیدر آباد میں قیام نہ کریں پر وہ نہ مانا۔

وہ اپنے ریزیڈنسی کے مکان میں ٹھہرا رہا۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے تین دن بعد ریزیڈنسی پر مسلح سندھیوں نے ہلہ بول دیا۔ میجر آوٹرم نے بہادری سے مقابلہ کیا اور ریزیڈنسی سے نکل کر دریائے سندھ کے ایک انگریزی جہاز میں پناہ لی۔ اس واقعہ کے بعد سر چارلس نیپئر نے جنگ کا اعلان کر دیا میانی کے مقام پر سندھ کے امیروں کی ۳۰ ہزار فوج کو اس نے شکست دی اور حیدر آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد امیر خیر پور کو دابا کے مقام پر شکست کھانی پڑی[1]۔ دونوں معرکوں میں سندھی افواج نے بڑی بہادری اور استقلال کا ثبوت دیا۔ لیکن انگریزی فوج کی جنگی مہارت کے لیے ان کی ایک نہ چلی۔ سندھ کے امیروں کی گرفتاری کے بعد شیر محمد اور دوسرے سرداروں نے کچھ عرصے تک جنگ کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام ہوئے حیدر آباد کو انگریزی فوجوں نے خوب دل کھول کر لوٹا۔ خود سر چارلس نیپئر کے حصے میں سات لاکھ روپیے سے زائد آئے۔ سر چارلس نے امیروں کو معزول کر دیا ۵ مارچ ۱۸۴۳ء بذریعہ اعلان سندھ کے پورے علاقے کو برطانوی عملداری میں ملحق کر دیا گیا۔ اعلان میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی کہ چونکہ خیر پور کے امیر میر علی مراد نے انگریزوں کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی اور لڑائی میں ان کا معاون رہا اس لئے اس کے علاقے کو چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں وہ بطور والی ملک حکومت کرے گا۔ امیر خیر پور کے علاقے میں شکار پور اور بھکر کے شہر بھی شامل تھے۔

سندھ کا الحاق جن حالات میں کیا گیا ان کو کسی صورت میں بھی حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ مجلس نظما نے سندھ کے الحاق کی پالیسی کو قابل ملامت قرار دیا اور مجلس نظماء کے صدر سر جان ہاب ہاؤس نے صاف صاف کہا کہ اگر خود لارڈ الن برا کو سندھ کے حالات کا حقیقی علم ہوتا تو وہ سر چارلس نیپئر کی جارحانہ حکمت عملی کی ہرگز تائید نہیں کرتا۔ دراصل سر چارلس نیپئر نے واقعات

[1] Beveridge, A Comprhensive History of India, Vol. III, p. 470.

کو اتنا توڑ مروڑ کر پیش کیا اور امیران سندھ کی غداری کے الزام کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ گورنر جنرل صحیح رائے قائم نہ کر سکا۔ سر جیمس آؤٹرم اس زمانے میں سندھ کا ریزیڈنٹ تھا۔ وہ بھی سر چارلس نیپئر کی پالیسی کے خلاف تھا لیکن سر چارلس کے سامنے اس کی رائے کی کوئی وقعت نہیں سمجھی گئی۔ سر چارلس نیپئر نے جان بوجھ کر بہت سی اطلاعیں گورنر جنرل کو نہ بھیجیں اس لئے کہ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح سندھ پر اسی کے ہاتھوں برطانوی قبضہ ہو جائے

سر چارلس نیپئر کو قانونی اور اخلاقی نوعیت کی بحثوں سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سندھ پر برطانوی حکومت قایم ہو گئی تو اس سے انگریزوں کو فائدہ پہنچے گا اور خود وہاں کی رعایا کا بھی اسی میں فائدہ ہے۔ اس نے اپنے روزنامچے میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "ہم کو ان امیروں پر دباؤ ڈالنے کیلئے حیلہ بازی سے کام لینا چاہئے..... جو حکومت زیادہ زبردست ہے وہ کمزور کو ہضم کر جائے گی..... ہم کو سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم ضرور کرکے رہیں گے۔ یہ نہایت مفید لیکن پاجی پن کی حرکت ہو گی۔ لیکن ایسی حرکت ہو گی جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ میری جو حیثیت اس وقت یہاں ہے اسے میں خود اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہمیں یہاں آنے کا کیا حق تھا جب کہ ہمارے جھنڈوں پر افغانی برش کا لگایا ہوا تارکول اب تک ملا ہوا ہے[1]۔"

سر چارلس نیپئر نے سندھ کے الحاق کے بعد وہاں ملکی انتظام میں غیر معمولی قابلیت اور جفاکشی سے کام لیا۔ ممکن ہے کہ انگریزی عملداری کے تحت ملک میں بہتر انتظام ہوا ہو لیکن پھر بھی کسی حیثیت سے ان کارروائیوں کو حق بجانب نہیں ٹھرایا جا سکتا جو سر چارلس نیپئر نے الحاق کے لئے اختیار کیں۔ سندھ کے امیروں نے دراصل انگریزی حکومت کے ساتھ برابر دوستانہ تعلقات قایم رکھے تھے اور برطانوی حکومت نے کھلم کھلا وعدے کئے تھے کہ ان کے مقبوضات محفوظ رہیں گے اور ان کی حکومت برقرار رکھی جائے گی۔ سر چارلس نیپئر اور لارڈ الن برا نے امیران سندھ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ برطانوی سیاسی

[1] The life and opinions of general C. P. Napier, ed. by Sir W. Napier, Vol. II, p. 218 and 290.

اخلاق پر ہمیشہ ایک بدنما دھبا رہے گا۔

گوالیار میں مداخلت

۱۸۴۳ء میں جن کوجی سندھیا کے انتقال پر اس کی بیوہ تارا بائی نے اٹھارہ سال کے ایک لڑکے کو گود لیا جس کا نام گیاجی رکھا گیا۔ اس کو حکومت ہند نے بھی راجا تسلیم کر لیا۔ انگریزی حکومت ماماجی کو مدارالمہام رکھنا چاہتی تھی جسے رانی ناپسند کرتی تھی۔ چنانچہ ماماجی کو جلا وطن کر دیا گیا جو برطانوی حکومت کو ناگوار ہوا۔ رانی اور اس کے کم عمر لے پالک کی طرف سے داداجی نے ریاست کے پورے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملکی انتظام میں فوجی اثر بہت بڑھ گیا۔ اس وقت ریاست گوالیار میں فوج کی تعداد تیس ہزار پیدل اور دس ہزار سواروں پر مشتمل تھی جو زیادہ تر راجپوتوں اور پٹھانوں جیسی جنگ جو نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تربیت یورپین اصول کے مطابق ہوئی تھی۔ ریاست کی آمدنی کا زیادہ حصہ اس فوج کے خرچ میں نکل جاتا تھا اور اکثر اوقات سپاہیوں کی تنخواہوں کا حکومت پر بقایا رہتا تھا۔ ریاست کے انتظام میں ہر طرف ابتری بڑھتی جا رہی تھی۔ لارڈ ایلن برا نے ریزیڈنٹ کو لکھا کہ وہ داداجی کو مدارالمہامی سے الگ کر دے۔ داداجی کا دوسرے فوجی افسروں سے اختلاف تھا۔ انھوں نے فوج کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس میں انھیں پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ گورنر جنرل نے داداجی کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھ کے ریزیڈنٹ کو حکم بھیجا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن رانی نے گورنر جنرل کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔

لارڈ ایلن برا نے گوالیار کے معاملات کی نسبت ایک مفصل یادداشت تیار کی جس میں یہ امر واضح کیا گیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں قوت بالادست کی حیثیت رکھتی ہے اور اس حیثیت سے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کے حدود اثر میں جو دیسی ریاستیں واقع ہیں ان میں سے کسی میں بدنظمی پیدا ہو تو مداخلت کرے۔ برطانوی حکومت شمالی ہند اور جنوبی ہند کے درمیان اپنے

ا۔ Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 477.

رسل و رسائل کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ضروری خیال کرتی ہے کہ گوالیار کی ریاست میں جو وسطِ ہند میں واقع ہے امن و امان قائم رکھے۔ امن و امان کے قیام کے لئے لازمی ہے کہ اس وقت گوالیار میں جو فوج ہے اس کو موقوف کر دیا جائے۔

گوالیار کے فوجی سرداروں کا زور توڑنے کے لئے ایلن برا نے کمانڈر ان چیف سر ہیو گف کے سرکردگی میں فوج کشی کا حکم دے دیا گوالیار کے فوجی سرداروں نے انگریزی فوج کا مہاراج پور اور پنیار کے قلعوں پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ ریاست گوالیار کے ساتھ برطانوی حکومت کا ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے ریاست کے معاملات میں ریزیڈنٹ کا اثر اور اقتدار بہت بڑھ گیا۔ رانی کو حکومت کے کاروبار سے بے تعلق ہونا پڑا اور اس کی تین لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ مہاراجہ کی کم عمری کے زمانے تک ایک مجلس تولیت کو ریاست کا انتظام سپرد کیا گیا جو ریزیڈنٹ کی مرضی کے مطابق انتظام کرے گی۔ اگر مجلس تولیت کے ارکان میں سے کوئی فوت ہو جائے تو حکومت ہند اس کی جگہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص کو نامزد کرے گی۔ ریاست میں فوج کی تعداد ۹ ہزار رہے گی تاکہ اندرونی امن قایم رکھنے میں ضرورت کے وقت اس سے مدد لی جا سکے اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی دس ہزار امدادی فوج بھی رہے گی جس کے خرچ کا بار ریاست گوالیار کے خزانہ پر ہو گا۔ غرضکہ عملی حیثیت سے ریاست گوالیار کا انتظام برطانوی حکومت کی نگرانی میں آگیا۔

کچھ عرصہ سے لارڈ ایلن برا اور مجلس نظماء کے درمیان خط و کتابت میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ الحاق سندھ اور گوالیار کے معاملات میں گورنر جنرل نے جو پالیسی اختیار کی اس کو مجلس نظما نے اچھا نہیں سمجھا۔ پارلیمنٹ میں لبرل جماعت نے بھی ایلن برا کی پالیسی پر تنقید کی آخر ۲۱ اپریل ۱۸۴۴ء کو مجلس نظماء نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ ایلن برا کو انگلستان بلا لیا جائے۔ لارڈ ہیل نے اسی روز پارلیمنٹ میں لارڈ میکالے کے سوال کے

جواب میں اس فیصلے سے ارکان پارلیمنٹ کو آگاہ کر دیا۔ لارڈ ہارڈنگ کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا جو ڈیوک آف ولنگٹن کی ماتحتی میں نپولین کے خلاف یورپین جنگوں میں قابل قدر حصہ لے چکا تھا۔ جنگ واٹرلو میں وہ زخمی ہو کر فوج کے کام کا نہیں رہا۔ اس لئے انگلستان واپس آکر پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کی اور اور سیاست میں حصہ لینے لگا۔ چنانچہ محکمہ جنگ کی معتمدی اور آئرلینڈ کے معتمد کی حیثیت سے اس نے علمی نظم و نسق کا تجربہ بھی حاصل کیا۔

لارڈ ہارڈنگ

لارڈ ہارڈنگ کو گورنر جنرل مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو فوجی معاملات اور عملی نظم و نسق دونوں کا تجربہ تھا۔ دراصل لارڈ ایلن برا کے عہد ہی میں حکومت ہند یہ محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو ستلج پار کے سکھوں سے معاملات طے کرنے کے لیے لڑنا پڑے گا۔ چنانچہ مجلس نظما اور انگلستان کے مقتدر حاکموں سے وہ پیچیدگیاں پوشیدہ نہ تھیں جو سکھ حکومت کی بے راہ روی سے حکومت ہند کو پیش آنے والی تھیں۔ لارڈ ولنگٹن کی سفارش پر ان حالات سے عہدہ برا ہونے کے لئے لارڈ ہارڈنگ کا گورنر جنرل کے عہدہ پر تقرر کیا گیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے ہندوستان پہنچنے کے بعد ان حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جو پنجاب میں رونما ہو چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوت ہونے کے بعد سے پنجاب میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں ایک مضبوط حکومت قایم کر لی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہا اس نے انگریزی حکومت سے کسی قسم کا بگاڑ نہیں کیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ہی پنجاب میں کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو حالات پر پوری طرح قابو پا سکتی۔ اس کا بیٹا کھڑک سنگھ اس کا جانشین ہوا لیکن چند مہینے کے بعد وہ مر گیا اور اس کی جگہ شیر سنگھ تخت پر بیٹھا جس کے حلالی ہونے میں بھی لوگوں کو شبہہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں وزیروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے قتل لگاتار ہوتے رہے۔ ۱۸۴۳ء میں شیر سنگھ قتل ہوا اور ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ نے جو تربیت یافتہ فوج

چھوڑی تھی وہ ان سرداروں کے ہاتھ میں آگئی جو دور اندیش اور تدبیر حکومت سے بے بہرہ تھے۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی چندن کنور کے بیٹے دلیپ سنگھ کو راج گدی پر بٹھا دیا۔ رانی کا بھائی جواہر سنگھ اور لال سنگھ ملکی درو بست پر حاوی ہو گئے۔ انھوں نے سپاہ کو خوش کرنے کے لئے ان کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ یہ دونوں بڑے ہشیار تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر فوج کو کسی حوصلہ مندی کے مشغلے میں مصروف نہ رکھا گیا تو خود ان کی خیر نہیں۔ پہلے تو فوج کو اشارہ کیا گیا کہ جموں پر یورش کر کے گلاب سنگھ سے خراج وصول کیا جائے۔ چنانچہ گلاب سنگھ کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا اور اس سے ایک کروڑ روپیہ وصول کیا گیا۔ اسی اثنا میں رنجیت سنگھ کے ایک دوسرے بیٹے پیشوا سنگھ نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تو جواہر سنگھ نے بغاوت فرو کر دی اور پیشورا سنگھ کو قتل کرا دیا۔ لیکن جواہر سنگھ کی اس حرکت کو بعض فوجی سرداروں نے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ ان کی جواہر سنگھ سے ذاتی مخالفتیں بھی ہوں گی۔ چنانچہ جواہر سنگھ کو میاں میر کے میدان میں فوجیوں نے قتل کر ڈالا۔ رانی چندن کنور کو اپنے بھائی کے مارے جانے کا بڑا دکھ ہوا لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس نے لال سنگھ کو اپنا وزیر اعظم اور تیج سنگھ کو فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا اور ان دونوں کے ذریعے سے فوج پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔ رانی کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں فوجی سرداروں کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش میں بالکل تباہ نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر اور سپہ سالار کے مشورے سے فوج کا دھیان بٹانے کے لئے اجازت دے دی کہ ستلج پار کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ رانی اور اس کے مشیروں کا خیال تھا کہ اگر فوج نے نیا ملک فتح کر لیا تو اسے دربار لاہور کی عملداری میں شامل کر لیا جائے گا اور اگر فوج نے شکست کھائی تو اس کی طاقت بالکل ٹوٹ جائے گی اور اس سے پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ غرضکہ دونوں صورتوں میں دربار لاہور کا فائدہ تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ شکست کھانے کی صورت میں بھلا سکھ حکومت کیسے غیر متاثر

رہ سکتی تھی۔ پھر برطانوی حکومت کی قوت اور وسیلوں کا رانی اور اس کے مشیروں نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ یا ممکن ہے کہ ان کا خیال ہو کہ برطانوی حکومت ستلج پار کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے جو پہلے سکھ حکومت کے تحت تھے کوئی اقدامی کارروائی سکھوں کے خلاف نہیں کرے گی۔ فوجی سرداروں میں مذہبی جوش ایسا تھا کہ انھوں نے بے سوچے انگریزی حکومت سے بگاڑ لینے اور قوت آزمائی کرلینے کی ٹھان لی۔

پنجاب میں جو آپا دھاپی رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پھیلی اس سے انگریزی حکومت بے خبر نہ تھی۔ ایلن برا کے عہد میں فیروزپور کی چھاونی میں فوج کی تعداد بڑھا کر سترہ ہزار کردی گئی تھی جسے لارڈ ہارڈنگ نے بہت ناکافی تصور کیا۔ چنانچہ اس کے حکم کے بموجب فوج کی تعداد آہستہ آہستہ چالیس ہزار کردی گئی۔ اگرچہ یہ سب کارروائی بالکل خاموشی سے کی گئی لیکن ممکن ہے کہ اس اجتماع کی خبر سکھ سرداروں کو پہنچ گئی ہو اور انھوں نے خیال کیا ہو کہ اس سے پہلے کہ انگریزوں کی طرف سے جارحانہ کارروائی شروع ہو وہ خود کیوں نہ پیش قدمی کردیں۔

سکھوں کی پہلی لڑائی

دسمبر ۱۸۴۳ء میں تقریباً ایک لاکھ فوج نے دریائے ستلج کو پار کرکے انگریزی علاقے میں خندق بندی شروع کردی۔ اگرچہ فیروزپور کی چھاونی میں انگریزوں کی فوج کی تعداد کافی تھی لیکن پھر بھی انھوں نے سکھوں کے دریا پار کرنے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ جب لارڈ ہارڈنگ کو سکھوں کے ستلج پار کرنے کی خبر پہنچی تو اس نے دربار لاہور کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور ان سکھ علاقوں کو جو دریائے ستلج کے جنوبی جانب واقع تھے بحق سرکار کمپنی ضبط شدہ قرار دیا۔ چند دن کے اندر وہ خود مقابلے کے لئے فیروزپور پہنچ گیا۔ پہلا معرکہ مُدکی کے مقام پر ہوا۔ لال سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ اور سر ہیوگف کمانڈر ان چیف بیس ہزار فوج اور ۴۲ توپوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں تو اس نے مُدکی کے قریب انھیں روک دیا۔ سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ایک انگریزی رجمنٹ

دشمن کی آتش باری کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ بڑی مشکل سے اس رجمنٹ کی بھگدڑ کو روکا گیا۔ فیروز پور سے کمک پہنچ جانے کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو شکست دی۔ اس کے بعد فیروز شہر، علی وال اور سوبراؤن کے مقاموں پر سکھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ لیکن انگریزوں کو اپنی فتحمندی کی قیمت بہت کچھ جان اور مال سے ادا کرنی پڑی اس واسطے کہ سکھوں نے جس قواعد دانی اور بہادری کا ثبوت دیا اس پر برطانوی افسروں کو بڑی حیرت تھی۔ ان لڑائیوں میں انگریزوں نے بڑی چالاکی سے گلاب سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان کے ذریعے سے سکھ فوج کی سب خبریں انھیں ملتی رہتی تھیں۔ سوبراون کی پسپائی کے بعد سکھ فوج نے دریا پر کشتیوں کا پل بنا کر بھاگنا چاہا لیکن انگریزی آتش باری سے دس ہزار آدمی دریا کی تہ میں پہنچا دئے گئے۔ بڑی تعداد گرفتار ہوئی۔ انگریزی فوجیں لاہور کی طرف بڑھنے لگیں۔ سکھ سرداروں نے سوچا کہ اب مقابلہ بیکار ہے۔ چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور معاہدۂ لاہور پر دستخط ہو گئے۔

لاہور کا معاہدہ

جس وقت انگریزی فوج کی پیش قدمی لاہور کی طرف ہو رہی تھی، تو قصور کے مقام پر گلاب سنگھ کی سرکردگی میں سکھوں کا ایک وفد گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گورنر جنرل نے ان تحفوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو وفد کی جانب سے بھجوائے گئے تھے۔ گلاب سنگھ نے خواہش ظاہر کی کہ انگریزی فوجیں لاہور پر قبضہ نہ کریں لیکن لارڈ ہارڈنگ نے اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اور صاف طور پر کہلا بھیجا کہ معاہدے کی شرطیں چاہے جو کچھ بھی طے ہوں لیکن معاہدے پر دستخط لاہور ہی میں ہوں گے[1]۔ لاہور پہنچ کر لارڈ ہارڈنگ نے ۲۲ فروری ۱۸۴۶ء کو ذیل کا اعلان شائع کیا۔

[1] Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 498.

"آج برطانوی فوجوں نے قلعہ لاہور کے داخلہ والے پھاٹک پر بادشاہی مسجد اور حضوری باغ پر قبضہ کر لیا ہے۔ قلعہ کا باقی حصہ اس واسطے چھوڑ دیا گیا کہ وہاں مہاراجہ کا قیام ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ آنجہانی کے خاندان والے رہتے ہیں جو زمانہ دراز تک برطانوی حکومت کا حلیف تھا۔ ان حالات میں قلعہ کے اندر محلات میں سپاہ نہیں رکھی جائے گی۔ برطانوی حکومت کی ستلج والی فوج نے سکھ لشکر کو منتشر کر ڈالا اور میدان میں کامیابی حاصل کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں جو کامیابیاں ہوئیں ان کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی ملے برطانوی حکومت کو ان معاہدوں پر بھروسا تھا جو اس کے اور سکھ دربار میں ہوئے تھے اور جن کی بناء پر دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات عرصے سے قائم تھے۔ چنانچہ اس بناء پر برطانوی حکومت نے پنجاب کی سرحد پر صرف اتنی فوج رکھی جتنی کہ دفاع کے لئے ضروری خیال کی گئی۔ لیکن جب ہمارے علاقوں پر بغیر کسی اشتعال کے ایکایکی حملہ کر دیا گیا تو ہمیں بھی جارحانہ کارروائی کرنا پڑی۔ چنانچہ انگریزی فوج نے اپنے قابل اور ممتاز قائد کی ماتحتی میں ساٹھ دن کے اندر اندر سکھوں کو پے در پے چار مقامات پر شکست دی۔ ان سے ۲۲۰ توپیں چھین لیں اور اب وہ سکھوں کی راجدھانی لاہور میں پہنچ کر ان پر صلح کی شرطیں عاید کر رہی ہے جن کی بناء پر امید ہے کہ برطانوی صوبوں کی حفاظت کا انتظام ہو جائے گا اور ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے گا جو حال میں پیش آئے ہیں۔"[1]

اعلان کے دوسرے روز یعنی ۲۳ فروری ۱۸۴۶ء کو گورنر جنرل نے ایک دربار کیا جس میں مہاراجہ دلیپ سنگھ اور بڑے بڑے سرداروں نے شرکت کی۔ اس دربار میں معاہدہ پر باقاعدہ دستخط ہوئے۔ معاہدہ سولہ دفعات پر مشتمل تھا جن میں سے اہم یہ تھیں۔ انگریزی حکومت دلیپ سنگھ کو سکھوں کا حکمران تسلیم کرتی ہے۔ لیکن ملک کا کل انتظام انگریزی رزیڈنٹ سر ہنری لارنس کے ایما

[1] Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 499.

پر وزیر اعظم انجام دے گا۔ لال سنگھ کو وزیر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ ایک سال کے لئے لاہور میں انگریزی فوج متعین کی گئی تاکہ نئے انتظامات کو روبعمل لانے میں اگر کوئی دشواری پیش آئے تو اس کو استعمال کیا جا سکے۔ یہ بھی طے ہوا کہ دربار لاہور ڈیڑھ کروڑ روپیے بطور تاوان جنگ ادا کرے گا جن میں سے ۵۰ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جائے گی اور باقی ایک کروڑ کے معاوضہ میں دوآبہ کا وہ تمام علاقہ برطانوی حکومت کے حوالہ کیا جائے گا جو دریائے بیاس اور ستلج کے درمیان واقع ہے اور جس میں جالندھر شامل ہے۔ کشمیر جموں اور ہزارا کے کوہستانی ضلعے بھی برطانوی حکومت کو حوالے کرنے ہوں گے۔ خالصہ فوج کو توڑ دیا جائے گا۔ دربار لاہور کو اس کی اجازت ہو گی کہ اپنے اندرونی انتظاموں کے لئے بیس ہزار پیدل اور بارہ ہزار سوار رکھ سکے۔ لڑائی میں جتنی توپیں سکھوں نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیں وہ سب حکومت ہند کو حوالہ کرنا ہوں گی۔ چنانچہ برطانوی حکومت کو شمالی ہند میں رعب قایم کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اب سکھوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا ان ڈھائی سو توپوں کا ایک جلوس تیار کیا گیا اور ان کے ساتھ اور باقی مال غنیمت جو سکھوں کی لڑائی میں ملا تھا شان و شوکت کے ساتھ ترتیب دیا گیا اور پھر یہ جلوس پنجاب سے کلکتہ تک منزل بہ منزل پہنچا جہاں اس کے استقبال کے لئے زبردست فوجی انتظامات کئے گئے۔

معاہدہ کی دفعہ (۱۲) اور (۱۳) کی رو سے گلاب سنگھ کو کشمیر کا خود مختار حکمران تسلیم کیا گیا اور اس کی بھی صراحت کر دی گئی کہ اگر گلاب سنگھ اور دربار لاہور میں جھگڑے ہوں تو حکومت ہند ان کا تصفیہ کرنے کی مجاز ہو گی۔ چنانچہ اس ضمن میں گلاب سنگھ سے ۱۶ مارچ سنہ ۱۸۴۶ء امرتسر میں ایک علیحدہ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے کشمیر اور جموں پر اس کی اور اس کے بعد اس کے خاندان کی حکومت کو انگریزی حکومت نے تسلیم کر لیا جس کے معاوضہ میں گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپیے دینے کا وعدہ کیا۔ ۵۰ لاکھ اس وقت جب کہ اس معاہدہ کی باقاعدہ ولایت سے توثیق ہو کر آ جائے گی اور ۲۵ لاکھ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۴۶ء کو۔

کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے گلاب سنگھ کی حکومت ماننے سے انکار کر دیا لیکن سرہنری لارنس نے بذات خود اس کے خلاف فوج کشی کی۔ اس کے ساتھ دس ہزار تو وہ سکھ فوج تھی جس نے تھوڑے ہی دن ہوئے انگریزی حکومت کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اور تھوڑی سی گورا فوج تھی جو لاہور میں ٹھہرائی گئی تھی۔ شیخ امام الدین نے اس فوج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ اس نے اپنی صفائی میں لال سنگھ کی تحریر پیش کی جس میں اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو کشمیر کو حوالے کرنے میں دیر کرنا اور اگر ضرورت ہو تو جنگ کر کے مقابلہ کرنا۔ یورپین فوجی افسروں اور سکھ سرداروں کا ایک کمیشن اس معاملہ کی تحقیق کے لئے مقرر کیا گیا جس نے واضح شہادتوں کی بناء پر لال سنگھ کو ملزم قرار دیا۔ چنانچہ لال سنگھ کو جلا وطن کرنے کا حکم دے دیا گیا لیکن اس کی گزر بسر کے لئے پنشن مقرر کر دی گئی۔

دسمبر ۱۸۴۶ء میں سرہنری لارنس نے ایک اور معاہدہ کیا جس پر مہاراجہ دلیپ سنگھ نے دستخط کر دئے۔ اس معاہدہ کی ضرورت اسواسطے پیش آئی کہ سرہنری لارنس اس درباری پارٹی کا زور بالکل توڑ دینا چاہتا تھا جو رانی چندن کنور کی سرکردگی میں اب بھی انگریزوں کے خلاف ساز باز کرتی رہتی تھی اور ان کے عمل دخل کو بری نظروں سے دیکھتی تھی۔ لال سنگھ کو جلا وطن کرنے کے بعد ضرورت اس کی ہوئی کہ نظم و نسق کو چلانے کے لئے جدید انتظامات عمل میں لائے جائیں۔ چنانچہ جدید معاہدہ کی رو سے آٹھ سکھ سرداروں کی ایک مجلس تولیت (ریجنسی کونسل) قایم کی گئی تا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی کم عمری کے زمانے میں ملک کے درو بست کو چلا سکے۔ وہ انگریزی فوج جو پہلے صرف ایک سال کے لئے لاہور میں رکھی گئی تھی اس کے رہنے کی مدت آٹھ سال کر دی گئی جبکہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بالغ ہو کر نظم و نسق کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ انگریزی فوج میں سوار، پیدل اور توپ خانہ سب ہی کچھ تھا تا کہ اپنے مستقر لاہور سے پنجاب کے ہر ضلع میں سرکشی یا بغاوت کی صورت میں پہنچ سکے۔ جالندھر اور فیروزپور میں بھی فوجی دستے متعین کر دئے گئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ مجلس تولیت کی صدارت سرہنری لارنس نے اپنے دونوں بھائیوں

جارج لارنس اور جان لارنس کے علاوہ سویلین عہدہ داروں کی ایک جماعت تیار کی جنھوں نے بڑی محنت اور ہمدردی سے پنجاب کے انتظام کو سنبھالا اور رعایا میں بھی ہر دلعزیزی حاصل کی۔ سر ہنری لارنس کے زیر ہدایت و نگرانی پنجاب میں جو انتظام کیا گیا اس سے اگرچہ براہ راست انگریزی حکومت کا اقتدار اس علاقے پر نہیں قایم ہوا لیکن آئندہ کے لئے حصول اقتدار کا راستہ صاف ہو گیا۔ لاہور کے صلح نامہ کے بعد لارڈ ہارڈنگ کو پوری طرح اطمینان تھا کہ اب عرصے تک ہندوستان میں انگریزی فوج کو کسی قوت کے مقابلہ کرنے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن اس کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس کے جانشین لارڈ ڈلہوزی کو سکھوں سے پھر جنگ کرنا پڑی جس کے بعد پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے اپنے ساڑھے تین سال کے عہد حکومت میں زیادہ تر پنجاب میں سکھ فوج کا زور توڑنے اور پھر وہاں اچھے انتظامات کرنے کی طرف توجہ کی لیکن باوجود فوجی نوعیت کے انتظامات میں مصروف رہنے کے اس نے سول نظم و نسق کی ترقی کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں دریائے گنگ سے نہر جاری ہوئی اور رڑکی میں انجنیئرنگ کالج قایم ہوا۔ سڑکوں کی طرف توجہ کی گئی۔ مغلوں کے زمانے سے شمالی ہند میں جو بڑی سڑک (گرانڈ ٹرنک روڈ) چلی آتی تھی اس کی مرمت کرائی گئی۔ اس نے ستی، دختر کشی بچوں کو بھینٹ چڑھانے کی بری رسموں کو مٹانے کی عملی تدبیریں اختیار کیں اور تعلیم کی اشاعت اور توسیع کے لئے بھی کوشش کی۔ لارڈ ہارڈنگ کو اندرونی نظم و نسق پر زیادہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن پھر بھی بعض اہم اصلاحات اس کے عہد حکومت میں عمل میں آئیں جن سے اس کی عام حکمت عملی کی ترقی پسندی کا پتہ چلتا ہے۔

چودھواں باب

لارڈ ڈلہوزی کا عہد حکومت

لارڈ ڈلہوزی کا جب ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے تقرر ہوا تو اس وقت اس کی عمر تقریباً ۳۶ سال کی تھی۔ اس وقت تک برطانوی ہند کے جتنے گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے ان میں سے کسی کی اتنی کم عمر نہ تھی بلکہ اکثر ان میں ادھیڑ عمر کے لوگ تھے جو زمانے کا گرم و سرد سہ چکے تھے۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی کی عقل و فراست میں باوجود کم عمری کے تجربہ کار بوڑھوں کی سی پختگی اور جوانوں کی سی ان تھک قوت عمل موجود تھی۔ اسے ہندوستان آنے سے قبل عملی نظم و نسق کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی محنت، دور اندیشی اور انتظامی قابلیت کا سکہ اپنے ملک میں بھی بٹھا دیا تھا۔ سر رابرٹ پیل کی آخری کابینہ میں اس کو محکمۂ بورڈ آف ٹریڈ کی صدارت دی گئی۔ سر رابرٹ پیل کے بعد جب لارڈ جان رسل نے اپنی لبرل کابینہ قایم کی تو اس نے بھی لارڈ ڈلہوزی کو شریک کار کے طور پر اپنے ساتھ رکھنا چاہا لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا اس واسطے کہ یہ اصولی طور پر معیوب ہوتا۔ ۱۸۴۷ء میں لارڈ جان رسل نے لارڈ ہارڈنگ کی جگہ ہندوستان کی

گورنر جنرلی کا عہدہ ڈلہوزی کو پیش کیا جو اس نے اپنے قائد سر رابرٹ پیل کی مرضی حاصل کرنے کے بعد قبول کر لیا اور ۱۹ جنوری ۱۸۴۸ء کو کلکتہ پہنچا۔ باوجود ہندوستان کے حالات سے بڑی حد تک بے خبر ہونے کے بہت جلد وہ اپنی فطری معاملہ فہمی اور نکتہ رسی سے اس ملک کے نظم و نسق کے مسائل کی تہ کو پہنچ گیا اور جزویات پر حاوی ہو گیا۔

سکھوں کی دوسری جنگ

ڈلہوزی کو کلکتہ پہنچے ہوئے ابھی چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ پنجاب میں خلفشار پیدا ہوا اور اس کو سکھوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پڑے۔ سر ہنری لارنس رخصت بیماری پر انگلستان گیا ہوا تھا اور اس کی جگہ سر فریڈرک کری دربار لاہور میں ریزیڈنٹ کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اسی اثناء میں ملتان کے صوبہ دار مول راج نے دربار لاہور کی اطاعت سے انکار کر دیا اور جو مقررہ مالیہ ادا کرنا چاہئے تھا وہ ادا نہیں کیا۔ جب اس کو حساب صاف کرنے کو لکھا گیا تو اس نے مستعفی ہونا چاہا۔ چنانچہ اس کا استعفاء منظور کرنے کے بعد دربار لاہور نے خان سنگھ کو اس کی جگہ ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ سر فریڈرک کری نے ایک سول افسر مسٹر ایگنیو اور ایک فوجی افسر لفٹیننٹ اینڈرسن کو ساڑھے تین سو سکھ سپاہیوں کے بدرقے کے ساتھ خاں سنگھ کے ہمراہ ملتان روانہ کر دیا۔ چنانچہ یہ جماعت ۱۸ مارچ ۱۸۴۸ء کو ملتان پہنچ گئی۔ مول راج دونوں برطانوی افسروں کے پاس خود آیا اور خواہش ظاہر کی کہ نئے صوبہ دار یا حاکم کی جانب سے اس کو ایک رسید مل جانی چاہئے جس میں یہ تحریر ہو کہ اس کو انتظام سپرد کر دیا گیا۔ لیکن انگریز افسروں نے اصرار کیا کہ پہلے گزشتہ چھ سال کا مالگزاری کا حساب انھیں سمجھایا جائے۔ بہت کچھ بحثا بحثی کے بعد مول راج اس پر آمادہ ہوا لیکن اس کے مشیروں نے اس کو باور کرایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو رعایا کی نظر میں اس کی بڑی ذلت ہوگی۔ جب دونوں انگریز افسر مختلف انتظامی محکموں کے معائنے کے کے بعد جو نئے صوبیدار یا حاکم کو سپرد کئے جانے والے تھے قلعہ سے باہر نکلے تو دو خفیہ قاتلوں نے ان کو مار گرایا اور ان کے سر کاٹ کر مول راج کے پاس

لے گئے۔ مول راج نے عام اعلان کر دیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ فرنگیوں کے خلاف مزاحمت کرے گا جو سکھ سرداروں کی مجلس تولیت کی آڑ میں پنجاب پر قابض ہو گئے ہیں۔ مجلس تولیت کے خلاف بے اطمینانی اور بے اعتمادی تو پہلے ہی سے تھی اس نے اب عام شورش کی شکل اختیار کر لی۔ سر فریڈرک کری نے ایک زبردست فوج لفٹننٹ ایڈورڈز کی کمک کے لئے روانہ کی جو اگینیو اور اینڈرسن کے قتل ہونے کی خبر پا کر بنوں سے بارہ سو پیدل اور تین سو سوار کے ہمراہ ملتان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کی یہ فوج اور اس کے وسیلے اتنے نہ تھے کہ وہ ملتان کے قلعہ پر قبضہ کر سکتا۔ اس نے سر فریڈرک کری کو تاکیدی خطوط بھیجے کہ بڑی تعداد میں سپاہ روانہ کی جائے لیکن کمانڈر ان چیف سر ہیوگف گرمی کے موسم میں ملتان پر چڑھائی کرنے کے خلاف تھا۔ آخر سر فریڈرک کری نے اپنی ذمہ داری پر جنرل وہش کی ماتحتی میں سات ہزار فوج اور قلعہ شکن توپیں ملتان روانہ کر دیں۔ دربار لاہور کی جانب سے ایک سکھ فوج شیر سنگھ کی سرکردگی میں ملتان روانہ کی گئی لیکن یہ فوج مول راج سے مل گئی۔ مول راج نے اس اثناء میں قلعہ کے استحکامات میں کافی اضافہ کر لیا۔ ۳ر دسمبر ۱۸۴۸ء کو لفٹننٹ ایڈورڈ اور لاہور سے آئی ہوئی انگریزی کمکی فوج نے ملتان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن کچھ روز بعد یہ محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور تھوڑے فاصلے پر انگریزی فوج نے مورچہ بندی کر لی۔ شیر سنگھ ملتان سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ میں خالصہ فوج ہر منزل پر بڑھتی جاتی تھی۔ اس وقت اگر شیر سنگھ چاہتا تو شہر لاہور پر آسانی سے اس کا قبضہ ہو جاتا لیکن اس نے غلطی کی کہ لاہور کی طرف بڑھنے کے بجائے دریائے چناب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ملتان کے فساد نے بڑھتے بڑھتے ایک بڑی قومی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ شیر سنگھ کے ساتھی چتر سنگھ نے جو اس زمانے کا مشہور سکھ سردار تھا والئی افغانستان امیر دوست محمد خاں سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اس کو پشاور واپس دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ وہ اسوقت انگریزوں کے خلاف ان کی مدد کرے۔ چنانچہ امیر دوست محمد خاں مدد پر آمادہ ہو گیا۔ سکھ فوج نے پشاور خالی کر دیا اور میجر جارج لارنس کو بھی انگریزی دستوں کے ساتھ شہر خالی کر دینا پڑا۔ امیر دوست محمد خاں نے اپنے بڑے بیٹے محمد اکرم خاں کے ماتحت

دس ہزار افغان فوج مدد کے لئے بھیجدی۔

۱۰ اکتوبر ۱۸۴۸ء ڈلہوزی نے سکھوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اپنی کلکتہ والی تقریر میں اس نے کہا "اگلی مثالوں سے کوئی نصیحت حاصل کئے بغیر سکھ قوم نے دوبارہ جنگ کی خواہش کی ہے۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم لڑیں گے اور انھیں برطانوی انتقام سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے"۔ ڈلہوزی نے بنگال فوج کی سترہ ہزار کمک فوراً پنجاب بھجوادی۔ بمبئی کی طرف سے بھی انگریزی فوجیں پہنچ گئیں۔ نومبر ۱۸۴۸ء میں برطانوی افواج کا پڑاؤ فیروز پور کے مقام پر ہوا اور لارڈ ہیوگف کمانڈر ان چیف نے قیادت اپنے ذمہ لی۔ خود ڈلہوزی بھی موقع جنگ پر پہنچ گیا۔ جلیانوالہ کے مقام پر سکھوں اور انگریزی فوج میں زبردست معرکہ ہوا۔ سکھ فوج بڑی بے جگری سے لڑی۔ انگریزی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے دو ہزار آدمی کام آئے۔ سکھوں کا بھی نقصان ہوا لیکن نہ اس قدر۔ ان کی طاقت کو کوئی زبردست ضرب نہیں لگی۔ انگریزی فوج میں ایسی ابتری پھیل گئی کہ سکھوں نے ان کی توپوں کی بڑی تعداد کو رات کی تاریکی میں چھین لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ جنگ غیر فیصلہ کن رہی۔ سکھ فوج اپنے مورچوں پر ڈٹی رہی لیکن جنرل وہشن کمانڈر ان چیف کی مدد کے لئے پہنچ گیا تو سکھ فوج گجرات کی طرف بڑھنے لگی۔ جب انگلستان میں جلیانوالہ کے نقصانات کی اطلاع پہنچی تو ارباب حکومت کو پریشانی ہوئی۔ مجلس نظماء نے لارڈ ہیوگف کی جگہ سر چارلس نیپئر کو کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا جو فوراً انگلستان سے روانہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے سکھوں کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔

جلیانوالہ کی لڑائی کے بعد گجرات کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں انگریزوں کے کمانڈر ان چیف لارڈ ہیوگف نے سکھ فوج کو قطعی طور پر شکست دی اور اسے منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن انگریزوں کے توپ خانہ کا ان کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ ان کی تمام توپوں اور دوسرے ساز و سامان پر انگریزی فوج نے قبضہ کر لیا۔ اب اس کا امکان باقی نہ تھا کہ سکھ پھر منظم ہو کر مقابلہ پر آسکیں ملتان کے قلعہ پر بھی انگریزی

فوج نے قبضہ کر لیا۔ مول راج کو گرفتار کر لیا گیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے مجلس نظماء سے دریافت کئے بغیر اپنی ذمہ داری پر پنجاب کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا۔ اب اس کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ یہ کرتا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تخت و تاج کو برائے نام برقرار رکھتے ہوئے برطانوی عملداری پنجاب میں قایم کرنے کی کوشش کرتا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ وہ پنجاب کو برطانوی عملداری میں شامل کر لے۔ اول الذکر حالت میں اندیشہ تھا کہ سکھوں میں اپنی حکومت کا گھمنڈ باقی رہتا اور پھر تھوڑے دن بعد وہ آویزش پر آمادہ ہو جاتے۔ بقول لارڈ ڈلہوزی "اگر ہم سکھوں کے پاس تھوڑا بہت اقتدار بھی رہنے دیں گے تو وہ اپنی قومیت کے احساس کو باقی رکھیں گے اور اس طرح سازشوں کا بازار گرم رہے گا۔ ہمیں اس صورت میں بھی وہ تمام جانفشانی کرنی ہو گی اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا پڑے گا جو اس وقت اٹھانا پڑتا جب کہ پنجاب ہماری عملداری میں شامل ہوتا۔ اور اس کے ساتھ بڑی خرابی ہو گی کہ ہم ملک کی آمدنی میں خاطر خواہ نہ اضافہ کر سکیں گے اور نہ وہ فائدے حاصل کر سکیں گے جو اس صورت میں ممکن ہیں جب کہ براہ راست ہمارا قبضہ مان لیا جائے۔" چنانچہ حکومت ہند کو آئے دن کی لڑائی بھڑائی سے بچانے کے لئے لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۹۔ مارچ ۱۸۴۹ء مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے جس کے بموجب وہ اپنے اقتداری حقوق سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گیا۔ اس نے کوہ نور مشہور ہیرا جو شاہ شجاع نے اس کے باپ رنجیت کو دیا تھا بطور نذر ملکہ وکٹوریہ کے لئے پیش کر دیا۔ اس نے اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ گورنر جنرل جہاں چاہے اس کے قیام کا انتظام کر دے۔ پانچ لاکھ روپے سالانہ اس کی گزر بسر کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ جن سرداروں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ مول راج پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور اس کو حبس دوام کی سزا دی گئی۔ مگر موت نے اس کو جلد ہی رہائی دلائی۔ جس تاریخ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے معاہدہ پر دستخط کئے اسی روز ڈلہوزی نے مندرجہ ذیل اعلان

پنجاب کے الحاق کی بابت شائع کیا۔

"حکومت ہند اس سے پہلے یہ اعلان کر چکی ہے کہ وہ کسی فتح کی آرزومند نہیں۔ لیکن یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں پوری طور پر کرے اور جو لوگ اس کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کے مفاد کی نگہداشت کرے۔ اس مقصد کے لئے نیز اس واسطے بھی کہ حکومت ہند کو آئے دن کی زبردستی کی لڑائیوں سے بچایا جائے گورنر جنرل یہ خیال کرتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر ان لوگوں کو برطانوی اقتداری حلقہ میں شامل کر لے جن پر خود ان کی حکومت کو کوئی قابو نہیں رہا ہے اور جنھیں کوئی سزا بھی ظلم و زیادتی سے نہیں روک سکتی اور نہ دوستی کے اظہار سے وہ صلح و امن پر مائل ہو سکتے ہیں[1]۔"

اہل پنجاب سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ جن لوگوں نے جنگ میں انگریزوں کی مدد کی تھی انھیں انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ تین کمشنروں کی ایک کونسل قایم کی گئی جسے اس نئے صوبے کے نظم و نسق کے پورے اختیارات سپرد کئے گئے۔ کونسل کی صدارت کے لئے سر ہنری لارنس کو جو چیف کمشنر تھے نامزد کیا گیا۔ چونکہ کچھ عرصے بعد لارڈ ڈلہوزی اور سر ہنری لارنس میں پالیسی کے متعلق اختلاف ہو گیا اس لئے گورنر جنرل نے سر ہنری کے چھوٹے بھائی سر جان لارنس کو چیف کمشنری کے عہدہ پر مامور کر کے بورڈ کو توڑ دیا۔ سر ہنری لارنس کو اودھ میں ریزیڈنٹ کی خدمت پر بھیجدیا گیا۔ سر ہنری لارنس ڈلہوزی کی مرضی کے خلاف سکھ سرداروں کی زیادہ دلجوئی کرنا چاہتا تھا۔ بعض دفعہ وہ ان سرداروں کی اس قدر حمایت کرتا تھا کہ اس سے کسانوں کے حقوق کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ڈلہوزی اور سر جان لارنس چاہتے تھے کہ کسانوں کو زیادہ رعایتیں دی جائیں کہ وہی آبادی کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور اس قسم کا کوئی انتظام پنجاب میں نہ کیا جائے جو تجربے سے دوسرے صوبوں میں بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی پر اس کی اور اس کے چھوٹے بھائی

[1] Marshman, p. 469.

سر جان لارنس کی آپس میں نہیں بنی۔ گورنر جنرل نے چھوٹے بھائی کا ساتھ دیا اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسی کو پنجاب کے چیف کمشنر کے عہدہ پر منتخب کیا۔

ڈلہوزی نے ہندوستان کے دوسرے حصوں سے چن چن کے اچھے اچھے اور تجربہ کار انگریز سیولین پنجاب کا انتظام سنبھالنے کے لئے مقرر کئے۔ مالگزاری کی تشخیص اور نیا بندوبست عمل میں آیا۔ اس موقع پر برطانوی حکومت نے ان تمام انتظامی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کی جو بنگال اور دوسرے صوبوں کے ابتدائی انتظام میں ہوئی تھیں اور جن کے نتیجے بڑے دیرپا ثابت ہوئے۔ پنجاب میں عام طور پر اراضی کے لگان میں تخفیف کر دی گئی اور اراضی کے قابضوں کو پٹے پر زمینیں اٹھا دی گئیں جن میں سے بعض کی میعاد تیس سال قرار دی گئی۔ سکھ فوج کے اکثر افراد نے کاشتکاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ تجارتی مال کی ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو جو درآمد و برآمد ہوتی تھی اس پر سے ہر قسم کے محصول اٹھائے گئے کہ ان سے تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ ٹھگی، ڈکیتی اور غلامی کی روک تھام کی گئی۔ آبپاشی کے لئے نہروں کی ایک اسکیم منظور کی گئی اور نہروں کی کھدائی کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا گیا۔[۱] پولیس کا عمدہ انتظام کیا گیا تاکہ رعایا امن و امان سے زندگی بسر کر سکے۔ تعلیم کے لئے مدرسے کھولے گئے۔ پنجاب کو ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر ضلع میں ایک حاکم مقرر کیا گیا جسے وسیع عاملانہ اختیارات حاصل تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ڈلہوزی نے پنجاب میں جن عہدہ داروں کو مقرر کیا انھوں نے بڑی قابلیت سے اپنے فرائض ادا کئے اور اس صوبے کی آئندہ رفاہ اور فلاح بہت کچھ ان کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ لیکن پنجاب میں جو کچھ بھی اصلاحیں ہوئیں ان میں لارڈ ڈلہوزی کو گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کا دماغ ہی اس حکومت کی مشین کے کل پرزوں کو چلاتا رہا جو پنجاب میں قایم

---

[۱] Marshman, p. 472.

ہوئی۔ وہ ہر تفصیل پر نگرانی رکھتا تھا۔ اور چونکہ اسے اپنی ذات اور اپنی قابلیت پر پورا بھروسا تھا اس لئے وہ اپنی رائے کے سامنے کسی دوسرے کی رائے کو وقعت نہیں دیتا تھا۔ پنجاب کی رعایا کو نئے انتظامات سے بہت فائدے حاصل ہوئے۔ وہی لوگ جو کچھ دنوں پہلے انگریزی حکومت کے جانی دشمن تھے اب خیر خواہ اور دوست بن گئے۔ اور بڑے وقت میں سرکار انگریزی کی ستائش کے قابل خدمتیں انجام دیں۔

پنجاب کے الحاق سے انگریزی حکومت کی سرحد افغانستان تک پہنچ گئی۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں ڈلہوزی نے افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خاں سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانوی ہند اور افغانستان میں دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے۔ سرحد پر قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا گیا جن میں ذخیرے کافی رکھے گئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ ان سب قلعوں کو سڑکوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ سرحدی علاقوں میں امن و امان قایم رکھنے کے لئے نو نئی رجمنٹیں بھرتی کی گئیں۔ ایک نئی گرد آور فوج بھی رکھی گئی جو سواروں پر مشتمل تھی تاکہ جرائم کی روک تھام کی جائے۔

دوسری جنگ برما کی برما کی حکومت کچھ عرصے سے انگریز تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہی تھی صلح نامہ ینڈبو کی شرطوں میں جو پہلی جنگ برما کے بعد تسلیم کی گئی تھیں یہ شرط بھی تھی کہ انگریزی مال کے خلاف کوئی خاص قیدیں نہیں لگائی جائیں گی۔ لیکن حکومت برما نے اس کی خلاف ورزی کی۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں رنگون کے انگریز تاجروں نے حکومت ہند کو ایک محضر بھیجا جس میں اپنی شکایتیں پیش کیں اور بتایا کہ جب تک ان کے جان و مال کی حفاظت کا حکومت ہند ذمہ نہ لے وہ برما میں ہرگز نہیں رہیں گے۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے کموڈور لمبرٹ کو مقرر کیا جسے ہدایت کی گئی کہ وہ گفت و شنید کے دوران میں بڑی معاملہ فہمی اور احتیاط سے کام لے۔ چنانچہ لمبرٹ نے رنگون کے برمی گورنر کو ایک خط بھیجا جس میں بتلایا گیا کہ انگریز تاجروں کو جو نقصان

اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی ہونی چاہئے۔ لیکن جب رنگون کے گورنر نے لمبرٹ کے خط کو توجہ کے لائق نہ سمجھا اور اس کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا تو اس نے شاہ برما کو اسی مضمون کا ایک خط بھیجا کہ رنگون کے گورنر کو خدمت سے برطرف کر دینا چاہئے اس واسطے کہ اس کی وجہ سے انگریزی حکومت اور برمی حکومت کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس خط کا اثر ہوا۔ رنگون کے گورنر کا تبادلہ کر کے اس کی جگہ دوسرا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن جب لمبرٹ نے اس سے گفت و شنید کی کوشش کی تو اس نے بھی وہی ناروا برتاؤ کیا اور ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی اطلاع جب کلکتہ کونسل کو ہوئی تو بادشاہ برما سے اس برتاؤ پر اظہار افسوس کے لئے لکھا گیا۔ لیکن جب حکومت برما اس کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو ۱۰ فروری ۱۸۵۲ء کو اعلان جنگ کر دیا گیا اور فوج کشی کی تیاری شروع ہو گئی۔ چونکہ کمانڈر ان چیف اس وقت سندھ میں تھا اس لئے فوج کشی کا سارا انتظام ڈلہوزی نے خود اپنی نگرانی میں کرایا۔ ایک ہفتہ کے اندر انگریزی فوجی بیڑا رنگون پہنچ گیا۔ رنگون پر برمی فوج نے مقابلہ کیا لیکن جنرل گوڈوین نے بڑی قابلیت سے رنگون کے مندر پر قبضہ کر لیا جہاں بڑی زبردست قلعہ بندی کی گئی تھی۔ اب رنگون سے جنرل گوڈوین پروم پر چڑھائی کرتے ہوئے ذرا ہچکچا رہا تھا کہ ڈلہوزی خود رنگون پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر وہ اس بات پر اڑ گیا کہ پروم پر فوراً پیشقدمی کر کے قبضہ کر لینا چاہئے۔ ڈلہوزی کی رائے ٹھیک نکلی اور بغیر کسی نقصان کے پروم پر برطانوی جھنڈا لہرانے لگا۔ چونکہ شاہ برما نے لارڈ ڈلہوزی سے کسی قسم کی گفت و شنید کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے لارڈ ڈلہوزی کو اب خود ہی اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ برما کے اندرونی حصوں میں فوج کشی اس لئے مناسب نہیں تھی کہ اول تو اس کے لئے جتنا ساز و سامان چاہئے وہ نہیں تھا اور دوسرے اس لئے کہ اس نے اتنے اہم اقدام کے لئے حکومت انگلستان اور مجلس نظماء سے بھی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی مفاد کی حفاظت کا انتظام برقرار رکھنے کے لئے

اس کی ضرورت ہے کہ جنوبی برما میں پیگو کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ اس طرح برما سمندر سے کٹ جائے گا اور آیندہ لازمی طور پر کچھ عرصے بعد پورا علاقہ برطانوی سیادت ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ لارڈ ڈلہوزی نے حکومت برما سے صلح کی گفت و شنید کی اور آخر یہ طے ہو گیا کہ پیگو کا ساحلی علاقہ انگریزی عملداری میں شامل کر لیا جائے۔ حکومت برما نے کانفرنس کر کے باقاعدہ معاہدہ کرنے کے بجائے اس طریقہ کو پسند کیا کہ گورنر جنرل اپنے اعلان کے ذریعہ ان امور کو مشتہر کر دے جو طے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ پیگو کے الحاق کی تجویز کو حکومت برطانیہ نے بھی پسند کیا اور اس کا ایک الگ برطانوی صوبہ بنا دیا گیا جس کا صدر مقام رنگون مقرر ہوا۔ شمالی اور وسط برما میں دربار آوا کی حکومت برقرار رہی۔ رنگون بہت جلد انگریزی تجارت کا زبردست مرکز بن گیا اور شہر کو بڑی ترقی ہوئی خاص طور پر چاول اور عمارتی لکڑی بڑی مقدار میں رنگون سے درآمد ہونے لگے۔ نئے صوبہ کا انتظام میجر آرتھر فائر کے سپرد کیا گیا جس نے اپنے فرائض کو بڑی قابلیت اور مستعدی سے پورا کیا۔[1]

اصول بازگشت ڈلہوزی برطانوی شہنشاہیت کے اصول کا زبردست علمبردار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے جس حصے میں بھی انگریزی حکومت قائم ہوئی وہاں وہ عوام کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں جو دیسی ریاستیں رہ گئی ہیں ان میں سے کسی نہ کسی بہانے سے جو بھی برطانوی عملداری میں شامل ہو سکیں انھیں بے ہچکچائے شامل کر لینا چاہئے کہ اس سے وہاں کی رعایا کا فائدہ ہے۔ وہاں کی رعایا کا منشا و مقصود ہو یا نہ ہو لیکن اس طرح ڈلہوزی انگریزی راج کی حدود کو بڑھانا چاہتا تھا تاکہ ملک کا وہ حصہ بھی جو اب تک بعض مخصوص تاریخی اور سیاسی حالات کی وجہ سے برطانوی سیادت کے تحت نہیں آسکا تھا وہ بھی اس کے تصرف میں آجائے۔ مسٹر ہنٹر کا خیال ہے کہ ڈلہوزی نے اپنی طرف سے اس ضمن میں کوئی

---

1. Marshman, p. 475.

خاص اقدام نہیں کیا بلکہ حکومت ہند جن اصول پر عمل رہی تھی ان کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کو بڑھانے کے لئے الحاقی پالیسی اختیار کرتا۔ اس نے انیسویں صدی کے لارڈ ولزلی والے ہندوستان اور تاج برطانیہ کے تحت والے ہندوستان کے درمیان ایک طرح سے اتصالی کڑی کا کام کیا۔ دراصل مجلس نظماء اور انگلستان کے وہ سب لوگ جو ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے عرصے سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ والیاں ملک کو کٹ پتلی کے طور پر سامنے رکھ کر درپردہ انتظامی مشین انگریزی حکومت کے اشارے پر چلے۔ انگریزی راج نے والیان ملک کو ایسی قوت حاصل کرنے میں مدد دی جس پر ذمہ داری کی کوئی روک نہیں تھی۔ ان حالات میں بدانتظامی لازمی نتیجہ تھی۔ چنانچہ اب ان حالات میں برطانوی حکومت کو یہ اخلاقی حق پہنچتا تھا کہ وہ لوگوں کی بھلائی کی خاطر اگر مناسب سمجھے تو ان ریاستوں میں سے جسے چاہے اور جسے ایسا کرنے کے لئے اسباب ہوں اپنی عملداری میں ملا لے۔ چنانچہ اس نے اپنے خیالات ایک سرکاری کاغذ میں اس طور پر ظاہر کئے ہیں:۔

"کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ اس بات کو ناپسند نہیں کرتا ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی حکومت کی حدوں کو بڑھائیں ایسی صورت کے سوا کہ بے اس کے ہم اپنی حفاظت نہ کر سکتے ہوں۔ یا اپنے علاقوں میں امن وامان نہ رکھ سکتے ہوں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی شخص اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ ہمیں ان ریاستوں کو اپنی عملداری میں شامل کرنے میں کچھ بھی پس وپیش نہیں کرنا چاہیئے جبکہ حکمرانوں کے فوت ہونے پر وہاں کوئی جائز وارث نہ ہو تاکہ ہم اپنی سلطنت کو مستحکم کر سکیں۔ اس طرح ہماری عملداری کے مختلف حصوں کے درمیان چھوٹی موٹی ریاستیں باقی نہ رہیں گی جو ہمارے لئے سوائے کمزوری اور پریشانی کے قوت کا موجب کبھی بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایسا کرنے میں ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری آمدنی بڑھے گی اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جن کے مفاد کی نگرانی ہم اپنے طریق حکومت ہی سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ ... حکومت کا یہ فرض ہے

Dalhousie, by Sir W. W. Hunter, p. 124. - ؎

اور اس کی پالیسی بھی اس وقت یہی ہے کہ ایسے ہر موقع پر جو ہمیں ملے ہم دیانتداری کے ساتھ وہی کریں جسے ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا موقع پیش آئے جب ہمیں اپنے طریق کار کے صحیح ہونے کی نسبت ذرا سا بھی شبہہ ہو تو ایسی صورت میں اقدام سے ہمیں بچنا چاہئے لے

ڈلہوزی نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اصول بازگشت بنایا جس کی رو سے جن والیان ملک کا کوئی حقیقی وارث نہ ہو ان کے علاقوں کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ خاص طور سے ان ریاستوں پر جو براہ راست کمپنی کے ماتحت تھیں یا کمپنی ان کو وجود میں لانے کی ذمہ دار تھی اس اصول کو برتا گیا۔ عملی طور پر اس اصول کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی والئ ملک لاولد مر جائے تو بجائے اس کے کہ وہ کسی کو متبنیٰ کر کے اس کو اپنا جانشین بنائے اس ریاست پر سرکار کمپنی کا قبضہ و تصرف تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ ڈلہوزی سے پہلے ہند و والیان ملک کو یہ حق حاصل تھا کہ لاولد ہونے کی شکل میں وہ کسی کو اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنا لیں اور اس کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیں۔ یہ اصول ہندو دھرم شاستر کے مطابق تھا اور ترکوں اور مغلوں کے عہد میں بھی اس کو تسلیم کیا گیا تھا۔ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے عہد مغلیہ کے نظم و نسق کی بہت سی باتوں کو اختیار کیا تو اس اصول کو بھی تسلیم کیا۔ ڈلہوزی پہلا گورنر جنرل ہے جس نے یہ شرط لگائی کہ چونکہ برطانوی حکومت سارے ملک کی بالا دست قوت ہے اس لئے لے پالک کرنے کا حق اسی وقت استعمال کیا جا سکے گا جب کہ اس سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو۔ لیکن اس نے یہ طے کیا کہ سرکار کمپنی ریاستوں کی رعایا کی بھلائی کی خاطر اس وقت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس قسم کی اجازت نہ دی جائے اس لئے کہ انگریزی حکومت رعایا کے لئے ہندوستانی رئیسوں کی حکومت سے ہر حالت میں بہتر ہے۔ اس کی صراحت کر دی گئی کہ اس اصول کا اطلاق ان ریاستوں پر نہیں کیا جائیگا جن کی فرمانروائی

لہ Hunter, p. 127

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے قبل سے چلی آرہی ہے۔ اس اصول کے تحت ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان آٹھ چھوٹی بڑی ریاستوں کو انگریزی عملداری میں لے لیا گیا۔ ان میں ستارا، جھانسی، جیت پور، سنبھل پور، باگھٹ، بداول، اودے پور (جنوبی بنگال) اور ناگپور شامل ہیں۔ خصوصاً ریاست ناگپور کا رقبہ موجودہ زمانے کے صوبہ متوسط سے کچھ تھوڑا ہی کم تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مارکوئس آف ہیسٹنگز نے انگریزی ریزیڈنٹ سر رچرڈ جنکنس کی نگرانی میں ناگپور کے نابالغ راجا کو تیسری جنگ مرہٹہ کے بعد بحال کر دیا تھا۔ انگریزی ریزیڈنٹ کی نگرانی ختم ہونیکے بعد یہاں بدانتظامی پھیل گئی۔ ۱۸۵۳ء میں آپا صاحب کے متبنیٰ کا انتقال ہو گیا اور اس نے کوئی صلبی وارث نہیں چھوڑا۔ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں کسی کو گود نہیں لیا تھا اس لئے ناگپور کی ریاست جو کمپنی کے ماتحت تھی اور ۱۸۱۸ء میں آپا صاحب کے متبنیٰ کو عطا کی گئی تھی، ضبط کر لی گئی۔ اس وقت ناگپور میں مسٹر منسل حکومت ہند کی طرف سے رزیڈنٹ کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس نے ڈلہوزی کی اصول بازگشت کی پالیسی سے اختلاف کیا۔ اس نے ڈلہوزی کو لکھا کہ ہمیں چاہئے کہ متوفی راجہ کی بیواؤں میں سے کسی کو یہ حق دیں کہ وہ کسی کو گود لے لے اور ہم اس کو راجا تسلیم کر لیں۔ لیکن ڈلہوزی اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ راجا نے جو ذاتی ملکیت چھوڑی تھی وہ اس کی بیواؤں کو تقسیم کر دی گئی۔ جواہرات وغیرہ کو فروخت کر کے ایک "بھونسلا فنڈ" قایم کیا گیا تاکہ بیواؤں کو اس کے سود سے وظیفے دیئے جائیں۔ جس طریقے سے رانیوں سے جواہرات وغیرہ حاصل کئے گئے وہ قابل اعتراض تھا اور اس کے متعلق انگلستان میں بھی ڈلہوزی پر نکتہ چینی کی گئی۔ بعض ایسے والیان ملک تھے جن کی حکومت برائے نام تھی۔ نواب کرناٹک راجا تنجور اور پیشوا کا متبنیٰ نانا صاحب کے وہ حقوق و مراعات جنھیں کمپنی پہلے تسلیم کر چکی تھی منسوخ قرار پائے۔ راجپوتانہ میں ریاست کرولی کو بھی ڈلہوزی اصول بازگشت کے تحت ضبط کرنا چاہتا تھا لیکن مجلس نظماء نے اس کی منظوری دینے سے انکار کر دیا اس واسطے کہ یہ ریاست قدیم سے چلی آرہی تھی اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی ضبطی کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ ڈلہوزی

کی اس حکمت عملی سے ہندوستانی والیان ریاست کو اپنے اپنے متعلق خدشے پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرنے لگا کہ اس کے حقوق اور املاک محفوظ نہیں ہیں۔ بعض والیان ملک جو متبنیٰ بنانے کے حق سے محروم کر دئے گئے تھے اپنی رعایا میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر رعایا نے ان کا ساتھ دیا۔ غدر کے اسباب میں اصول بازگشت کا اطلاق ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے عام طور پر انگریزی حکومت کے خلاف نفرت اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔

خود انگریزوں میں بعض ایسے منصف مزاج لوگ موجود تھے جو ڈلہوزی کی پالیسی کو حق بجانب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ سر ہنری لارنس، آوٹرم، کلارک، سلی مین اور لو نے ڈلہوزی سے اختلاف کیا لیکن وہ ایسا خود رائے تھا کہ اپنے سامنے کسی کی سننے والا نہ تھا۔ ان سب لوگوں نے بتایا کہ ملک کے عوام کے لئے دیسی والیان ملک کی حکومت ایک غیر ملکی حکومت کے مقابلے میں بہتر ہے اس لئے کہ ان میں ہندوستانی لوگوں کو اعلیٰ ترین نظم و نسق کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے مواقع ملتے ہیں جو اس وقت برطانوی حکومت کے تحت ناپید تھے۔

الحاق اودھ

اودھ کا الحاق اصول بازگشت کے تحت نہیں ہوا بلکہ اس بناء پر کہ وہاں بد نظمی پھیلی ہوئی تھی شمالی ہند میں اودھ کی ریاست بڑی سیاسی اہمیت رکھتی تھی اور رقبہ میں کافی وسیع تھی۔ اس کے تحت جو علاقے تھے وہ ہندوستان کی سب سے زیادہ زرخیز زمینوں پر مشتمل تھے۔ ڈلہوزی اس ریاست کو انگریزی راج میں ملا لینے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اودھ کے حکمران نواب واجد علی شاہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کا جیسا چاہئے ویسا خیال نہیں رکھتا اور عیش و عشرت میں اپنا سارا وقت صرف کرتا ہے۔ اس لئے اودھ کا نظم و نسق سرکار کمپنی کے تحت آجانا چاہئے۔ اس میں شبہہ نہیں اودھ کا مالی انتظام اس زمانے میں بہت بگڑا ہوا تھا اور فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن یہ کوئی معقول عذر نہ تھا جس کی بنا پر ریاست اودھ کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر اودھ کے رہنے والوں کی خوشحالی برطانوی ہند کے

باشندوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اودھ کے آس پاس کے انگریزی علاقے چھوڑ کر بہت سے لوگ ریاست اودھ میں آکر آباد ہو گئے تھے[1]۔ اودھ کی زرخیزی اور آبادی کو دیکھ کر اودھ کے انگریز رزیڈنٹ کرنل سلی مین کے منہ میں پانی بھر آیا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ لارڈ ڈلھوزی نے اس کو حکم دیا تھا کہ وہ اودھ کا دورہ کرکے اور وہاں کے حالات کی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کرنل سلی مین نے جو یادداشت مرتب کی اس میں نواب اودھ کی بدعنوانیوں فضول خرچی اور نااہلی کو ظاہر کیا گیا۔ لیکن باوجود اس کے اس کی قطعی رائے تھی کہ اودھ کی ریاست برطانوی ہند میں ملحق نہیں کرنا چاہئے اس واسطے کہ ایسا کرنے سے دیسی سپاہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت و انتقام کی آگ بھڑک اٹھے گی اور برطانوی حکومت کو مالی اعتبار سے اتنا زیر بار ہونا پڑے گا کہ ریاست اودھ جیسی دس ریاستوں کی آمدنی بھی اس کے لئے کافی نہو گی[2]۔ اس کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ اس کا خیال تھا کہ باوجود ہر قسم کی بدانتظامی کے اودھ کی اصلاح ممکن ہے۔ وہ ڈلھوزی کی الحاقی حکمت عملی کا سخت مخالف تھا۔ کرنل سلی مین کے بعد آوٹرم کو اودھ کا ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس نے بھی اودھ کی بدانتظامی کی رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی لیکن وہ بھی کرنل سلی مین کی طرح اس بات کا حامی تھا کہ انگریزی حکومت کو اگلے معاہدوں کے مطابق ریاست اودھ کو باقی رکھنا چاہئے اور اس کے نظم و نسق کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔

لارڈ آکلینڈ کے زمانے میں ۱۸۳۷ء میں نصیرالدین حیدر کے انتقال کے بعد اس کے چچا نصیرالدولہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو معاہدہ ہوا

[1] Keene, History of India, Vol. II, p. 116.

[2] Thompson and Garrat, Rise and fulfilment of British Rule in India, p. 408.

اس میں ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی تجدید عمل میں آئی تھی جس کے بموجب انگریزی حکومت نے اودھ کی تقریباً نصف سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ ریاست اودھ کی فوجی حفاظت کا ذمہ کمپنی پر ہوگا۔ اس معاہدے میں نواب اودھ پر یہ بھی لازم کیا گیا تھا کہ اس کا فرض ہے کہ اپنے علاقے میں اچھا انتظام کرے اور کمپنی کے مقرر کئے ہوئے عہدہ داروں کے مشورے سے کام کرے۔ ۱۸۳۷ء کے معاہدے میں اس کی صراحت کی گئی تھی کہ اگر اودھ کے بعض ضلعوں میں نواب اچھا انتظام کرنے میں ناکام رہا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا فرض تصور کرے گی کہ ان ضلعوں کو عارضی طور پر اپنے زیر انتظام لے لے۔ ان ضلعوں کے نظم ونسق کے اخراجات وضع کرنے کے بعد جو آمدنی بچے گی وہ حکومت اودھ کے خزانے میں داخل کی جائے گی۔ ۱۸۳۷ء کے معاہدے کی ان دفعوں سے لارڈ ڈلہوزی نے اپنی الحاقی حکمت عملی کا جو جواز ثابت کیا ہے وہ قانونی اور منطقی طور پر صحیح نہیں۔

۱۸۳۷ء کے معاہدے کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کمپنی کی فوج جو اودھ میں رہتی تھی اس میں اضافہ کر دیا جائے اور جو مزید اخراجات اس کی وجہ سے عاید ہوں ان کا بار دربار اودھ کے خزانے پر ہوگا۔ لیکن معاہدے کے بعد نواب اودھ کے ملکی انتظام میں بہتری کی صورت پیدا ہو گئی اور ادھر مجلس نظماء نے گورنر جنرل پر اعتراض کیا کہ ان اخراجات کا بار دربار اودھ پر نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ نواب نے فوج بڑھانے کے لئے ہم سے خواہش نہیں کی بلکہ ہم خود اپنی ملکی مصلحتوں سے اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجلس نظماء نے اس دفعہ کو جس سے مزید اخراجات نواب پر عائد کئے گئے تھے منسوخ قرار دیا اور بتایا کہ ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی رو سے ہم نے تقریباً نصف ریاست اودھ پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو باقی ماندہ ریاست کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ اب فوجی حفاظت کے ضمن میں ہم کوئی اور بار نواب اودھ پر نہیں ڈال سکتے۔ لارڈ آکلینڈ، لارڈ النبرا اور لارڈ ھارڈنگ کے زمانے میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ۱۸۳۷ء کا معاہدہ پورا منسوخ نہیں ہوا بلکہ صرف

اس دفعہ کو مجلس نظماء نے منسوخ کیا ہے جس کی رو سے مزید اخراجات کا بار دربار اودھ پر عائد ہوتا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ استدلال پیش کیا کہ ۱۸۳۷ء کا پورا معاہدہ مجلس نظماء نے منسوخ کر دیا لیکن غلطی سے نواب اودھ کو صرف اس دفعہ کے منسوخ ہونے کی اطلاع دی گئی جس سے اس پر مزید اخراجات کا بار پڑتا تھا اور اس کو دوسری دفعوں کی منسوخی کی اطلاع نہیں دی جا سکی[1]۔ چنانچہ انگریزی ریزیڈنٹ مقیم لکھنو کو اس کے بموجب ہدایتیں بھیجدی گئیں۔ مسٹر بیورج نے اپنی تاریخ میں یہ بڑی پتے کی بات لکھی ہے کہ اگر یہ پورا معاہدہ منسوخ ہو گیا تھا تو ۱۸۴۵ء میں سرکاری طور پر جو معاہدوں کا مجموعہ شائع ہوا اس میں اس کو بغیر کسی صراحت کے کیوں شامل کیا گیا۔ گورنر جنرل بڑی ہٹ دھرمی سے اپنی بات کی پچ کرتا رہا اور ریزیڈنٹ کو لکھا۔

"اگر شاہ اودھ ۱۸۳۷ء کے معاہدے کا ذکر کرے اور دریافت کرے کہ انگریزی حکومت کس لئے اودھ میں معاہدے کے خلاف کرنا چاہتی ہے تو کہہ دیا جائے کہ اس معاہدے کا وجود باقی نہیں ہے۔ مجلس نظماء نے جب معاہدہ کا متن اس کو منظوری کے لئے بھیجا اس وقت اس کو منسوخ قرار دیا۔ چنانچہ دربار لکھنو کو اس وقت مطلع کیا گیا تھا کہ اس معاہدے کی بعض دفعیں جن کی رو سے فوج کے مزید اخراجات کا بار عاید ہوتا تھا منسوخ کر دی گئیں۔ اس وقت اس امر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ معاہدے کی دوسری دفعوں کی منسوخی کی بھی اطلاع دی جاتی اس لئے کہ نہ دفعیں کوئی عملی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ بعد میں بھی اس ضمن میں غفلت برتی گئی اور دربار اودھ کو مطلع نہیں کیا گیا۔ ریزیڈنٹ کو اختیار ہے کہ وہ نواب سے کہہ دے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو افسوس ہے کہ بے ارادہ اس قسم کی غفلت ہوئی[2]۔"

[1] Beveridge, Vol. III, p. 548.

[2] Beveridge, p. 549.

غرضکہ ڈلہوزی نے ۱۸۳۷ء کے معاہدے کے مضمرات سے بچنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ نہایت نازیبا اور خلاف انصاف تھا۔ معاہدوں کی رو سے انگریزی حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھی کہ دخل دے کر نظم و نسق کو درست کرنے کی تدبیریں اختیار کرتی اور نواب کے اعمال پر ایسی حد بندی کرتی کہ وہ نظم و نسق کو خراب نہ کر سکتا۔ اگر بفرض محال ۱۸۳۷ء کا معاہدہ منسوخ قرار دیا جائے تو بھی ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی رو سے انگریزی حکومت پر فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ اودھ کی آدھی ریاست پر قبضہ کرنے کے عوض وہاں امن و امان قایم رکھے اور اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے اس کی حفاظت کرے۔ اس معاہدے میں اس کا کہیں اشارہ بھی نہیں کہ کسی صورت میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اس کی مجاز ہو سکے گی کہ وہ اودھ کے پورے علاقے کو دبا بیٹھے۔ پھر لارڈ ڈلہوزی کا یہ دعوی کہ اودھ کا الحاق وہاں کی رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر ضروری ہو گیا تھا بے بنیاد ہے۔ اودھ کی کل رعایا بلا امتیاز طبقہ و مذہب کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے حکمران کو چاہے وہ کیسا ہی بے پروا اور ان کے مفاد سے غافل کیوں نہو، ہٹا کے انھیں انگریزی حکومت کے تحت کر دیا جائے۔ چنانچہ الحاق کے ایک سال بعد غدر کے موقع پر اودھ کی رعایا نے سب سے زیادہ انگریزوں کے خلاف عداوت اور نفرت کا اظہار کیا جس سے ڈلہوزی کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر اودھ کی رعایا واقعی انگریزی راج سے اسی طرح مطمئن ہوتی جیسی کہ پنجاب کی رعایا تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ غدر کے وقت وہاں اس قدر شدید مخالفت ظاہر ہوتی اور وہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا مرکز بن جاتا۔

ڈلہوزی نے ۱۸۵۶ء میں مجلس نظماء سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کر کے اودھ کا الحاق کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے ۱۵ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور کلکتہ روانہ کر دیا۔ نواب سے اس کی معزولی کے ضمن میں ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا لیکن نواب واجد علیشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اعلان کے ذریعہ یہ کارروائی عمل میں آئی۔

ورنہ انگریزی حکومت کو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ جو کچھ کیا گیا وہ خود حکمران کی رضامندی سے کیا گیا۔ نواب اودھ کے تعلقات انگریزی حکومت سے ہمیشہ اچھے رہے تھے۔ نوابوں نے ہر زمانے میں برطانوی حکومت کی برے وقتوں میں امداد کی تھی۔ نوابان اودھ کی دوستی کا یہ صلہ دیکھ کر کمپنی کی حکومت سے شمالی ہند کے لوگوں کا رہا سہا اعتبار بھی جاتا رہا۔ چنانچہ سیاسی اعتبار سے الحاق اودھ زبردست غلطی تھی۔ اس کا خمیازہ سال بھر بعد ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کو بھگتنا پڑا۔

برار کی حوالگی

حیدرآباد کے انگریزی ریزیڈنٹ سر ہنری رسل نے گورنر جنرل مارکوئس آف ہسٹینگز سے مشورے کے بعد حیدرآباد میں جدید فوجی تنظیم کی اور حیدرآباد کنٹنجنٹ قایم ہوئی۔ اس فوج کی تنظیم کی اصلی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت یہ محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو مرہٹوں کے خلاف فیصلہ کن لڑائی لڑنا پڑے گی۔ چنانچہ خود مارکوئس آف ہسٹینگز کا یہ خیال تھا کہ اس جدید فوج کو جس کے اخراجات کا بار سرکار نظام پر ہوگا مرہٹوں کے خلاف آسانی سے استعمال کیا جاسکے گا اور انگریزی حکومت اس کی وجہ سے بہت کچھ خرچ سے بچ جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لیکن کنٹنجنٹ بعد میں بھی برقرار رکھا گیا۔ انگریز افسروں کو تنخواہ کے علاوہ الاؤنس بھی دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں الاؤنس کی رقم ساڑھے تیرہ لاکھ ہوئی تھی۔ معمولاً اس کی وجہ سے حکومت سرکار عالی کے خزانے پر ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کا بار پڑتا تھا۔ حالانکہ اعانتی فوج کے اخراجات کے ضمن میں حکومت نظام میسور کی آخری جنگ کے بعد انگریزی حکومت کو علاقے سپرد کر چکی تھی۔ اب اس کے بعد سرکار نظام پر مزید فوجی اخراجات کا بار ڈالنا معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ لیکن راجہ چندولال کا زمانہ تھا۔ وہ ریزیڈنٹ کے اشارے پر چلتے تھے۔ اس طرح معاملات چلتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۳۸ء میں فریزر ریزیڈنٹ ہو کر حیدرآباد آیا۔ اس نے حکومت ہند کی توجہ کنٹنجنٹ کی فضول خرچیوں کی طرف مبذول کرائی اور بتایا کہ یہ انگریزی حکومت کے لیے ایک بدنامی اور بدنامی کی بات ہے۔ اس نے راجا چندولال کی بھی مخالفت کی اور حکومت ہند کو

ان کی بدانتظامی کی نسبت کئی مرتبہ توجہ دلائی۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء میں ان کی جگہ ان کے بھتیجے راجا رام بخش پیشکار مقرر ہوئے جو تین سال تک اس خدمت پر رہے۔ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی عرصے سے ریزیڈنٹ کو کرنا پڑ رہی تھی جس کے سبب سے سرکار نظام پر حکومت ہند کا سودی قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔
نواب سراج الملک نواب سیف جنگ ابن امجد الملک اور نواب شمس الامرا کی مدار المہامی کے زمانے میں قرضہ برابر بڑھتا رہا۔ ملک کی مالی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۶ء میں لارڈ ڈلھوزی نے جنرل فریزر کو لکھا جو اس وقت حیدرآباد میں ریزیڈنٹ تھا کہ حکومت ہند کا ریاست حیدرآباد پر قرضہ بڑھتا جا رہا ہے اس کی نسبت معینہ مدت کے اندر تصفیہ کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ جب معینہ مدت ۴ جنوری ۱۸۵۱ء گزر گئی تو لارڈ ڈلھوزی نے سرکار نظام کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ قرضے کے عوض برار پائیں گھاٹ کے ضلع کمپنی کو سپرد کئے جائیں تاکہ ۶۴ لاکھ کی ادائی اور کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کا آئندہ انتظام ممکن ہو۔ نواب ناصر الدولہ کو اپنے ملک کا کوئی حصہ انگریزی حکومت کے حوالہ کرنا سخت شاق تھا۔ انھوں نے قرض کو قسطوں سے ادا کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کی بھی تکمیل نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنرل فریزر کے جانے کے بعد کرنل جان لو کو مارچ ۱۸۵۳ء میں گورنر جنرل نے معاہدہ کا مسودہ دے کر روانہ کیا جس پر سرکار نظام کے دستخط ثبت کرانے کی اس کو تاکید کی گئی تھی۔ نواب سراج الملک نے سرکار کی طرف سے کرنل لو کو ہرچند یقین دلایا کہ میں بہت جلد قرض کی ادائی کا بندوبست کر دوں گا لیکن نئے ریزیڈنٹ نے کہا کہ میں مجبور ہوں۔ اگر معاہدے پر دستخط نہ ہوئے تو مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ پونا سے گوروں کی دو پلٹنیں طلب کروں تاکہ معاہدے کی تکمیل فوجی کارروائی کے ذریعے ہو سکے۔
سراج الملک نے انگریزی ریزیڈنٹ کو بتایا کہ انگریزی حکومت عرصے سے سکندرآباد اور جالنہ کی آبکاری کے محاصل بہ حساب ایک لاکھ روپے سالانہ گزشتہ ۴۱ سال سے وصول کرتی رہی ہے اس کو اگر کمپنی کے قرضے میں سے

مع سود کے مہنا کر دیا جائے تو سرکار نظام پر قرضے کی رقم کا بار بہت کم ہو جائے گا
لیکن اس جائز مطالبے کی مطلق شنوائی نہیں ہوئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے پہلے ہی
نواب ناصر الدولہ کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ قرض کی ادائی اور کنٹنجنٹ کی
ماہوار تنخواہ پابندی سے ادا کرنے کی صرف ایک یہی صورت ہے کہ برار پائیں گھاٹ کے
ضلعے حکومت ہند کے سپرد کر دئے جائیں لیکن شروع میں نواب ناصر الدولہ گورنر جنرل کے
اس مطالبے کو ماننے سے انکار کرتے رہے آخر کار انھوں نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔
معاہدے کی رو سے برار پائین گھاٹ کے ضلعے رائچور دوآب اور سرحدی ضلعے شولاپور و احمد نگر انگریزی
حکومت کے سپرد کر دئے گئے۔ دو قسم کی سپاہ ریاست حیدرآباد میں رہنے کیلئے مقرر کی گئی۔ ایک تو
اعانتی (سب سی ڈیری) فوج جو ملک کی عام حفاظت کے لئے تھی۔ اس میں حسب سابق پیادوں
کی آٹھ پلٹنیں اور سواروں کی دو رجمنٹیں، توپ خانہ اور جنگی ساز و سامان شامل
تھا۔ اس فوج کی غرض و غایت یہ بتائی گئی کہ اس کو نواب کی شخصی حفاظت
اور اندرونی فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا اور تحصیل
مالگزاری کے سلسلے میں اگر کوئی زمیندار یا اجارہ دار سرکشی کرے تو اس فوج
کے ذریعہ سے اس کی سرکوبی کی جائے گی۔ دوسری سپاہ کنٹنجنٹ تھی جسے اس
معاہدے کی رو سے برقرار رکھا گیا۔ یہ پانچ ہزار پیادوں دو ہزار سواروں
اور چار فیلڈ بیٹری پر مشتمل تھی[1]۔ اس کے سب افسر انگریز تھے اور تنخواہ کی ادائی
اور دوسرے انتظاموں کا تعلق براہ راست ریزیڈنٹ سے تھا۔ اگر انگریزی
علاقے میں فتنہ و فساد برپا ہو یا کسی ایسے علاقے میں جس کی سرحد ممالک محروسہ
سرکار عالی سے ملی ہوئی ہو بدامنی رونما ہو تو کنٹنجنٹ سے کام لیا جا سکے گا۔ اس کے
جملہ اخراجات سرکار نظام کے ذمے ہوں گے لیکن اس کے استعمال کرنے کا
انحصار تمام تر ریزیڈنٹ پر ہو گا۔

اس معاہدے میں یہ بھی طے ہوا کہ اعانتی فوج اور کنٹنجنٹ کے علاوہ اور
کوئی فوج انگریزی حکومت سرکار عالی سے طلب کرنے کی مجاز نہ ہو گی۔ سنہ ۱۸۰۰ء

---

[1] Fraser, Our Faithful Ally, The Nizam, p. 276.

میں سرکار نظام اور انگریزی حکومت کے درمیان جب عہد معاونت طے ہوا تھا تو اس کی رو سے سرکار نظام پر لازم قرار پایا تھا کہ جب کبھی برطانوی حکومت اپنی فوجی اغراض کے لئے نو ہزار سوار اور چھ ہزار پیادے طلب کرے تو انھیں تیار رکھا جائے ۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدے میں اس شرط کو اڑا کر انگریزی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ جب اسے ضرورت ہو تو اعانتی فوج اور کنٹنجنٹ کو طلب کر سکتی ہے۔

جو ضلعے اس معاہدے کے بموجب سرکار نظام نے حکومت برطانیہ کو سپرد کئے ان کی آمدنی تقریباً پچاس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ انگریزی حکومت نے یہ اقرار کیا کہ وہ سرکار نظام کو سالانہ اس رقم کی جمع و خرچ کا حساب دیا کرے گی۔ کنٹنجنٹ کی سات ہزار سپاہ کا خرچ اور سپرد کئے ہوئے علاقوں کے انتظامی اخراجات کو نکال کر جو رقم بچے گی وہ سرکار نظام کو ادا کر دی جائے گی۔ اس معاہدے میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی کہ برار کے نظم ونسق کے اخراجات کتنے ہوں گے چنانچہ اس عدم وضاحت کے باعث انگریزی حکومت کو پورا اختیار حاصل رہا کہ انتظامی اخراجات کی مد کو اتنا بڑھا دے کہ سرکار نظام کو دینے کے لئے کوئی رقم بچے ہی نہیں ۔ حالانکہ خود کنٹنجنٹ کے اخراجات میں برار کے ضلعے سپرد کئے جانے کے بعد جو تخفیف عمل میں آئی اس کی وجہ سے رقم زیادہ بچنی چاہئے تھی۔ جب کنٹنجنٹ کا انتظام سرکار نظام کے تحت لیکن ریزیڈنٹ کے ذریعہ سے ہوتا تھا تو اس کے اخراجات سالانہ چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہوا کرتے تھے۔ اور جب معاہدۂ برار کی رو سے اس کا انتظام انگریزی حکومت کے تحت آگیا تو یہ اخراجات ۴۲ لاکھ سالانہ رہ گئے ۔ اگر چند سال قبل کنٹنجنٹ کے اخراجات میں تخفیف کی جاتی تو سرکار نظام کو خواہ مخواہ قرضے سے زیر بار نہ ہونا پڑتا۔ پھر قرضے کی رقم اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس کی بناء پر ممالک محروسہ کے نہایت زرخیز اور سیر حاصل علاقوں کو حوالے کرنا ضروری ہوتا ۔ حکومت نظام جس کی سالانہ آمدنی اس زمانے میں دو کروڑ روپے سالانہ سے زائد تھی یقیناً ۴۶ لاکھ کے قرضہ کو چند سال کے اندر آسانی کے ساتھ ادا کر سکتی تھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند کو اتنی جلدی اور بے اعتباری کیوں تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

لارڈ ڈلھوزی پہلے ہی سے فیصلہ کر چکا تھا کہ زر نقد کے بجائے قرضے کے بہانے سے وہ برار کے ضلعوں کو انگریزی عملداری میں شامل کرے گا اور اس طرح اپنے توسیع سلطنت کے منصوبے کو ترقی دے گا۔

ڈلھوزی نے نہ صرف توسیع سلطنت کے لئے کوشش کی بلکہ اس کے ساتھ اس نے اندرونی نظم ونسق کی اصلاح کا بھی پورا خیال رکھا۔ اس کے عہد میں ملک میں نئے انتظامات ہوئے جن کی بدولت اہل ہند کی ترقی ہوئی۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ ہر تفصیل پر اس کی نظر رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انتظامی معاملوں میں بھی اپنی شخصیت کے نقوش بہت گہرے چھوڑے۔

ڈلھوزی کے اندرونی انتظامات

پنجاب، برما، ناگپور اور اودھ کے جو وسیع علاقے ڈلھوزی کے عہد حکومت میں انگریزی عملداری میں شامل کئے گئے ان کے علحدہ صوبے بنا دئے گئے۔ ان کے جدید انتظام میں فوجی اور سول عناصر برابر کے شریک تھے تاکہ معاملے جلد طے ہوا کریں اور رعایا کو عدل والنصاف بہم پہنچانے میں کارکردگی کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے۔ ہر علاقے میں مقامی رسوم اور روایتوں کا اس حد تک خیال رکھا گیا جس حد تک کہ وہ عدل وانسانیت کے عام اصول سے مطابقت رکھتے تھے۔ یہ صوبے نان ریگولیشن پراونس کہلاتے تھے اس واسطے کہ پریسی ڈنسیوں کے قوانین اور ضابطے ایک دم سے یہاں نافذ نہیں کئے گئے تاکہ رعایا کوئی یکایک تبدیلی نہ محسوس کرے۔ یہ صوبے راست گورنر جنرل کے تحت تھے۔ پنجاب میں بھی جہاں نظم ونسق کی مشین کو چلانے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا تھا لارڈ ڈلھوزی نے حقیقی دروبست اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔ ان صوبوں میں افسر ضلع کے اختیارات بہت وسیع رکھے گئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے تحت عدالت، پولیس، مالگزاری غرضکہ نظم ونسق کا ہر اہم شعبہ تھا۔ آہستہ آہستہ جب حالات میں تبدیلی ہوئی تو صوبوں کے چیف کمشنر لفٹنٹ گورنر بن گئے۔ پنجاب کا ایک صوبہ بن گیا۔ اودھ کو صوبہ شمال مغربی کے ساتھ ملا دیا گیا۔ برما میں بھی بعد میں لفٹنٹ گورنر کا عہدہ قایم ہوگیا۔ ناگپور کی ریاست سے جو علاقے ملے تھے وہ صوبہ متوسط کی شکل میں

ہمارے سامنے ہیں۔

ڈلہوزی کے عہد میں حکومت ہند کی آمدنی چھبیس سے تیس کروڑ سالانہ ہوگئی۔ تجارت میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ڈلہوزی چاہتا تھا کہ ملک میں ریلوں کا جال پھیل جائے تاکہ اندرونی علاقوں سے آسانی کے ساتھ مال بندرگاہوں تک پہنچ سکے۔ ۱۸۵۳ء میں پہلے پہل تھانہ سے بمبئی تک ریلوے لائن قایم ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد رانی گنج سے کلکتہ تک اور مدراس میں بھی ریلوے لائن قایم ہوئیں۔ بڑے بڑے شہروں اور فوجی چھاؤنیوں میں تار بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ ڈاک کی اصلاح عمل میں آئی۔ اب تک خط ہرکاروں کے ذریعے سے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے جاتے تھے اور کافی خرچ پڑتا تھا۔ ڈلہوزی نے آدھ آنہ کا محصول ملک کے ہر حصے میں خط بھیجنے کے لئے نکالا۔ تار برقی سے ملک پر حکومت کرنے میں آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ گورنر جنرل نے محکمۂ تعمیرات کی تنظیم کی اور ملک کے مختلف حصوں میں وسیع پیمانے پر سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ تعمیرات کے بجٹ میں کافی اضافہ کیا گیا۔ گنگا کی نہر کی تعمیر اگرچہ لارڈ ڈلہوزی کے آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا کام بہت سست رفتار سے ہو رہا تھا۔ چھ سال میں اس پر ڈیڑھ کروڑ کی رقم صرف کی گئی اور کام تکمیل کو پہنچا۔

اہل ہند کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ ملک میں دیہاتی مدرسے کھولے گئے تاکہ عوام میں تعلیم پھیلے۔ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ نے جو بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگرانی) کا صدر تھا اہل ہند کی تعلیم کی ایک ہمہ گیر یادداشت مرتب کی جس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ ہر صوبہ میں محکمہ تعلیمات اور ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ استادوں کی ٹریننگ کے لئے خاص مدرسے کھولے جائیں اور مڈل اسکولوں میں دیسی زبانوں میں تعلیم دینی چاہیئے۔ ان مدرسوں کو اسی طرح سے سرکاری امداد دینی چاہیئے جس طرح انگریزی مدرسوں کو امداد دینے کا طریقہ رائج تھا۔ اس وقت بنگال پریسیڈنسی میں انگریزی اعلیٰ تعلیم کی طرف بہ مقابلہ ابتدائی تعلیم کے زیادہ توجہ کی جا رہی تھی۔ چنانچہ

۱۸۵۲ء میں تیس انگریزی کالج موجود تھے جن میں طلبہ کی تعداد ۵ ہزار تھی۔ اسکے برخلاف بمبئی پریسیڈنسی میں انگریزی کے کالجوں کی تعداد صرف ۱۴ تھی اور ابتدائی مدرسوں کی تعداد (۲۳۳) تھی جن میں گیارہ ہزار سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سر چارلس وڈ کی تحریک پر مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) لئے ۱۸۵۴ء میں اہل ہند کی تعلیم کے متعلق حکومت ہند کو جو ہدایتیں بھیجیں ان میں ابتدائی تعلیم پر زیادہ زور دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں جب سے کہ میکالے کے اصول کے مطابق حکومت ہند نے اپنی تعلیمی حکمت عملی کی تشکیل کی تھی انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے متعلق دشواریوں کے احساس کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا گیا تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں انگریزی جیسی غیر زبان کو عام طور پر رواج دینا ممکن نہیں۔ اس خیال کی صحت میں بھی شبہہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزی کی توسیع سے نظم ونسق کے معاملوں میں حکومت ہند کو سہولت ہوگی۔ خاصکر ابتدائی تعلیم سوائے مادری زبان کے کسی غیر ملکی زبان کے ذریعے نہ صرف ممکن نہیں بلکہ اس ملک کے تمدن اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ ہے جس میں اس قسم کا تجربہ کیا جائے۔ چنانچہ ہوشمند انگریزوں نے میکالے کے اصول عمل کے نقائص محسوس کر لئے اور جدید تعلیمی حکمت عملی کی داغ بیل پڑی۔

سر چارلس وڈ (بعد میں لارڈ ہیلی فیکس) کی یادداشت نے اس جھگڑے کو ختم کر دیا جو ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف سنسکرت یا عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق میکالے کے وقت میں شروع ہوا تھا۔ اس یادداشت میں ہندوستان کے عوام کے لئے نہ تو انگریزی کو اور نہ کسی کلاسیکل زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔ اس کے بجائے مقامی دیسی زبانوں کو ابتدائی تعلیم میں استعمال کرنے کی سفارش کی گئی۔ اس کے ساتھ اس یادداشت میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ ان مدرسوں کی امداد کرے جو پاٹھشالاؤں اور مسجدوں میں قایم ہیں اور اپنے انسپکٹروں کو معائنہ کے لئے بھیج کر ان کی حالت کو سدھارنے کی کوشش کرے تاکہ ابتدائی تعلیم کے اس دیسی نظام تعلیم سے بھی رعایا اور حکومت فائدہ اٹھا سکیں۔

شاہی منشور

۱۸۵۳ء میں آخری مرتبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہی منشور عطا ہوا۔ گزشتہ منشور کو منظور ہوئے اب بیس سال گزر چکے تھے۔ پارلیمنٹ نے ارل آف ڈربی کی تجویز کے مطابق ہندوستانی نظم ونسق کے معاملوں پر غور و تحقیق کرنے کے لئے ایک مجلس منتخبہ مقرر کی۔ رائے عامہ کا اس وقت رجحان یہ تھا کہ کمپنی کے بجائے تاج برطانیہ ہندوستانی مقبوضات کے نظم ونسق اور تمام ذمہ داریوں کو اپنی طرف منتقل کرلے۔ لیکن اس قسم کی بنیادی تبدیلی پارلیمنٹ کے لئے قابل قبول نہ تھی جو کمپنی کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ انگریزی سیاست کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ تدریج سے تبدیلیاں کی جاتی ہیں اور اس طرح ماضی کے سلسلے کو یک لخت نہیں توڑا جاتا۔ اگرچہ گزشتہ نصف صدی میں مجلس نظماء کے اختیارات بہت کچھ چھن چکے تھے لیکن اب بھی پارلیمنٹ اس مجلس کی ماہرانہ رایوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ تقررات کے معاملے میں مجلس نظماء کی رائے کی زیادہ وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں مجلس نظماء کے اصرار پر مجلس نگران نے لارڈ ایلن براکو انگلستان واپس بلالیا۔

ہندوستان کے معاملوں پر مجلس منتخبہ نے جو سفارشیں کیں ان کے مطابق پارلیمنٹ نے ۱۸۵۳ء کا قانون منشور ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کیا۔ اس میں اس امر کی صراحت کردی گئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بدستور اس وقت تک تاج کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی رہے گی جب تک کہ پارلیمنٹ اس کے خلاف فیصلہ نہ کردے۔ اس منشوری قانون کی رو سے سول سروس کے ارکان بجائے نامزدگی کے عام مقابلہ کے ذریعہ مقرر ہوا کریں گے۔ لارڈ میکالے کی صدارت میں پارلیمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کردی تاکہ سیول سروس کے امتحان کے قاعدے اور ضابطے بنائے۔ امتحان انگلستان میں ہونا طے ہوا۔ گزشتہ منشوری قوانین میں کمپنی کے اختیارات کی بیس بیس سال کے لئے توسیع کی گئی تھی لیکن اس دفعہ کوئی میعاد نہیں مقرر کی گئی۔ اس قانون کی اہم دفعیں یہ ہیں۔

مجلس نظماء کے ارکان کی تعداد بجائے ۲۴ کے ۱۸ کردی جائے جن میں

سے ۶ کو تاج نامزد کرے گا۔ باقی بارہ میں سے چھ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں کمپنی کی خدمت میں کم سے کم دس سال ضرور صرف کر چکے ہوں اس دفعہ کے موجب یہ ممکن ہو سکا کہ کمپنی کے ان ملازموں کو مجلس نگران کی رکنیت دی جائے جو کمپنی کی ملازمت ختم کر کے وظیفہ پر علٰحدہ ہو چکے ہوں اور جنھیں پرانے طریق کار کے لحاظ سے منتخب ہونے کا امکان نہ تھا۔ انتظامی سہولت کے مدنظر بنگال اور بہار کا علٰحدہ لفٹنٹ گورنر مقرر کیا جائے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے قانونی رکن کی وہی حیثیت ہوگی جو دوسرے ارکان کی ہے۔ اس کو کونسل کے اجلاسوں میں شرکت کرنے اور رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اب تک رکن قانون کو صرف وضع قوانین کے معاملوں سے تعلق تھا۔ دوسرے عاملانہ اور انتظامی مسائل میں اس کی رائے نہیں طلب کی جاتی تھی۔ گورنر جنرل کی کونسل میں وضع قوانین کی سہولت کے مدنظر ۱۶ ارکان کا مزید اضافہ کیا گیا جن میں سے ایک بنگال کا چیف جسٹس اور ایک بنگال کی عدالت العالیہ کا جج ہوگا۔ باقی چار ارکان کو بنگال، مدراس، بمبئی اور صوبہ شمال مغربی کی حکومتیں نامزد کریں گی۔ ان ارکان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں کم سے کم دس سال رہ چکے ہوں۔ پہلے گورنر جنرل کی کونسل چھ ارکان پر مشتمل تھی یعنی گورنر جنرل، کمانڈر ان چیف اور چار ارکان کونسل۔ اب ۶ مزید ارکان کو ملا کر تعداد ۱۲ ہوگئی۔ اگرچہ گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ کونسل کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کو منظور نہ کرے لیکن وہ اس کا مجاز نہ ہوگا کہ ارکان کونسل کی اکثریت کی مرضی کے خلاف بذات خود کوئی قانون بنائے اور پھر خود ہی اس کے نافذ کرنے کا حکم دے دے۔ کونسل کے وضع کئے ہوئے قوانین اس وقت نافذ ہو سکیں گے جبکہ گورنر جنرل ان کی منظوری دے گا۔ گورنر جنرل اور گورنروں کی کونسلوں کے ارکان کے تقررات تاج کی جانب سے ہوا کریں گے۔ معاہداتی سیول سروس (کاوی نینٹڈ سیول سروس) کے تقررات انگلستان میں مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہونگے۔ امتحانوں کے متعلق مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) اسکیم منظور کرے گا جس کی

پابندی ضروری ہوگی۔

۱۸۵۴ء میں پارلیمنٹ نے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو انتظامی سہولت بہم پہنچانے کے لئے یہ اختیار دیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں اپنی صوابدید پر نئے حکام مقرر کرے۔ چنانچہ آسام، صوبہ متوسط اور برما کے چیف کمشنروں کا تقرر گورنر جنرل کرے گا اور انھیں مقامی نظم ونسق کے اختیارات سپرد کرے گا۔[1]

ڈلھوزی کا کارنامہ

ڈلھوزی نے ملک کا اندرونی نظم ونسق درست کرنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں وہ مفید ثابت ہوئیں ڈلھوزی بلا کا محنتی اور جفاکش تھا۔ وہ اپنی فرصت کے اوقات میں بھی حکومت ہی کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ اس کی نظر معاملوں کی تفصیل پر رہتی تھی۔ آٹھ سال کی متواتر جانکاہی سے اس کی صحت پر برا اثر پڑا۔ ہندوستان سے واپسی پر وہ چار سال تک صاحب فراش رہا اور ۴۸ سال کی عمر میں جو کچھ زیادہ نہیں تھی اس نے وفات پائی۔ وہ اگرچہ بڑا قابل اور فرض شناس حکمراں تھا لیکن اس میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دوسروں کی رائے اور ان کے جذبات کی مطلق پروا نہیں کرتا تھا اور ضابطہ کی تکمیل پر بہت زیادہ زور دیا کرتا تھا۔ لیکن ضابطہ پر اس صورت میں زور دیتا تھا جب کہ اس کی رائے اور ضابطہ میں موافقت پائی جاتی ہو۔ وہ خودرائے تحکم پسند اور ضدی تھا اس لئے اپنے ساتھیوں سے سوائے ان کے جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے وہ نباہ نہ کرسکا۔ اس نے سر چارلس نیپیر اور سر ہنری لارنس جیسے لوگوں کو جب کہ وہ اس کی رائے کے خلاف تھے بے اثر کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے ماتحتوں سے خوب دبا کر کام لیتا تھا اور چونکہ وہ خود بھی بہت جفاکش تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ دوسرے سب بھی اسی کی طرح حکومت کے کام کو فرض منصبی کی حیثیت سے انجام دیں۔

مختلف دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے اہل ہند کے سب سے

---

[1] Keith, A Constitutional History of India, p. 139.

زیادہ با اثر طبقہ یعنی امراء میں انگریزی حکومت کی طرف سے سخت بد دلی پھیل گئی تھی جس کی ذمہ داری یقیناً ڈلہوزی پر عاید ہوتی ہے۔ نہ صرف والیان ملک اور طبقہ امراء اصول بازگشت کے عمل درآمد کے سبب سے انگریزی حکومت کے خلاف ہو گئے بلکہ عوام میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے مذہب یا دھرم کو وہ خراب کرنا چاہتی ہے۔ مسیحی مبلغوں کی کوشش سے ڈلہوزی نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ جو ہندوستانی اپنا مذہب بدل لیں ان کے حقوق وراثت متاثر نہ ہوں۔ حالانکہ یہ بات ہندؤں کے دھرم شاستر اور مسلمانوں کی شریعت دونوں کے خلاف تھی۔ اس قانون کے منظور ہونے سے لازمی طور پر اہل ہند کے دل میں یہ شبہہ پیدا ہوا کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ملک میں مسیحی مذہب کی اشاعت اور تبلیغ سے اہل ہند بہت ناراض اور برافروختہ تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈلہوزی کے جانے کے بعد ملک میں بے چینی اور بد دلی کی لہر سی دوڑ گئی، بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز حکام رعایا سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے اور انھیں رعایا کے خیالات و جذبات کا علم تک نہ ہوتا تھا۔ کئی سال سے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے خلاف لوگوں کی ناراضی بڑھ رہی تھی جو بعد میں ایک دم سے زبردست شورش کی شکل میں نمودار ہوئی۔ لیکن انگریزوں کو اس وقت تک ان حالات کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ رونما نہ ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں جو بغاوت ہوئی اور جس کا اثر خاص شمالی ہند میں زیادہ تھا اس سے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں ہل گئیں۔

پندرھواں باب

(۱)

۱۸۵۷ء کا غدر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ

لارڈ کیننگ کا عہد حکومت

فروری ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ ڈلہوزی کا جانشیں مقرر ہو کر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانیہ میں نظم و نسق کا تجربہ حاصل کیا تھا اور پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر رہ چکا تھا۔ جب مجلس نظماء نے اس کو انگلستان میں وداعی دعوت دی تو اس موقع پر اس نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا تھا۔

"میری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان میں میرے عہد حکومت میں امن و امان قایم رہے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان کے آسمان کے صاف مطلع پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا ہے جو آدمی کی ہتھیلی کے برابر سہی لیکن وہی رفتہ رفتہ بڑھ کر یکایک طوفان کی طرح برس سکتا ہے اور سب کو سیلاب فنا میں بہا لے جا سکتا ہے۔"[1]

---

[1] Ibid., p. 549.

ان الفاظ سے کیننگ کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ جس طوفان کا اندیشہ اس نے ظاہر کیا تھا وہ اسی کے زمانے میں آیا اور ایسی شدومد کے ساتھ آیا کہ اس کی مثال ہندوستان کی برطانوی تاریخ میں نہیں ملتی۔

جب کیننگ کلکتہ پہنچا تو ڈلہوزی وہاں موجود تھا۔ اس سے اس نے ہندوستان کی عام حالت کے متعلق معلومات حاصل کیں اور مبادلہ خیالات کیا۔ ڈلہوزی نے اس کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کے امن وامان میں خلل ڈالنے والے کوئی اسباب نظر نہیں آتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈلہوزی نے آٹھ سال تک جس ملک پر بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کی اس کی حقیقی حالت سے وہ کس قدر بے خبر تھا۔ ڈلہوزی کا غالباً خیال تھا کہ برما کی لڑائی کے بعد کوئی فوجی قوت ملک میں ایسی موجود نہیں جس سے انگریزی حکومت کو کسی قسم کا خطرہ ہو سکے۔ لیکن اندر ہی اندر بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو بہت جلد بھڑک کر اپنی آگ کے شعلے سارے ملک میں پہنچا دینے والی تھیں اور خاص کر شمالی ہند میں۔ خود کلکتہ میں جہاں اودھ کے معزول حکمران نواب واجد علی شاہ کا قیام تھا انگریزوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کئے جا رہے تھے جن کی اہمیت کو انگریزی حکومت نے نظر انداز کیا۔ اودھ میں مسٹر جیکسن کو ڈلہوزی نے چیف کمشنر مقرر کیا تھا جس نے اہل اودھ کی تالیف قلب کرنے کے بجائے سختی کا برتاؤ کیا۔ ایک تو اہل اودھ کو اس کا صدمہ تھا کہ ان کا حکمران جلاوطن کر دیا گیا اور دوسرے یہ کہ نئی حکومت کا طرز کار ایسا تھا کہ جس سے جائز طور پر شرفا اور امراء کے دلوں میں اور عام رعایا میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ موقع ملتے ہی ان جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ اصول بازگشت کے بموجب بعض نہایت وسیع ریاستوں کو ڈلہوزی نے برطانوی عملداری میں ملا لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے جو انعامی کمیشن مقرر کیا اس کی سفارشوں کے بموجب تقریباً ۲۰ ہزار زمینداروں کی زمینداریاں دکن میں ضبط کر لی گئی تھیں اور جن لوگوں نے جعلی سندیں بنا کر

جاگیروں پر قبضہ کرلیا تھا وہ اپنی زمینوں سے محروم کر دئے گئے تھے اوران علاقوں کو رعیت داری نظام کے مطابق براہ راست انگریزی حکومت کے تحت کرلیا گیا تھا۔

ڈلہوزی نے دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کو دہلی سے الگ کرنے اور اس کے بعد اس کی اولاد کو شاہی خطاب سے محروم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن مجلس نظماء نے اس کی ان تجویزوں کو نامنظور کر دیا۔ مجلس نظماء نے اس موقع پر بڑی دور اندیشی اور عقلمندی کا ثبوت دیا۔ کیننگ کے ہندوستان آنے کے بعد مغل بادشاہ کے معاملے پر حکومت ہند نے پھر غور شروع کیا۔ چنانچہ کیننگ کے ایما پر حکومت ہند کی جانب سے بہادر شاہ کو ایک خط بھیجا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ لال قلعہ کی جس میں مغل بادشاہ کا قیام تھا انگریزی فوج کے لئے ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ بہادر شاہ کو جو خطاب و القاب حاصل ہیں وہ اس کے ذاتی ہیں۔ اس کے بعد اس کی اولاد کو انھیں استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ زینت محل نے جو بہادر شاہ کی چہیتی بیگم تھیں خاندانی عزت و وقار سے محروم ہونے کو بہت محسوس کیا۔ زینت محل کے اشارے پر انگریزوں کے خلاف شمالی ہند میں پروپگنڈا شروع ہو گیا۔ چونکہ حکومت ایران اس وقت انگریزی حکومت سے ہرات کے معاملہ پر برسرپیکار رہتی اس لئے بیگم کے ایلچی ایران تک پہنچے تاکہ حکومت ایران کو جنگ جاری رکھنے پر آمادہ کریں۔ بیگم کے ایلچی ہندوستان کے مختلف حصوں میں برابر اپنا کام کرتے رہے اور خاص کر مسلمانوں کو انھوں نے انگریزوں کے خلاف بھڑکانے میں کامیابی حاصل کی۔ پورے ملک میں اس قسم کی افواہیں پھیل گئیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کا راج بس ایک صدی رہے گا۔ جنگ پلاسی کے بعد سے اب چونکہ سو سال گزر چکے اس لئے اب پھر اسلامی حکومت کو استحکام نصیب ہوگا اس ضمن میں فارسی زبان کی متعدد نظمیں مشہور ہوئیں جن میں انگریزوں کے زوال کی پیشین گوئی کی گئی تھی اور جنھیں بعض بزرگوں سے منسوب کیا گیا تھا۔ یہ بھی عام طور پر مشہور تھا کہ لارڈ کیننگ کو خاص طور پر ملکہ وکٹوریہ نے اس لئے ہندوستان بھیجا ہے

کہ وہ اہل ہند کو عیسائی بنائے۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب باتوں کا مقصد اور منشاء یہی تھا کہ انگریزی عملداری ختم ہونے والی ہے یا اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن انگریزی حکومت اس تمام عرصے میں ایسی بے خبر رہی کہ اس نے ان باتوں کا توڑ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

فوج کی بغاوت ۱۸۵۷ء

کمپنی کی بنگال والی فوج میں بہت بڑی تعداد اس سپاہ کی تھی جس کا تعلق سرزمین اودھ سے تھا۔ ان کے ساتھ یہ رعایت کی گئی تھی کہ اگر وہ اپنے افسر مجاز کا صداقت نامہ پیش کر دیتے تو ان کے وہ مقدمات جو گاؤں میں اراضی وغیرہ کے ضمن میں پیدا ہوتے تھے ایک خاص عدالت کے روبرو تصفیہ کے لئے پیش ہوا کرتے تھے۔ لیکن ڈلہوزی کے عہد میں الحاق اودھ کے بعد یہ رعایتیں اٹھالی گئیں جن سے سپاہ میں بے چینی پھیل گئی۔ ۱۸۵۶ء میں سرکار کمپنی نے یہ حق نافذ کیا کہ آئندہ سے کسی ایسے شخص کو کمپنی کی فوج میں بھرتی نہیں کیا جائے گا جو اس بات پر حلف اٹھانے کو تیار نہ ہو کہ اگر ضرورت کے وقت اس کو سمندر پار بھیجنا منظور ہوا تو اس پر اس کو کسی قسم کا کوئی عذر نہ ہوگا۔ چونکہ شمالی ہند کے ہندوؤں میں صرف اعلیٰ ذات کے لوگ ہی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اس لئے ان ذاتوں میں کمپنی کی حکومت کے خلاف سخت بے چینی اور بددلی پھیل گئی۔ پھر اس کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے طبقے اور عوام میں مختلف وجوہ کی بنا پر انگریزی حکومت کے خلاف جو نفرت پھیلی ہوئی تھی اس کا اثر آہستہ آہستہ فوج پر بھی پڑنا شروع ہو گیا۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ کے قریب دمدم کی چھاؤنی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ولایت سے جو نئے کارتوس آئے ہیں ان کے کاغذ میں سور اور گائے کی چربی ملی ہوئی ہے۔ ان کارتوسوں کو بندوق میں رکھنے سے پہلے ان کا سرا دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس افواہ سے ڈر کر انگریز افسروں نے حکم دے دیا تھا کہ نئے کارتوس سپاہی نہ استعمال کریں لیکن یہ بہت بعد از وقت تھا۔ اس سے کوئی خاص فائدہ

نہیں ہوا۔ فوج کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ انگریز ان کا دھرم خراب کرنا اور ان کا ایمان بگاڑنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے بارک پور کی ۳۴ ویں دیسی پلٹن نے بغاوت کی اور پھر شمالی ہند کی دوسری چھاؤنیوں میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں سب سے بڑی چھاونی میرٹھ کی تھی۔ یہاں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء ہندوستانی سپاہ بگڑ گئی اور اپنے انگریز افسروں کو قتل کر ڈالا اور تمام ہتھیاروں اور سازوسامان پر قبضہ کرکے دہلی کی طرف دھاوا بول دیا۔ فوج کے ساتھ شہر اور گاؤں کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ شہر دہلی میں جو فوج موجود تھی وہ بھی دھاوا بولنے والے باغیوں سے مل گئی اور لوٹ مار ہونے لگی۔ دہلی بنک لوٹ لیا گیا۔ دہلی کا اسلحہ خانہ جو صوبۂ شمال مغربی میں سب سے بڑا مخزن تھا لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ اس کو ایک انگریز افسر نے بارود سے اڑا دیا۔ چھاؤنی کی دو ہندوستانی رجمنٹیں انگریز افسروں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے بنگلوں کو جا کر آگ لگا دی۔ دہلی کے لال قلعہ میں جو انگریز تھے انھیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد باغیوں نے بوڑھے بہادر شاہ کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ کو ایک چاندی کے تخت پر بٹھا کر اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ افسروں نے نذریں گزرانیں اور شاہی فرامین کا نفاذ ہونے لگا۔ اب بغاوت صوبۂ شمال مغربی کے ہر گوشہ میں پھیل چکی تھی اور دہلی اس کا مرکز تھا۔ بظاہر یہ بغاوت اگرچہ فوجیوں کی تھی لیکن عوام میں چونکہ پہلے سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس لئے باغیوں کو ہر طرف سے پوری امداد ملی اور ان سب لوگوں نے جو انگریزی حکومت سے ناخوش تھے بغاوت کو پھیلانے میں مدد دی۔

دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو جانے کی خبر لاہور پہنچی تو انگریز افسروں نے پنجاب کی مختلف چھاؤنیوں میں دیسی سپاہ سے ہتھیار رکھوا لئے اور اسلحہ خانے اور مخزنوں پر گورا فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ وادئ پیشاور کی چار ہندوستانی رجمنٹوں نے بغاوت کی کوشش کی لیکن ان کو اچانک طور پر گھیر لیا گیا اور ہتیار

رکھوا لئے گئے۔ ایک رجمنٹ نے پیشاور کے قریب بغاوت کی جسکو کرنل نکلسن نے شکست دے کر منتشر کر دیا۔ جہلم اور سیالکوٹ کی دیسی سپاہ کا جبکہ وہ دہلی کی طرف کوچ کر رہی تھی کرنل نکلسن نے پیچھا کیا اور دہلی پہنچنے سے پہلے انھیں منتشر کر ڈالا۔ میرٹھ کی بغاوت کے ایک مہینے کے اندر شمالی ہند کی کوئی ایسی دیسی رجمنٹ نہیں تھی جس نے بغاوت نہ کی ہو۔ تمام باغی سپاہی دہلی کی طرف کھینچ کھینچ کر جمع ہونے لگے جو نئی حکومت کا صدر مقام قرار پا چکا تھا۔

لارڈ کیننگ کو معلوم تھا کہ دہلی نے ایک خاص مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے جب تک کہ اس پر قبضہ نہ ہو اس وقت تک انگریزی فوج کو اپنے اوپر بھروسا نہ ہوگا۔ چنانچہ ۸ ارجون ۱۸۵۷ء کو جنرل ولسن کی قیادت میں دہلی کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن یہ محاصرہ بے اثر رہا۔ بعض کا خیال ہے کہ خود انگریز فوج کی حیثیت ایسی چھاونی کی سی ہوگئی تھی جسکا باغیوں نے محاصرہ کر لیا ہو اس لئے کہ یہ شروع سے برابر مدافعت کر رہی تھی۔ توپوں اور سپاہ کی تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کوئی اقدامی کارروائی نہ کر سکی۔ انگریزی فوج کو پنجاب سے جو کمک بھیجی جا رہی تھی وہ بہت کم تھی اس کے مقابلے میں باغیوں کی تعداد میں ان نئی رجمنٹوں کی امداد سے برابر اضافہ ہو رہا تھا جو شمالی ہند کے مختلف حصوں سے دہلی چلی آرہی تھیں۔ اسی دوران میں سر جان لارنس نے سکھوں میں یہ پروپگنڈا شروع کیا کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم لوگ اس وقت انگریزی حکومت کی مدد کروگے تو تمھیں فوجی ملازمتوں میں خاص رعایتیں دی جائیں گی۔ سکھوں میں ایک یہ پرانی پیشین گوئی چلی آتی تھی کہ دہلی کا لال قلعہ ایک دن سکھوں کے قبضہ میں آجائے گا۔ چنانچہ سکھ قوم کو یہ سمجھایا گیا کہ اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ سکھ بڑے مذہبی جوش کے ساتھ جوق جوق انگریزی فوج میں داخل ہونے لگے۔ ۱۴ ار اگست کو بریگیڈیر نکلسن فوج کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ جب اس کو اطلاع ملی کہ باغیوں کی فوج مع توپ خانہ اس قلعہ شکن

توپ خانہ کو راستہ میں ختم کرنے کیلئے روانہ ہوئی ہے جو فیروز پور سے دہلی کی طرف آرہا تھا اور جس کا سلسلہ تیرہ میل کی لمبائی میں تھا تو وہ انکے مقابلے کیلئے روانہ ہوا اور راستہ ہی میں شکست دیکر منتشر کردیا۔ یہ قلعہ شکن توپ خانہ ۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچ گیا۔ ایک ہفتہ تک پچاس بڑی توپوں نے دہلی کی فصیلوں پر گولے برسائے اور انمیں رخنے ڈالدیے یہاں تک کہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چار جگہ سے شہر پر دھاوا کردیا گیا جس کی قیادت بریگیڈیر نکلسن کے ہاتھ میں تھی۔ دھاوے کے وقت اس کو ایک کاری زخم لگا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دشمن نے بڑی جانبازی سے مدافعت کی۔ چپہ چپہ زمین پر انھوں نے مقابلہ کیا۔ چھ دن تک اسی طرح شہر میں لڑائی کا بازار گرم رہا۔ آخر انگریزی فوجوں نے لال قلعہ پر بھی شہر پناہ کے پھاٹکوں کو سرنگ سے اڑا دینے کے بعد قبضہ کرلیا۔ بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی۔ کپتان ہڈسن نے بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے افراد کو مقبرہ میں جاکر گرفتار کیا اور لال قلعہ میں انھیں نظر بند کردیا گیا۔ دوسرے دن ہڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گرفتار کرکے گولی ماردی۔ کئی ماہ بعد بہادر شاہ پر مقدمہ چلایا گیا اور اسکو اور اس کی بیگم زینت النساء کو جلا وطن کرکے رنگون بھیجدیا گیا اور وہیں ۱۸۶۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا۔

دہلی کی فتح سے باغیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ اب عام طور پر اہل ہند میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ انگریزوں کے اقبال کا ستارہ عروج پر ہے۔ انگریزوں کو سمندر کے راستے سے اس عرصے میں برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ برخلاف اس کے باغیوں کی فوج روز بروز کم اور منتشر ہوتی جارہی تھی۔ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں باغیوں کا قبضہ تھوڑے دنوں تک رہا لیکن بہت جلد ایک ایک کرکے ان کا خاتمہ کردیا گیا۔

اودھ بھی بغاوت کا بڑا زبردست مرکز تھا۔ لکھنؤ میں سر ہنری لارنس نے بڑی بہادری سے ریزیڈنسی میں انگریزوں کو پناہ دی تھی اور جو کچھ سامان جنگ مل سکا اس سے اپنی مدافعت کرتا رہا۔ باغیوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ

کرلیا اور سر ہنری لارنس ایک گولے کے پھٹنے سے مارا گیا۔ لیکن پھر بھی باغی ریزیڈنسی پر قبضہ نہ کرسکے۔ آوٹ رم، ہیولاک اور سر کولن کیمپ بل کے پہنچنے پر باغیوں کو شکست ہوئی اور محصور انگریزوں کی جان بچی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اودھ میں امن وامان قایم ہوا۔ اودھ کے جن تعلقداروں نے کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لیا تھا ان کے خلاف فوج کشی کی گئی اور ان کی جاگیریں ضبط کرلی گئیں۔ سر کولن کیمپ بل کو اودھ میں امن وامان قایم کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ نیپال کے وزیر اعظم جنگ بہادر نے انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ گورکھا فوجوں کی مدد سے پورے اودھ پر انگریزوں نے پھر سے قبضہ کرلیا۔

کانپور میں باغیوں کی قیادت نانا صاحب نے کی جو آخری پیشوا باجی راؤ کا متبنیٰ تھا۔ ڈلہوزی نے باجی راؤ کی وفات پر پنشن بند کردی تھی۔ نانا صاحب کو باجی راؤ کا خزانہ اور سازوسامان ورثہ میں ملا وہ اپنی محرومی کی وجہ سے انگریزوں سے سخت ناراض تھا اور ان سے بدلہ لینے کی فکر میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ باغیوں کی مدد سے مرہٹہ راج کو پھر سے قایم کرے۔ اس نے انگریزوں کو محاصرہ میں لے لیا۔ سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد انگریزوں نے ہتیار ڈال دیئے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ انگریزوں نے جب اطاعت قبول کرلی تو انھیں دریائے گنگا کے راستے سے کشتیوں پر سوار کرکے الہ آباد بھیجنے کا وعدہ کیا گیا۔ جب وہ کشتیوں پر سوار ہوگئے تو کنارے پر سے نانا صاحب کے حکم سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ نانا صاحب نے یکم جولائی سنہ ۱۸۵۷ء اپنے پیشوا ہونے کا اعلان کیا اور اس تقریب کو بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ آخر کرنل ہیولاک نے کانپور پر قبضہ کرلیا۔ نانا صاحب نے بھاگ کر اودھ میں اور پھر نیپال میں پناہ لی۔ انگریزوں نے ہر چند اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا اور اس نے اپنی باقی زندگی جلاوطنی میں گزاردی۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے بڑی بہادری سے انگریزی فوجوں

کا مقابلہ کیا۔ سر ہیوروز نے اس کے اور نانا صاحب کے سپہ سالار تانتیا ٹوپی کے خلاف زبردست ہم شروع کر دی۔ سندھیا کی سب فوج بغاوت میں رانی کے ساتھ شریک ہوگئی تھی۔ رانی نے گوالیار کے قلعہ میں انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ مردانہ لباس پہنے مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی۔ تانتیا ٹوپی کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ کالپی، جھانسی اور بندیلکھنڈ کے دوسرے مقاموں پر جہاں بغاوت کے مرکز قایم ہوگئے تھے سر ہیوروز نے قبضہ کر لیا اور انگریزی عملداری کو از سر نو قایم کیا۔

شمالی ہند میں دوآبہ اور روہیلکھنڈ میں باغیوں کا بڑا زور تھا۔ فرخ آباد، شاہ جہاں پور اور بریلی وغیرہ پر ایک ایک کر کے انگریزی قبضہ ہوگیا۔ باغیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جو باقی رہ گئیں وہ بھی بہت جلد منتشر کر دی گئیں۔ غدر کو فرو کرنے میں انگریزی فوجوں نے اکثر مقامات پر وحشیانہ مظالم ڈھائے اور غیظ و غضب کا اظہار کیا جنھیں انگریز مورخ یہ کہہ کر حق بجانب ٹھہراتے ہیں کہ ان حالات میں یہی طرز عمل مناسب تھا۔

شورش کو دبانے میں تقریباً دو سال لگے۔ بغاوت زیادہ تر شمالی ہند اور وسط ہند تک محدود رہی۔ دکن میں سر سالار جنگ نے غدر کے ہنگاموں میں انگریزی حکومت کے ساتھ معاہدوں کے بموجب دوستی قایم رکھی۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت بڑی پریشانی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ گورنر بمبئی نے ریزیڈنٹ حیدرآباد کو اس مضمون کا تار دیا تھا کہ "اگر حیدرآباد پھر گیا تو پھر ہمارا خاتمہ ہے"۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے اس پر آشوب زمانے میں نہ صرف انگریزی حکومت کی حمایت کی بلکہ اپنی عملداری میں کسی قسم کی باغیانہ تحریک کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ بلدہ حیدرآباد میں باغیوں نے فوج کو ملانے کی کوشش کی اور ریزیڈنسی پر حملہ بول دیا لیکن ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اسی طرح اورنگ آباد کے کنٹنجنٹ فوج میں بھی بعض سرپھرے سپاہیوں نے بغاوت کی کوشش کی لیکن ان کی شورش فوراً دبا دی گئی۔ سر سالار جنگ نے غدر کے موقع پر جو خدمات

انجام دیں اس کے لئے انگریز قوم ان کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی کم تھا۔ گوالیار کے وزیر اعظم سر ڈنگر راؤ نے مہاراجہ گوالیار کو جو کم عمر تھا انگریزوں کے ساتھ وفاداری پر استوار رکھا۔ سندھیا کے وفادار رہنے کا اثر یہ ہوا کہ دوسری مرہٹہ ریاستوں نے بھی غدر میں حصہ نہیں لیا ورنہ انگریزوں کی پریشانیاں اور بڑھ جاتیں۔[1] مہاراجہ ہلکر، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ کولھاپور اور دوسرے مرہٹہ حکمران اس موقع پر وفادار رہے۔ راجپوتانہ کی ریاستیں بھی شورش سے الگ رہیں۔ سندھ اور افغانستان، بنگال اور نیپال اور جنوبی ہند کے حصوں میں غدر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چونکہ شورش زیادہ تر صوبہ شمال مغربی تک محدود تھی اس لئے انگریزوں کو اس امر پر قابو پانے میں سہولت ہوئی۔

سرکار انگریزی نے ان سب لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا جنھوں نے شورش کے زمانے میں انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنے گھروں میں چھپا کر ان کی جانیں بچائی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے شورش میں حصہ لیا تھا یا کسی قسم کی امداد کی تھی بہت سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ فوجی عدالتوں کے حکم سے بعض وقت بالکل معمولی شبہہ کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ آدمیوں کو سنگین سزائیں دی گئیں۔ اگرچہ خود کیننگ اور سر جان لارنس گورنر پنجاب کی یہ رائے تھی کہ انگریزوں کو انتقام کے جوش میں بالکل اندھا نہ ہو جانا چاہئے اور جہاں تک ہو سکے ظلم اور زیادتی سے بچنا چاہئے لیکن فوجی سرداروں کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ چنانچہ نکلسن کا خیال تھا کہ اگر انتقام لینے کے لئے اور آئندہ کے لئے اہل ہند کو نصیحت کرنے کے واسطے ان لوگوں کو جنھوں نے شورش میں حصہ لیا ہے زندہ جلا دیں یا ان کے جسموں کی کھالیں کھنچوا لیں یا ان کے جسموں میں نوکدار لوہے کی کیلیں ٹھوک کر موت کے گھاٹ اتار دیں تو بالکل حق بجانب ہوگا۔[2] کیننگ نے فوجی عدالتوں

۱۔ Holmes, History of the Indian Mutiny.

۲۔ McLeod Innes. The Sepoy Revolt, p. 301.

۳۔ Kaye, History of the Indian Mutiny, Vol. II, p. 301.

کی رہنمائی کے لئے قاعدے اور ضابطے نافذ کرائے تھے تاکہ بغیر کافی تحقیق کئے ہوئے اور ثبوت فراہم کئے ہوئے کسی کو سزا نہ دی جائے لیکن ان قاعدوں کی پروا نہیں کی گئی بلکہ اور تعریض کے طور پر فوجی افسر کیننگ کو "کلیمنسی کیننگ" (رحم کا پتلا کیننگ) کہا کرتے تھے۔ حالانکہ کیننگ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اہل ہند کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور تلخی نہ بڑھے تاکہ آئندہ ان پر حکمرانی میں سہولت ہو اور پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ باغیوں کے سامنے کوئی متحدہ سیاسی مقصد نہ تھا اور ان کے پاس قابل اور بلند پایہ قائدوں کی کمی تھی۔ فوج کی ایک جماعت دہلی کی مغل شہنشاہی کے احیا کا خواب دیکھ رہی تھی اور دوسری جماعت مرہٹہ حکومت قایم کرنا چاہتی تھی۔ خود ہندوستانی فوج کا زیادہ حصہ جس میں سکھوں کی فوجیں اور بمبئی اور مدراس کی فوجیں شامل ہیں بغاوت میں شریک نہیں ہوا بلکہ ان فوجوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا اور اپنے اہل ملک کو شکست دینے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ پھر انگریزوں کی پشت پناہی پر وہ سب فنی اور سائنٹفک قوتیں تھیں جو مغربی تمدن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دنیا کے سمندروں پر انگریزوں کا غلبہ مسلم تھا۔ چنانچہ جب ضرورت ہوئی تو انگلستان سے انگریزی فوج کمک کے لئے ہندوستان پہنچ گئی۔ باغیوں کو کہیں سے کوئی کمک نہیں پہنچی۔ ان کی قوت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ والی افغانستان اور شاہ ایران نے اس موقع پر اہل ہند کی کوئی مدد نہ کی۔ اور وہ مدد کیوں کرتے۔ جب ان پر مصیبتیں آئیں تو اہل ہند نے ان کی کونسی مدد کی تھی! غرضکہ غدر میں نہ تو ہندوستان کے سب لوگوں نے دل سے شرکت کی اور نہ باہر سے انھیں کوئی مدد مل سکی۔ زراعت پیشہ، تجارت پیشہ اور حرفت پیشہ طبقے زیادہ تر الگ تھلگ رہے۔ اگرچہ ایران کی حکومت اس وقت انگریزوں سے برسر پیکار تھی اور ایرانی سفیر بات چیت کے لئے بہادر شاہ کے پاس دہلی پہنچے بھی تھے لیکن خود ایرانی حکومت کی حالت ایسی تھی کہ وہ کوئی موثر امداد نہیں بھیج سکتی تھی۔ تین پریسیڈنسیوں

کی فوجوں میں سے صرف بنگال پریسی ڈنسی کی فوج نے اطاعت سے انکار کیا تھا۔ باقی دیسی فوج کو انگریز افسروں نے خود ان کے ہم وطنوں کی سرکوبی کے لئے استعمال کیا۔

اگرچہ شورش کو فرو کرنے میں انگریزی حکومت کو کامیابی ہوئی لیکن اسکے نفسیاتی اثرات بہت گہرے تھے جن کو فوراً دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ اہل ہند کے حساس طبیعتوں کا ردعمل تھا اس مغربی نظام فکر و تمدن کے خلاف جو آہستہ آہستہ پورے ملک پر چھا رہا تھا اور جس کی وجہ سے قدیم تمدن کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اگرچہ عسکری کامیابی انگریزوں کو حاصل ہوگئی تھی لیکن اہل ہند کے دلوں میں جو نفرت اور تلخی پیدا ہوگئی تھی وہ اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک طرف اپنی بے بسی کا احساس اور دوسری طرف یہ احساس کہ چاہے کچھ ہو وہ مغربی تمدن کے غلبے کو تسلیم نہیں کرینگے اہل ہند کے لئے سوہان روح کا باعث بنا رہا۔ عوام کی حالت ہندوستان میں ہمیشہ سے تماشائیوں کی سی رہی ہے۔ وہ اپنی مصیبتوں میں ایسے مبتلا رہے کہ انھیں اس کی پروا نہیں تھی کہ ایک حکمران کی جگہ دوسرا حکمران آیا۔ اگر ملک میں سیاسی انقلاب ہوگیا تو ہوا کرے۔ وہ قوت لایموت کی فکر اور اپنی زندگی کی دوسری ضروریات حاصل کرنے میں ایسے مشغول تھے کہ سیاست ہمیشہ ان کے خیال سے علٰحدہ رہی۔ لیکن باوجود اس کے ۱۸۵۷ء کے غدر کا عام طور پر اہل ہند کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ بہت سوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کا مذہب خطرہ میں ہے یا یہ کہ ان سبھوں کو عیسائی بنا لیا جائیگا۔ اس زمانہ میں مذہب تہذیب کا دوسرا نام تھا ہندوؤں میں آریہ سماج کی تحریک اور مسلمانوں میں وہابی تحریک مغربی تہذیب و تمدن سے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی زبردست کوششیں تھیں ان تحریکوں نے ماضی پرستی کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا۔ ان تحریکوں نے بعد میں مذہبی خیالات کا تعارف ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس طور پر کرایا جو ایک انقلابی حیثیت رکھتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد انگلستان میں یہ بات شدت سے محسوس کی جانے لگی

کہ ہندوستان میں اب تک برطانوی حکومت جس نہج پر چلائی گئی ہے اس میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اقتدار اپنے طرز حکومت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کسی قسم کی بھی تبدیلی کے خلاف تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مسٹر جان اسٹورٹ مل نے مجلس نظماء کی ہدایت کے بموجب ایک یادداشت پارلیمنٹ میں پیش کی جس میں اس الزام کی تردید کی گئی کہ غدر کو کمپنی کی بدانتظامی سے کوئی تعلق تھا۔ اس امر پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان کے برطانوی نظم ونسق میں بنیادی تبدیلی ایسے وقت کی جارہی ہے جب کہ حالات پوری طرح سے قابو میں نہیں آئے ہیں۔ یادداشت کے الفاظ یہ ہیں۔

"درخواست کنندگان (یعنی ارکان مجلس نظماء) ان الزاموں کو جو ان پر لگائے گئے ہیں کسی دوسرے کے سر نہیں تھوپنا چاہتے۔ ہندوستان پر جس طرح سے حکومت کی گئی ہے اس کی پوری ذمہ داری وہ اپنے اوپر لینے کو تیار ہیں۔ وہ اس ذمہ داری کو باعث ذلت نہیں بلکہ موجب فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔ انھیں اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ ان کے مشورے اور ان کے اقدامول کی بدولت ہندوستان کے معاملوں کو طے کرنے اور چلانے میں بڑی مدد ملی۔ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہندوستان کے نظم ونسق کے متعلق حقیقی تحقیق کی جائے گی اور جتنے زیادہ معاملے تاریکی سے روشنی میں آئیں گے اتنی ہی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ کمپنی نے لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کچھ کیا اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ خاص طور پر گزشتہ پیڑھی اور موجودہ پشت میں کمپنی کی حکومت ترقی کرتی رہی ہے اتنی ترقی پذیر دنیا کی کوئی دوسری حکومت نہیں رہی۔ اب جبکہ پارلیمنٹ ہندوستان کے انتظاموں میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے تو اس وقت بھی مختلف

محکموں میں ترقی جاری ہے جیسی کہ پہلے کبھی نہ تھی! انھیں اس امر کا
یقین ہے کہ ہندوستان میں جو کچھ بھی ترقیاں آئندہ وجود میں آئیں گی
ان کے بیج کمپنی کے عہد حکومت میں بوئے جا چکے ہیں۔ آئندہ جو کچھ
تعمیر ہوگی وہ ان بنیادوں ہی پر ہوگی جو کمپنی کے عہد میں اس کی ہدایتوں
کے بموجب قایم کی گئی ہیں[1]۔

لیکن اس یادداشت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لارڈ پامرسٹن نے جب قدامت پسند حکومت کی طرف سے ہندوستان کا نظم و نسق تاج کو منتقل کرنے کی تجویز کی تو مسٹر بیرنگ نے اس پر ترمیم پیش کی اور لارڈ ایلن برا نے مخالفت کی لیکن تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی اور اسی کے مطابق قانون بنایا گیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بقول مارشمین وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تخلیق تاج نے ڈھائی سو سال پہلے اس غرض سے کی تھی کہ برطانوی تجارت کو مشرقی ممالک میں وسعت دے۔ لیکن اس کمپنی نے اپنی کارگزاری ختم کرتے وقت تاج کو ایسی سلطنت منتقل کی جو روما کی سلطنت سے بھی زیادہ شاندار تھی[2]۔

اگست ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا گیا اس لئے کہ وہ اپنی غایت پوری کر چکی تھی۔ یہ بات عرصے سے بے اطمینانی کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی کہ اتنی بڑی سلطنت کی باگ ڈور جیسی کہ ہندوستان میں انگریزوں نے قایم کر لی تھی ایک تجارتی کمپنی کے ہاتھ میں رہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کی بڑی شورش پیش نہ آتی تو بھی غالباً ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور حکمران کے ہندوستان میں زیادہ عرصہ تک نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ۱۸۵۸ء کے قانون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام ذمہ داریاں تاج برطانیہ کو منتقل کر دیں اور مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) اور اس کے صدر کی جگہ وزیر ہند اور اس کی کونسل پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کے نظم و نسق کے

---

[1] G. D. The History of the Indian Revolt (Appendix)

[2] Marshman, p. 521

ذمہ دار قرار پائے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں تاج برطانیہ
کے تحت براہ راست اچھی حکومت قائم کرنے کے وسیلے اختیار کئے جائیں اسواسطے
اس کو "بہتر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ"[1] کہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی
گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ قرار دیا گیا۔ مجلس نظما، اور بورڈ آف کنٹرول
کے جملہ اختیارات سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (وزیر ہند) کو منتقل کردیے
گئے۔ وزیر ہند کی کونسل پندرہ ارکان پر مشتمل ہوگی جن میں سے ۸ براہ راست
تاج کی جانب سے نامزد ہوں گے اور ۷ کا انتخاب ایسٹ انڈیا کمپنی کے
نظما کریں گے۔ ان نامزد کردہ اور منتخب شدہ ارکان میں سے بیشتر وہ اشخاص ہونے
چاہئیں جو کم سے کم دس سال ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں رہ چکے ہوں یا
کم سے کم دس سال تک ہندوستان میں رہ چکے ہوں اور جنھیں ہندوستان
سے واپس ہوئے دس سال سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔ وزیر ہند
کی کونسل کے ارکان کی رکنیت اس وقت تک باقی رہے گی
جب تک کہ ان کا رویہ قابل اطمینان رہے گا۔ لیکن اگر پارلیمنٹ کے دونوں
ایوانوں میں ان میں سے کسی کے متعلق علیحدگی کا فیصلہ ہو جائے تو ایسی صورت
میں وہ وزیر ہند کی کونسل کی رکنیت سے الگ کر دیے جائیں گے۔ وزیر ہند
انڈیا کونسل کا صدر ہوگا اور کونسل کی اکثریت سے اختلاف کی صورت میں
وہ اپنا فیصلہ ناطق کرنے کا مجاز ہوگا سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق
اجرائی تمسکات، ملکیت کی فروخت یا رہن، رقموں کی نشان دہی، معاہدوں
یا تنخواہوں میں تغیر یا رخصت کے قاعدوں میں تبدیلی سے ہو۔ وزیر ہند کو اختیار
ہوگا کہ بغیر کونسل میں پیش کئے ہوئے اہم سیاسی نوعیت کے احکام براہ راست
ہندوستان بھیج سکے خاص کر ایسے احکام جن کا تعلق صلح و جنگ یا دیسی والیان
ملک کے متعلق کوئی خاص پالیسی اختیار کرنے سے ہو۔ ہندوستان سے جو
خفیہ مراسلے وصول ہوں گے وہ بغیر وزیر ہند کی اجازت کے انڈیا کونسل

---

۱ - Keith, A. Constitutional History of India, p. 165.

کے سامنے پیش نہیں ہو سکتے۔
حکومت ہند کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر تاج یا وزیر ہند کی جانب سے ہوا کرے گا۔ لفٹنٹ گورنروں کا تقرر گورنر جنرل کرے گا جس کی منظوری تاج سے حاصل کرنا ضروری ہوگی۔ ہر محبّتی ملکہ معظمہ کی رعایا میں سے ہر ایک کو یہ حق ہوگا کہ سول سروس کے امتحان کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکے جسکی بابت بہت جلد انتظامات وزیر ہند بہ اجلاس کونسل سول سروس کے کمشنروں کی مدد سے انجام دے گا۔ حکومت ہند کی آمدنی کو خرچ کرنے کی ذمہ داری وزیر ہند پر ہوگی۔ اس آمدنی میں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اصل حصہ داروں کو منافع دیا جائے گا اور کمپنی کے قرضے کی ادائی بھی اسی میں سے کی جائے گی۔ ان حسابات کی تنقیح ایک خاص ناظر حسابات کے ذمہ ہوگی۔ قانونی اغراض کے لئے وزیر ہند پر وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں عاید ہونگی جو ایسٹ انڈیا کمپنی پر عاید تھیں۔ کمپنی کی فوجیں اور بحریہ جو ہندوستان میں ہے تاج کی ملازمت میں منسلک کر لیا جائے گا۔ ان فوجی ملازموں کی تنخواہوں اور ان کے حقوق اور رعایتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔
گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے رکن قانونی اور گورنروں اور ایڈوکیٹ جنرل کا تقرر براہ راست تاج کرے گا۔ گورنروں کی کونسل کے باقی ارکان کا انتخاب وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کی جانب سے کیا جائے گا اور ایسا کرنے میں کونسل کی اکثریت کے فیصلے کے مطابق عمل ہو گا۔ وزیر ہند اگر ہندوستان میں کسی والئی ملک کے خلاف اعلان جنگ کا حکم بھیجے تو ضرور ہے کہ تین مہینے کے اندر اس کی اطلاع پارلیمنٹ کو کر دی جائے۔ ہندوستانی مقبوضات کے باہر اگر ہندوستانی فوج بھیجی جائے گی تو اس کے اخراجات کا بار حکومت ہند کے خزانہ پر نہ ہوگا سوائے اس حالت کے کہ ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کے لئے فوج کو سرحد پار بھیجنا ضروری ہو گیا ہو یا اسی طرح کی اور کوئی غیر معمولی اور اچانک صورت پیش آجائے۔ وزیر ہند کا فرض ہو گا کہ ہر سال ہندوستان

کی مادی اور اخلاقی ترقی کی بابت پارلیمنٹ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔

۱۸۵۸ء کا قانون دستور جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک نشان منزل کا حکم رکھتا ہے جس کی رو سے اس وسیع ملک کے انتظام اور اسکی سرحدوں کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں چلی گئی آمد و رفت کے وسیلوں کی سہولت اور ریل اور تار کے رواج سے ہندوستان انگلستان سے اتنا دور نہیں رہا جتنا کہ سو سال پہلے تھا۔ اب کوئی وجہ نہ تھی کہ تاج برطانیہ اس ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور لیتے ہوئے ہچکچاتا ہندوستان انگریز قوم کے لئے بطور امانت تھا جس سے انگریز قوم کی آئندہ نسلیں فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اس لئے ضرور تھا کہ اس امانت کو اپنے قبضہ و تصرف سے باہر نہ جانے دیا جائے جیسا کہ غدر کے وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔
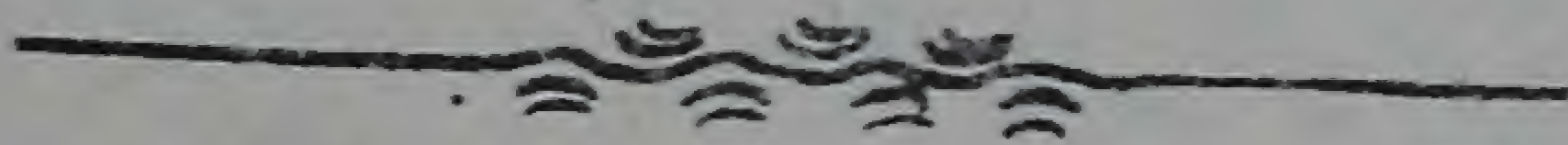
سولھواں باب

تاج برطانیہ کی ابتدائی حکومت

ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلان شائع کیا جس کا ترجمہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں شایع کیا گیا اس اعلان میں بتایا گیا تھا کہ رعایا کے مذہبی معاملوں میں حکومت مداخلت نہیں کرے گی اور نہ مسیحی عقیدوں کو رعایا سے منوایا جائے گا۔ مذہبی شعائر یا عقائد کی بنا پر نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے گی اور نہ کسی کو ستایا جائے گا بلکہ قانون سب کا ایک سا محافظ ہوگا۔ ہر شخص جو اہلیت رکھتا ہوگا اس کو بلا تخصیص نسل و مذہب حکومت ہند کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ تک پہنچنے کا موقع حاصل رہے گا۔ تمام معاہدات اور تمام مناصب اور تمام حقوق و عملدرآمد جنھیں کمپنی کی حکومت تسلیم کرتی تھی وہ بدستور قایم و برقرار رہیں گے۔ اس اعلان کے ذریعے ان باغیوں کے قصور معاف کر دئے گئے جنھوں نے غدر میں دوسروں کے بہکانے سے حصہ لیا تھا اور جو گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چھپے چھپے پھرتے تھے۔ البان بلک

کو یقین دلایا گیا کہ آیندہ ان کی ریاستیں ضبط نہیں کی جائیں گی اور انھیں اپنے رسوم اور روایتوں کے مطابق متبنی کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ یہ بھی اطمینان دلایا گیا کہ تاج برطانیہ اپنے ملکی مقبوضات میں کسی اضافہ کا خواہاں نہیں ہے۔ جس طرح وہ اس بات کا روادار نہیں ہے کہ برطانوی ملک یا حقوق میں دست اندازی کی جائے اسی طرح وہ اس کو بھی جائز نہیں سمجھتا کہ کسی دوسرے کے ملک یا حقوق میں مداخلت کی جائے۔ حکومت برطانیہ اپنے حقوق کی طرح دیسی والیان ملک کے وقار اور مرتبہ کا احترام کرے گی۔[1]

یکم نومبر ۱۸۵۸ء لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ایک بڑا دربار کیا جس میں امن وامان قایم ہونے اور عام معافی کا اعلان کیا گیا تاکہ رعایا کے دلوں میں اطمینان پیدا ہو اور ہر شخص بلا کسی خوف اور خدشہ کے اپنے اپنے کام میں لگ جائے۔ کیننگ نے بڑی فراخ دلی سے اپنی حکمت عملی کو نافذ کیا جس کی وجہ سے امن وسکون کے قایم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان ہندوستانیوں کے حق کا منشور اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ہر خیال کے ہندوستانیوں نے اپنی آزادی اور حقوق کی بنیاد قرار دیا۔ اب شورش فرو ہو چکی تھی۔ برطانوی غلبہ اور تسلط ہندوستان کے ہر گوشے میں مانا جا چکا تھا اب وقت آگیا تھا کہ انگریز قوم ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرتے اور اس ملک کے نظم ونسق میں جدید حالات کے مطابق اصلاح کرنے کی جانب قدم اٹھاتی۔

۱۸۵۷ء کی بڑی شورش کے بعد ہندوستان میں ایسے سیاسی حالات پیدا ہوئے جن کا اقتضا یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہر قسم کی انتشاری قوتوں کو دبائے اور مرکزیت کو زیادہ موثر بنائے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کی رو سے حکومت ہند کی مرکزیت مکمل کر دی گئی اور لارڈ کیننگ کو جو پہلے وائسرائے نامزد کئے گئے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے۔ لیکن شورش عظیم نے انگریزی قوم کو یہ سبق دیا کہ اہل ہند پر حکومت کرنے کے لئے ان کی رائے عامہ سے

[1] M. Mukherjee, Indian Constitutional Documents, Vol. I, p. 431.

حکومت کو واقف ہونا چاہیئے۔ ایک اجنبی قوم کی حکومت کو ضرورت اسکی تھی کہ اس کا تعلق رعایا کے ساتھ زیادہ واضح، گہرا اور پائیدار ہو ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں پھر ۱۸۵۷ء کی سی شورش نہ ہو جائے۔ دیسی والیان ملک کو یہ آسانی تھی کہ ان کی حکومت کوئی غیر ملکی حکومت نہ تھی۔ اس لئے اس کا تعلق عوام کے ساتھ قایم تھا۔ غدر سے انگریزوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان جو بیگانگی ہے اس کے باعث ان کی نیت پر بہت جلد شبہ کیا جا سکتا تھا۔ خاص کر قوانین بنانے کا کام اس نوعیت کا ہے کہ جن لوگوں کے لئے حکومت قانون بنانا چاہتی ہے ان کے منشا، اور خواہشوں کی اسے اطلاع ہونی چاہیئے۔ حکومت ہند یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل کر سکتی تھی جب کہ قوانین بنانے کے لئے غیر سرکاری عنصر کو اپنے ساتھ شریک کرے جو جمہور کی نمایندگی کر سکے۔ یہ بات اب مناسب نہیں سمجھی گئی کہ قانون بنانے کا سارا کام حسب سابق گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں سر چارلس وڈ نے ایک قانونی مسودہ پیش کیا تاکہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کے نفاذ کے بعد حکومت ہند میں جو خرابیاں رونما ہوئی تھیں انھیں دور کیا جائے اور قوانین بنانے میں رائے عامہ کے منشا کو معلوم کرنے کی تدبیر نکالی جائے۔ اس کو انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء (قانون مجالس ہند ۱۸۶۱ء) کہتے ہیں۔

قانون مجالس ہند ۱۸۶۱ء

اس قانون کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل کے معمولی ارکان کی تعداد پانچ ہو گئی جن میں سے تین ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں تاج کی ملازمت میں کم از کم دس سال سے ہوں۔ ارکان کونسل میں مختلف قلمدان (پورٹ فولیوز) تقسیم کرنے کے متعلق بھی قاعدے بنائے گئے۔ قانون بنانے کے لئے گورنر جنرل کی کونسل میں مزید بارہ ارکان کو گورنر جنرل نامزد کر سکے گا۔ ان میں سے نصف کا غیر سرکاری ہونا ضروری ہے۔ ان کی میعاد عہدہ دو سال ہو گی۔ اس مجلس وضع قانون میں سوائے قانون بنانے کے اور دوسرے انتظامی مسائل پیش نہیں کئے جا سکیں گے۔

یہ مجلس ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مروجہ قوانین میں تبدیلی ترمیم یا تنسیخ کرنے کی مجاز ہوگی اور اس کو جدید قوانین بنانے کا بھی اختیار ہوگا بشرطیکہ یہ نئے قوانین برطانیہ عظمیٰ کے دستور یا غیر تحریری آئین کے کسی طرح خلاف نہ ہوں۔ اس میں کوئی ایسی تجویز جس کا تعلق قرضہ یا مالیات عامہ اور بحری اور بری افواج سے ہو اس وقت تک پیش نہ ہو سکے گی جب تک کہ گورنر جنرل اس کے پیش کرنے کی اجازت نہ دیدے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ مجلس کی منظور کی ہوئی تجویز کو منظور کرے یا رد کردے یا ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کا اس کی نسبت منشا معلوم کرنے کی غرض سے ملتوی کردے۔ گورنر جنرل کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ضرورت کے وقت چھ مہینے کے لئے خصوصی احکام (آرڈیننس) نافذ کردے۔ یہ اختیار گورنر جنرل کو اس قانون میں خاص طور پر دیا گیا اس واسطے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے وقت اس کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ حکومت مدراس و بمبئی اپنی مقامی ضرورتوں کے مطابق قاعدے اور ضابطے بنا سکیں گی۔ اگر ان قاعدوں اور ضابطوں کا تعلق قرضۂ عامہ، زر مروجہ ٹپہ اور تار تعزیرات کی تبدیلی، مذہبی امور فوجی اور بحری مسائل یا امور خارجی سے ہوگا تو بغیر گورنر جنرل کی منظوری کے ان کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ بمبئی اور مدراس کے گورنروں کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنی کونسل میں چار سے لیکر آٹھ ارکان تک نامزد کریں جن میں سے نصف کا غیر سرکاری ہونا ضروری ہے۔ وضع قانون کی ان صوبجاتی مجالس میں مقامی حالات کے مدنظر جو قواعد و ضوابط منظور کئے جائیں گے وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتے جب تک کہ گورنر جنرل کی منظوری ان کی بابت نہ حاصل کرلی جائے۔

اگرچہ وضع قانون کی مجلس میں جو ۱۸۶۱ء کے قانون دستور کی رو سے قایم ہوئی صرف وہی قوانین منظور ہو سکتے تھے جنھیں حکومت نافذ کرنا چاہتی تھی لیکن اس مجلس کے وجود میں آنے سے اتنا ضرور ہوا کہ غیر سرکاری ارکان کا نقطۂ نظر حکومت کے سامنے پیش ہونے لگا۔ مجلس کو ملکی نظم و نسق کے متعلق[1]

[1] Keith, A Constitutional History of India, p. 174.

تجویزیں پیش کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ جو قوانین وضع قانون کی مجلس منظور کرے ان کے نافذ کرنے کا حق عدالتوں کو دیا گیا۔ غیر سرکاری ارکان کو نامزد کرنے کا حق تمام تر گورنر جنرل کو حاصل تھا جو ایسے لوگوں کو چنتا تھا جن کی وفاداری مسلم رہی ہو۔ چنانچہ پہلی مجلس میں گوالیار کے سابق وزیر سرڈنکر راؤ کو ہندوستانی نمائندے کے طور پر نامزد کیا گیا جس نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا اور نوعمر مہاراجہ کو باغیوں کے اثرات سے محفوظ رکھا تھا۔ لیکن غدر کے بعد مہاراجہ نے سرڈنکر راؤ کو وزارت سے الگ کر دیا۔ اس پر کیننگ نے اس کی قدر افزائی کے لئے اس کو کونسل کی رکنیت پر نامزد کیا[1]۔

قانون بابت ہائیکورٹس ۱۸۶۱ء

اس قانون کے منظور ہونے سے پہلے قوانین کی تدوین کا کام تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ضابطہ دیوانی ۱۸۵۹ء میں اور تعزیرات ہند ۱۸۶۰ء میں نافذ کئے جا چکے تھے۔ ضرورت اس کی تھی کہ قوانین کے نافذ کرنے میں یکسانی اور کارکردگی بڑھائی جائے۔ چنانچہ انڈین ہائی کورٹس ایکٹ کے ذریعہ اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قانون کی وجہ سے کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں ہائیکورٹ قایم کئے گئے۔ قدیم عدالت ہائے عالیہ عدالت ہائے صدر دیوانی اور عدالت فوجداری کو انھیں ہائی کورٹوں میں ملا دیا گیا۔ جدید ہائیکورٹس ایک میر مجلس (چیف جسٹس) اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ ججوں پر مشتمل ہوں گے۔ ان پندرہ ججوں میں سے لازمی طور پر ⅓ تعداد بیرسٹروں پر مشتمل ہو گی اور ⅓ اسول سروس کے ارکان ہوں گے[2]۔ ہائیکورٹ کے ہر جج کیلئے ضروری ہو گا کہ اس کو کم سے کم دس سال کا وکالت کا تجربہ حاصل ہو۔ جج ہونے سے پہلے ۵ سال تک کسی عدالتی عہدہ پر رہ چکا ہو۔ جج اپنے عہدہ پر اسوقت تک کارگزار رہیں گے جبتک کہ ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کی مرضی ہوگی۔ ہائیکورٹوں میں ماتحت عدالتوں سے

---

[1] Thurlow, The Company and the Crown. p. 242.

[2] Keith, A Constitutional History of India, p. 204,

مرافعے ہوا کریں گے۔ انھیں یہ حق ہوگا کہ ماتحت عدالتوں کی کارروائیاں ایک نہج پر رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط نافذ کریں نیز مقدموں کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں منتقل کرسکیں۔ ماتحت عدالتوں کی عام نگرانی اور ان کے تقررات وغیرہ کا انتظام بھی ہائیکورٹوں کے ذمہ ہوگا۔ ۱۸۶۶ء میں الہ آباد میں بھی ایک ہائیکورٹ قایم کر دیا گیا جس کا حلقۂ سماعت صوبۂ شمال مغربی پر پھیلا ہوا تھا۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی صوابدید پر کسی علاقہ کو جو کسی خاص حلقۂ سماعت میں شامل ہو کسی دوسرے حلقۂ سماعت میں منتقل کر دے۔[۱]

حکومت ہند کی مالی حالت

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کی وجہ سے حکومت ہند کا قرضہ بڑھ کر پچاس کروڑ کے قریب ہوگیا تھا اور فوجی خرچ کے اضافہ کی وجہ سے سالانہ اخراجات پچاس کروڑ ہو گئے تھے۔ میزانیہ میں کئی سال سے خسارہ آرہا تھا۔ حکومت ہند کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ اس خسارہ کو کس طرح سے دور کیا جائے۔ چنانچہ سر چارلس وڈ نے جو اس وقت وزیر ہند تھے انگلستان سے ایک ماہر مالیات سر جیمس ولسن کو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے منتخب کیا۔ سر جیمس ولسن ہندوستان آنے سے قبل حکومت انگلستان کے محکمۂ مالیات کے سکرٹری رہ چکے تھے اور مالی معاملوں پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ سر جیمس ولسن نے فوج کے اخراجات میں تخفیف کی اور سالانہ آمدنی پر محصول (انکم ٹیکس) لگایا۔ ہر قسم کے لائسنس جو حکومت جاری کرتی ہے ان پر بھی محصول لگایا گیا۔ نو مہینے کے بعد سر جیمس ولسن کے انتقال پر سیموئل لینگ اس کی جگہ رکن مالیات مقرر ہوئے۔ اس نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی کو جاری رکھا۔ رائج الوقت سکے میں ترمیم کی گئی۔ کاغذی نوٹ جاری کئے گئے۔ تمباکو اور نمک کے محصولوں سے آمدنی کی کمی پوری کی گئی۔ دس فیصدی محصول درآمد بھی لگایا گیا۔ غرضکہ تین سال کے عرصہ میں حکومت ہند

۱۔ Ibid., p.

کا میزانیہ متوازن ہو گیا۔

سر جیمس ولسن نے جب محصول آمدنی کا اصول جاری کیا تو مدراس کے گورنر سر چارلس ٹریولین نے اس سے اختلاف کیا اور گورنر جنرل کو اپنی رائے سے مطلع کیا کہ محصول کے اس نئے طریقے سے اندیشہ ہے کہ اہل ہند میں بے اطمینانی پیدا ہو۔ اس کی رائے میں محصول آمدنی جاری کرنے کے بجائے فوجی اخراجات میں اور زیادہ تخفیف کرنی چاہئے۔ لیکن گورنر جنرل نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ سر چارلس ٹریولین نے وہ تمام خط و کتابت جو اس ضمن میں گورنر جنرل سے ہوئی تھی انگریزی اخبارات میں شائع کر دی۔ اس بناء پر وزیر ہند نے سر چارلس ٹریولین کو جو ایک قابل اور رعایا سے دلی ہمدردی رکھنے والا عہدہ دار تھا واپس بلا لیا۔ شروع میں محصول آمدنی صرف پانچ سال کے لئے لگایا گیا تھا لیکن بعد میں بھی اس کو جاری رکھا گیا اور وہ حکومت ہند کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔

فوج کی جدید تنظیم

غدر کے بعد حکومت ہند نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا کہ آیا جو ہندوستانی فوج اس وقت موجود تھی اس کو یونہی رکھا جائے یا اس میں کمی کی جائے۔ لارڈ کیننگ کے مشورے سے جدید حالات اور اقتضاء کے مدنظر وزیر ہند نے اس اصول کی تائید کی کہ انگریزی فوج کی تعداد بڑھانا چاہئے اور دیسی فوج کی تعداد میں تخفیف کی جائے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۸ء کو فوج کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے ۷ مارچ ۱۸۵۹ء اپنی سفارشیں پیش کیں۔ اس کمیشن کی سفارشوں سے نہ صرف انگریزی فوج کی تعداد بڑھا دی گئی بلکہ اس کے ساتھ دیسی فوج کی تعداد میں بھی کافی کمی کر دی گئی۔ توپ خانہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکال کر پورے طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا سوائے ملک کے ایسے علاقوں کے جہاں کی آب و ہوا کی خرابی ایسی ہو کہ انگریز اس میں نہ رہ سکیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں مستقل طور پر رہنے والی انگریزی فوج کی تعداد ۸۰ ہزار کر دی گئی۔ ڈلہوزی کے عہد میں انگریزی فوج کی

تعداد ۵۴ ہزار تھی۔ کمیشن کی یہ بھی سفارش تھی کہ انگریزی فوج اور دیسی فوج میں ایک اور تین کی نسبت ہمیشہ رکھنی چاہئے اس واسطے کہ اگر اس نسبت میں خلل پڑا تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو خطرہ رہے گا۔ فوج کی تنظیم مختلف ذاتوں اور طبقوں کی تقسیم کو بظاہر کارکردگی بڑھانے کے لئے روا رکھا گیا لیکن اسکی اصلی وجہ یہ تھی کہ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ پھر کبھی ہندوستانی فوج برطانوی مفاد کے خلاف متحد ہو سکے۔ مختلف طبقوں کی تفریق کا اصول اب تک فوج میں قایم ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی فوج میں کسی قسم کا کوئی قومی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے گزشتہ تقریباً سو سال میں ہندوستانی فوج کو خود ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کو دبانے اور اپنے بیرونی شہنشاہی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے موثر طور پر استعمال کیا۔ آج بھی ہندوستانی فوج برطانوی شہنشاہیت کی توسیع و استحکام کا ایک زبردست آلۂ کار ہے۔

انگریزوں کی آبادکاری

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بڑی تعداد میں انگریز ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہوں۔ چنانچہ مستقل طور پر ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے والے انگریزوں کو مختلف قسم کے اجازت نامے حاصل کرنے پڑتے تھے۔ اس ضمن میں اس قدر احتیاط برتی جاتی تھی کہ خود بخود انگریزوں کی آبادکاری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن غدر نے حکومت ہند کی آنکھیں بہت سے معاملوں کے متعلق کھول دیں۔ اب یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت رکھنے والے انگریزوں کی تعداد جتنی بھی زیادہ ہوگی اتنا ہی اچھا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں صرف بنگال میں نیل کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے انگریز آباد کئے گئے تھے جن کا سلوک مقامی کاشتکاروں کے ساتھ بہت برا تھا۔ دیسی مہاجنوں اور زمینداروں نے بھی کاشتکاروں پر کبھی اتنے مظالم نہیں ڈھائے تھے جتنے ان لوگوں نے ڈھائے۔ یہ لوگ مقامی کاشتکاروں سے معاہدے کر لیتے تھے اور اس کے بعد غریب کاشتکار کی حالت عمر بھر کے لئے غلاموں سے بھی بدتر ہو جاتی تھی چنانچہ پلانٹرز

کے خلاف کاشتکاروں کے بلوے برابر ہوتے رہتے تھے۔ جب پلانٹرز اور دیسی کاشتکاروں کے جھگڑے بہت بڑھ گئے تو حکومت ہند نے ۱۸۶۰ء میں ان تمام معاملوں کی چھان بین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے اپنی رپورٹ میں تمام برائیوں کی طرف حکومت کو متوجہ کیا جو عرصے سے چلی آرہی تھیں اور جو برطانوی نظم و نسق پر سیاہ دھبوں کے مثل تھیں۔ خود بنگال کے لفٹننٹ گورنر سرجے۔ پی گرانٹ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پلانٹرز کی زیادتیوں کا بہت جلد تدارک ہونا چاہئے اس لئے کہ نیل کی کاشت کا مسئلہ اب محض ایک تجارتی یا زرعی مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک خالص سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ چنانچہ حکومت بنگال نے پلانٹرز اور کاشتکاروں اور مزدوروں کے تعلقات کو بہتر اصول پر معین کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کیں لیکن ان کا اثر محض عارضی رہا۔

کیننگ کے عہد حکومت میں آسام اور نیلگری کے پہاڑی علاقوں میں چاء اور قہوہ کی کاشت کے لیے انگریز خاندانوں کو خاص رعایتیں دیکر آباد کیا گیا۔ افتادہ زمینوں کے قاعدوں کے تحت (ویسٹ لینڈ رولز) ایک شخص کو تین ہزار ایکڑ زمین بطور معافی مل سکتی تھی۔ جب زمین دی جاتی تھی تو برائے نام اس کے معاوضے میں رقم لی جاتی تھی۔ بعد میں اس زمین پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا تھا۔ یہ رعایت انگریزوں کے لئے خاص کردی گئی تھی۔ چاء اور قہوہ کی تجارت سے انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی کاشت اور تجارت بالکل انھیں کے ہاتھ میں رہی۔

لارڈ کیننگ اور دیسی ریاستیں

لارڈ کیننگ کو اسی بات کا پوری طرح سے احساس تھا کہ دیسی ریاستوں کا وجود خود برطانوی ہند کے تحفظ و بقا کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر کبھی ہندوستان پر باہر سے حملے کی نوبت آئے یا انگلستان کی خارجی حکمت عملی کی وجہ سے جو اس کے مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہو یہ صورت پیدا ہو کہ اس کی مشرقی سلطنت خطرہ میں پڑ جائے تو اس وقت

ان دیسی ریاستوں سے ہمیں بڑا سہارا ملے گا۔ لیکن اپنا معاون بنانے کیلئے ضرورت اس کی ہے کہ ہم ان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کریں اور انھیں یقین دلا دیں کہ انھیں ہماری طرف سے چاہے کتنے شبہات کیوں نہ ہوں لیکن ان کی آزادی برقرار رہے گی اور ہم ایسے موقعوں کے منتظر نہیں ہیں کہ ان کے علاقوں پر برطانوی عملداری قایم کریں۔[1]

غدر کے فرو ہو جانے کے بعد ۱۸۶۰ء میں ہندوستان کے ایک سو چالیس بڑے بڑے والیان ملک کو حکومت ہند نے سندیں عطا کیں جن میں ان کے قدیم حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ اور بڑی ریاستوں کی طرح حیدرآباد کے حکمران نواب افضل الدولہ بہادر کو بھی سند بھیجی گئی جس میں اس امر کی صراحت کر دی گئی تھی کہ ریزیڈنت حیدرآباد کو اختیار ہوگا کہ وہ ان جرموں کی نسبت تحقیقات کرے جو اہل یورپ اور ان ہندوستانیوں سے جو برطانوی رعایا ہوں حدود ریاست حیدرآباد میں سرزد ہوں۔ ریزیڈنٹ مجاز ہوگا کہ اپنے اس اختیار کو کسی دوسرے کو منتقل کردے۔ اگر برطانوی رعایا کے کسی فرد اور سرکار نظام کے کسی فرد میں جھگڑا ہو تو ریزیڈنٹ اسکے متعلق تحقیقات کرے گا اور ملزم کو سزا دے گا۔ اس قسم کے مقدموں میں ریاست کی عدالتوں کو حق سماعت حاصل نہ ہوگا۔

لارڈ کیننگ کی سفارش پر نواب افضل الدولہ کو ان کی دوستی کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ نے جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا جسے قبول کرنے میں انھیں پس و پیش تھا اس لئے کہ اب تک دکن کے کسی حکمران نے برطانوی حکومت کا کوئی خطاب قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن رزیڈنٹ نے نواب افضل الدولہ بہادر کو یقین دلایا کہ خطاب دینے کا مقصد سیاسی نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے خطاب قبول کرلیا۔[2]

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 70.

[2] Fraser, Our Faithful Ally, The Nizam, p. 315.

۱۸۶۰ء میں حکومت ہند نے جو سندیں مختلف والیان ریاست کو عطا کیں اور جن کی حیثیت اقرار ناموں کی تھی ان کا مقصد اس وقت یہ سمجھا گیا کہ انگریزی حکومت اپنے آئندہ کے منشا اور ارادوں کو واضح کرنا چاہتی ہے جن کی جانب ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں اشارے موجود تھے لیکن کچھ عرصے بعد حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ (پولٹیکل ڈپارٹمنٹ) نے ان کی یہ توجیہ پیش کی کہ چونکہ سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد برطانوی حکومت بہ حیثیت بالادست قوت کے اس کی جانشین ہوگئی ہے اس لئے اب اس کا یہ منصب ہے کہ والیان ریاست کے اختیارات کی تصدیق کرے۔ اس ضمن میں مختلف ریاستوں کے مرتبوں کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ حالانکہ بعض ان میں ایسی تھیں جن کی حیثیت معاہدوں کے ذریعہ حلیف کی سی تھی اور بعض دوسری ایسی تھیں جو برطانوی حکومت کی بنائی ہوئی یا باجگزار تھیں۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کمپنی کی حکومت نے مختلف ریاستوں میں باہم فرق و مراتب کا پورا لحاظ رکھا تھا۔ اگرچہ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد حکومت سے یہ بات تو مانی جا چکی تھی کہ برطانوی حکومت نے ملک میں بالادست قوت کی حیثیت اختیار کرلی ہے لیکن باوجود اس کے کمپنی کی حکومت نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ تمام ریاستوں کے لئے یکساں لائحہ عمل تجویز کرے۔ ہر ریاست کے ساتھ سیاسی تعلقات کی نوعیت کو معین کرنے والی چیز معاہدہ کی شرطیں ہوتی تھیں جو برطانوی حکومت اور متعلقہ ریاست کے درمیان طے ہوئی ہوں۔ غدر کے بعد ریاستوں کو جاگیروں کے مثل تصور کیا گیا اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کی کوشش کی گئی جو معاہدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ کیننگ نے صاف طور پر ایک دفعہ اس کی صراحت کردی کہ برطانوی حکومت نے اگرچہ وعدہ کیا ہے کہ وہ دیسی ریاستوں کو آئندہ ملحق نہیں کرے گی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں یہ حق حاصل نہیں رہا کہ معاہدوں کی علانیہ خلاف ورزی یا غیر وفاداری کی صورت میں ہم والئ ملک کو سزا نہ دیں یا اسکی ریاست کو ضبط نہ کریں۔[1]

[1] Lee Warner, The Native States of India, P. 164, 165.

اس کے علاوہ کیننگ نے ریاستوں کے حقیقی مرتبہ اور مقام کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ وہ ہمارے جاگیرداروں (فیوڈیٹریز) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہم نے بہت عرصے تک اپنے اقتدار کو سلطنت مغلیہ کے نائب کی حیثیت سے استعمال کیا لیکن اب سلطنت مغلیہ کے آخری دھندلے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔ آج تاج برطانیہ کی حکمرانی اور بالادستی کسی شک وشبہہ کے بغیر مانی جا چکی ہے۔ اب تاج برطانیہ کو براہ راست اپنے جاگیرداروں (فیوڈیٹریز) کے معاملے طے کرنے ہیں۔ انگلستان کا اقتدار اس ملک میں اب ایسی حقیقت ہے جس کو والیان ملک خوشی سے تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس اقتدار کی نوعیت آج ایسی ہے جیسی پہلے کبھی نہیں تھی۔"[1]

واقعہ یہ ہے کہ والیان ریاست کو جاگیر دار قرار دینا اس ملک کی تاریخ اور روایتوں سے انکار کرنا ہے۔ لیکن اس دعوے سے برطانوی حکومت کے اس نقطۂ نظر کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے جو غدر کے بعد اس نے ریاستوں کے متعلق اختیار کیا۔ ریاستوں کی حیثیت اب شہنشاہی نظام میں محض معاون اجزاء کی رہ گئی اور ان کے متعلق تاج برطانیہ نے اپنی ذمہ داری اسی طرح واضح کر دی جس طرح ان علاقوں کی نسبت کی تھی جو براہ راست اس کی عملداری میں تھے۔ اب معاہدوں سے زیادہ اہمیت رواج کو دی جانے لگی جو آہستہ آہستہ حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ اور دیسی ریاستوں کے تعلقات کے تعین کے لئے وجود میں آرہا تھا اور جس کی ابتداء لارڈ کیننگ کے عہد حکومت سے ہوئی[2]
یہ بات فرض کر لی گئی کہ تاج برطانیہ جس طرح سے کسی معمولی سی باجگزار ریاست سے جواب طلب کرنے کا مجاز ہے اسی طرح بڑی سے بڑی

---

[1] Lee Warner, The Natives States of India, p. 100.

[2] (See also Varadarajan. The Indian States and the Federation, p. 2).

ریاست سے جواب طلب کرسکتا ہے جس کی آزاد اور حلیفانہ حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت برابر تسلیم کرتی رہی تھی۔ ان حالات میں بعد میں آہستہ آہستہ مختلف ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرکے معاشی اور مالی حقوق حکومت ہند نے حاصل کرلئے جو اس کو معاہدوں کی رو سے حاصل نہیں تھے۔

کیننگ کا جانشین

لیڈی کیننگ کے انتقال اور چھ سال کی سخت تشویش نے کیننگ کی صحت پر بڑا اثر ڈالا۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوکر انگلستان چلا گیا اور وہاں پہنچ کر صرف تین مہینے زندہ رہا۔ اس کو اپنے عہد حکومت میں جن نازک حالات اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ویسا کسی دوسرے گورنر جنرل کو نہیں ہونا پڑا تھا۔ کیننگ میں مستقل مزاجی کی صفت موجود تھی جس کے باعث وہ مصیبت کے وقت میں بھی اپنا دماغی توازن قایم رکھ سکا۔ اس نے بڑے صبر اور محنت سے ملکی نظم ونسق کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگرچہ بعض قدامت پسند انگریز اس کے اصلاحی اور روادارانہ مسلک کو برا بتاتے تھے لیکن اس نے جو کچھ کیا وہ انگریزی قوم اور ہندوستان دونوں کی بھلائی کے مدنظر کیا۔ لارڈ ایلجن کو اسکا جانشین مقرر کیا گیا لیکن اپنے عہدہ کا جائزہ لئے ہوئے اس کو ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ دھرم سالہ میں دل کی حرکت بند ہوجانے سے اسکا انتقال ہوگیا۔ اس کے مختصر عہد حکومت میں بس یہی ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کے خلاف مہم امبیلا بھیجی گئی۔ پٹھانوں نے انگریزی فوج کو بہت کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن بعد میں انگریزی فوج نے صورت حالات پر قابو پالیا۔

سر جان لارنس
سنہ ۱۸۶۴ تا سنہ ۱۸۶۹ء

چونکہ سرحد کی شورش بڑھ رہی تھی اس لئے ہندوستان کی گورنر جنرلی ایک ایسے شخص کو سپرد کرنے کا تصفیہ کیا گیا جو ملک کے حالات سے باخبر ہو اور سرحدی معاملوں کا بھی تجربہ رکھتا ہو۔ اس وقت سر جان لارنس وزیر ہند کی کونسل کی رکنیت پر ممتاز

تھا۔ اگرچہ سر جارج بارلو کے وقت سے یہ طریقہ قائم ہو گیا تھا کہ کسی سیولین کو گورنر جنرل نہ بنایا جائے لیکن سر جان لارنس کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا تاکہ اس کے وسیع تجربہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ پنجاب میں چیف کمشنری کے عہدہ پر رہ چکا تھا اور غدر کے زمانے میں اس نے انگریزی قوم کی بڑی زبردست خدمتیں انجام دی تھیں۔ اس کی قابلیت اور معاملہ فہمی کی بدولت پنجاب کا پورا علاقہ غدر میں نہ صرف انگریزی حکومت کے ساتھ وفادار رہا بلکہ اس کے ساتھ وہاں کے باشندوں نے اور خاص طور پر سکھوں نے انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر غدر کو دبانے میں بڑی مدد کی۔ سر جان لارنس کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا تھا جنھوں نے غدر کے پر آشوب زمانے میں انگریزی قوم کے مفادوں کو ہندوستان میں تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔

سر جان لارنس کے عہد حکومت میں اصلاحات اور کفایت شعاری کے اصول پر عمل کیا گیا۔ اس کو کسانوں کی فلاح و بہبود کی فکر تھی۔ چنانچہ اس نے ان کی حالت سدھارنے کی طرف خاص توجہ کی۔ اس ضمن میں اس نے وہ ضابطہ جاری کیا جس کی وجہ سے پنجاب اور اودھ کے کاشتکاروں کو زمینداروں کی دراز دستیوں سے محفوظ کر لیا گیا اور انھیں موروثی کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس کے ساتھ اودھ کے تعلقداروں کی اس حیثیت اور منصب کا بھی اس ضابطہ میں خاص طور پر خیال رکھا گیا جو لارڈ کیننگ کی حکومت کے زمانے میں انھیں حاصل ہوا تھا۔

۱۸۶۵ء میں اڑیسہ میں سخت قحط پڑا جو ایک سال تک رہا۔ قحط کے ساتھ سیلاب کی مصیبت سے بھی رعایا کو دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے دس لاکھ سے زائد جانیں ضائع ہو گئیں اور فصلوں کی بربادی سے بہت نقصان ہوا۔ حکومت بنگال نے بڑی بے پروائی سے کام لیا۔ برخلاف اس کے حکومت مدراس نے شمالی سرکاروں کے متاثرہ علاقوں میں بہت اچھا انتظام کیا۔ حکومت بنگال نے بجائے اس کے کہ خود کوئی اقدام کرتی رعایا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت بنگال نے حکومت ہند کو باور کرایا کہ

حالات قابل اطمینان ہیں[1]۔ اس قسم کے حالات ہیں حکومت کی جانب سے عدم مداخلت کی پالیسی اس وقت حق بجانب کہی جاسکتی ہے جب کہ ملک میں آمد و رفت کے ذریعے مکمل حالت میں موجود ہوں اور غلہ کے ذخیرے ملنے میں تاجروں کو دشواری نہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو طلب اور رسد کے معاشی قانون پر بھروسہ کرنا بڑی نافہمی ہوگی۔ سر جان لارنس نے لوگوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے بڑی مستعدی اور قابلیت سے کام لیا لیکن حکومت بنگال کی بے پروائی اور بدانتظامی کی وجہ سے جتنی مدد لوگوں کو پہنچنی چاہیے تھی اتنی نہ پہنچ سکی۔ لارنس کی مداخلت پر غریب لوگوں کو غلہ مفت تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا لیکن اس ہیں بہت تاخیر ہو چکی تھی اور جتنا نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا تھا۔ گورنر جنرل کے ایما پر سر جارج کیمپ بل کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ قحط کی روک تھام کے مسئلہ پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی سفارشوں کے بموجب حکومت نے ایک سرمایۂ محفوظ قحط زدہ علاقوں کی امداد کے لئے خاص کر دیا۔

تجارت و صنعت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خانہ جنگی کی وجہ سے جو روئی وہاں سے انگلستان بھیجی جایا کرتی تھی وہ بند ہوگئی۔ چنانچہ مانچسٹر کے کارخانوں کو چالو رکھنے کے لئے ہندوستان کی روئی کی مانگ بڑھ گئی۔ کچھ دنوں ہندوستان کی روئی کی خوب گرم بازاری رہی۔ نکاسی کی مقدار سو فی صدی تک ہو گئی۔ چونکہ نکاسی کی مقدار زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس قیمت کا مال معاوضہ ہیں انگلستان سے نہیں دیا جاسکتا تھا اس لئے روئی کی قیمت زر نقد کی صورت ہیں ادا ہونے لگی۔ ہندوستان کے ان علاقوں کے کاشتکاروں کو جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی خوب فائدہ ہوا۔ اسی دوران میں بمبئی ہیں نئے کارخانے قائم ہو گئے۔ جب مانچسٹر سے ہندوستانی روئی کی مانگ کم ہو گئی تو اس کی کھپت دیسی کارخانوں میں ہونے لگی اور ہندوستان کی ایک اہم صنعت کو ترقی کا موقع ملا۔ لیکن بمبئی کے تاجروں کی عام آسودگی کے باعث بمبئی بنک نے بے سوچے

[1] Cambridge History of India, Vol. VI. p. 299.

سمجھے ناقابل عمل تجارتی منصوبوں میں روپیہ لگا دیا جس کی وجہ سے دیوالیہ ہو جانا پڑا۔ ہندوستانی تاجروں نے غالباً بین الاقوامی تجارتی جالات سے پہلی مرتبہ روئی کی تجارت میں زبردست نفع کمایا اور وہ صحیح توازن نہ قایم رکھ سکے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں قایم ہوگئیں لیکن کوئی باقاعدہ تجارتی قانون نہ ہونے سے تھوڑے تھوڑے دنوں بعد وہ ختم ہوگئیں۔ سٹہ بازی کی وجہ سے بھی بہت سے تاجروں کا سرمایہ ڈوب گیا۔

میسور کے معاملات

سر تھامس منرو گورنر مدراس کے مشورے کے بموجب لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں میسور کی ریاست کا انتظام انگریزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس انتظام کو اس لئے حق بجانب بتایا گیا کہ وہاں انتہا درجہ کی بدانتظامی تھی۔ لیکن خود بنٹنگ کو اس کا احساس تھا کہ راجا میسور کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے چنانچہ ۱۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ء کو اس نے جو مراسلہ مجلس نظماء کی خفیہ کمیٹی کو لکھا اس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ صورت زیادہ مناسب ہوتی اگر ہم پہلے راجا کو آگاہ کرتے اور اگر اس کا اچھا نتیجہ نہ نکلتا تو میسور کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینے کا انتہائی طریق کار اختیار کیا جاتا[1]۔ لیکن بنٹنگ کو منرو نے جو مشورہ دیا اس پر وہ عمل کرنے پر مجبور ہوگیا۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت تک راجا برابر حکومت ہند سے خط و کتابت کرتا رہا کہ اس کی ریاست اس کو واپس کر دی جائے لیکن کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹالا گیا۔ ڈلہوزی نے اپنی الحاقی پالیسی کا وار میسور پر بھی کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۸۵۶ء کو اس نے اپنے ایک مراسلہ میں اس کی وضاحت کر دی کہ چونکہ موجودہ راجا میسور لاولد ہے اس لئے اس کی موت پر یہ ریاست سلطنت برطانیہ میں شامل کر لینی چاہئے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ اس معاہدے میں جو ولزلی کے عہد میں ہوا اس امر کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے کہ راجا کے بعد اس کی اولاد ریاست کی وارث قرار پائے گی اس لئے

[1] Major Evans Bell, The Mysore Reversion, p. 22.

قانونی حیثیت سے انگریزی حکومت کو اس کا وارث ہونا چاہئے۔[1] لیکن راجا چونکہ غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے ساتھ وفادار رہا اور والیان ریاست کے ساتھ بالادست قوت کی پالیسی میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی اس لئے راجا کو امید تھی کہ کیننگ کے عہد حکومت میں ریاست اس کو واپس کردی جائے گی۔ لیکن ریاست اس کو واپس کرنے کے بجائے وزیر ہند کی رائے کے بموجب میسور کے انتظام کی نگرانی حکومت مدراس کے سپرد کردی گئی جسے راجا نے اپنی ذلت سمجھا اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس پر وزیر ہند نے یہ طے کیا کہ میسور کا انتظام یونہی حکومت ہند کی نگرانی میں رہے۔ راجا نے جب لارڈ کیننگ سے اپنی ریاست کی واپسی کا مطالبہ کیا تو لارڈ موصوف نے اس کا صاف طور پر نفی میں جواب دے دیا۔

راجا نے سر جان لارنس کے عہد حکومت میں سنہ ۱۸۶۵ء میں ایک بچہ کو اپنا متبنیٰ کرلیا اور گورنر جنرل کو اس کے متعلق مطلع کردیا۔ اس پر حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ نے کمشنر مقیم میسور کو لکھا کہ ”راجا کو اپنی ذاتی ملکیت کی حد تک پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا متبنیٰ مقرر کرے لیکن ہز ہائی نس کو صاف طور پر جتا دینا ضروری ہے کہ اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ میسور کی گدی کے لئے کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے اور یہ اختیار اس کو اب دیا بھی نہیں جاسکتا ہے۔“[2]

راجا نے اپنا اصرار جاری رکھا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اگر اس کے مرنے پر باوجود ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے ریاست میسور ملحق کرلی گئی تو نہ صرف یہ کہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ انگریزی حکومت قانوناً ایسا کرنے کی مجاز نہیں اس واسطے کہ سرکار نظام بھی اس قسم کا دعویٰ پیش کرسکتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کے ملک کی تسخیر میں انگریزی

---

[1] Ibid., p. 4.

[2] Ibid., p. 84.

فوجوں کے ساتھ سرکار نظام کی فوجیں بھی شریک تھیں اور معاہدہ کے بعد جو ملک کی تقسیم عمل میں آئی اس میں بھی انگریزی حکومت اور سرکار نظام معاہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن سرجان لارنس نے راجا کے ان دعووں کو ماننے سے انکار کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میسور کی تسخیر کے بعد وہاں کا اقتدار اعلیٰ برطانوی حکومت کو حاصل ہو گیا جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ جب میسور کا معاملہ وزیر ہند سرچارلس وڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے وائسرائے اور اس کی کونسل کی رائے سے اختلاف کیا اور راجا میسور کے متبنیٰ لڑکے کو اس کا جانشین اور آئندہ ریاست کا مالک تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس کے بلوغ کو پہنچنے کے بعد ۱۸۸۱ء میں لارڈ رپن کے عہد میں اس کو حکومت کے اختیارات سپرد کرد ئیے گئے اور ریاست اس کو واپس کر دی گئی۔

بھوٹان کی لڑائی

بھوٹان کے باشندے ہمالیہ کے جنوبی ڈھالوں پر جنگل سے پٹے ہوئے پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے کچھ عرصے سے انھوں نے یہ شروع کیا تھا کہ انگریزی علاقوں پر حملے کرتے اور لوٹ مار کر کے اپنے پہاڑوں میں واپس چلے جاتے تھے۔ لارڈ الجن نے مصالحت کے لئے ایشلے ایڈن کو ایلچی کے طور پر بھوٹان بھیجا تاکہ بات چیت کے ذریعے معاملے طے ہو جائیں۔ بھوٹان کی حکومت نے زبردستی اس سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے جس کی شرطوں کی رو سے انگریزی حکومت بھوٹانیوں کے دعوے کو ان انگریزی علاقوں پر تسلیم کرنے کو تیار تھی جو بھوٹان کی سرحد سے ملے ہوئے تھے اور جہاں اکثر بھوٹان والے لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ جب سرجان لارنس نے گورنر جنرلی کا جائزہ لیا تو حکومت بنگال بھوٹان کے جھگڑے میں الجھی ہوئی تھی۔ سرجان لارنس اگرچہ امن پسند تھا لیکن وہ مجبور ہو گیا کہ بھوٹانیوں کے خلاف جنگ کرے۔ یہاں کے پہاڑی علاقے کی آب و ہوا خراب تھی جس کی وجہ سے انگریزی فوج کے بہت سے آدمی مر گئے لیکن جنگ میں بھوٹانیوں کو شکست ہوئی اور انھوں نے جو معاہدہ کیا اس کی رو سے دوار کا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔ انگریزی حکومت نے ۲۵ ہزار روپیے سالانہ

بطور زر امدادی دینا منظور کیا تاکہ بھوٹان کی حکومت کا خرچ چلنے میں آسانی ہو۔ بھوٹان کے لوگ نیپال والوں کی طرح مضبوط اور بہادر ہوتے ہیں اور انگریزی فوجوں میں ملازمت کرتے ہیں۔

خارجی پالیسی ۱۸۶۳ء میں افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ تخت و تاج کے لئے اس کے بیٹوں میں جھگڑا شروع ہو جانے سے سارے ملک کا انتظام درہم و برہم ہو گیا۔ امیر دوست محمد خاں نے اپنے بیٹے شیر علی کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا اس کے تخت نشین ہونے کے بعد بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے بھائیوں میں افضل خاں، عظیم خاں اور امین خاں نے اپنی اپنی پارٹیاں قایم کرلیں اور ہر ایک نے بعض فوجی سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر تخت و تاج کے لئے کوشش شروع کر دی۔ افضل خاں نے کچھ عرصے کے لئے شیر علی کو تخت سے بے دخل کر دیا۔ لیکن شیر علی نے پھر کابل پر قبضہ کر لیا۔ کئی سال تک یوں ہی ہوتا رہا۔ آخر شیر علی نے زیادہ قوت حاصل کرلی اور اپنے حریفوں کو زیر کر لیا۔ ان میں سے ہر ایک نے سرجان لارنس سے امداد طلب کی تھی لیکن سر جان لارنس افغانستان کی اندرونی سیاست میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ بھیڑوں کے اس چھتے کو چھیڑنے میں نقصان اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے جانشینی کے جھگڑوں میں اپنی غیر جانبداری کو قایم رکھا۔ جب شیر علی کی حیثیت مسلم ہوگئی تو حکومت ہند نے اس کو بے تامل امیر افغانستان تسلیم کر لیا۔ بعض مورخوں نے سر جان لارنس کی افغانی حکمت عملی کو "عدم مداخلت کے شاہکار" سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کا تخت و تاج حاصل کرنے میں جو بھی کامیاب ہوگا اسی کو حکومت ہند وہاں کا حکمران مان لے گی۔ سر جان لارنس نے امیر شیر علی کے ساتھ اچھے تعلقات قایم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ روس کی طرف زیادہ مائل نہ ہو جس کی سرحد ترکستان میں بخارا اور خیوا تک پہنچ چکی تھی۔

اس زمانے میں بعض انگریز ماہرین سیاست کی یہ رائے تھی کہ ممکن ہے کہ روس افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملہ کر دے اس لئے برطانوی حکومت کو چاہئے کہ قبائلی علاقے پر قبضہ کر کے وہاں اپنے فوجی مرکز قایم کرے۔ اگر ضرورت ہو تو افغانستان کے بعض حصوں پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ ہندوستان کی قدرتی سرحد دریائے انڈس ہے۔ اگر حکومت ہند اس قدرتی سرحد سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کرے گی تو ٹھوکر کھائے گی اور بیٹھے بٹھائے پریشانیوں میں اپنے آپکو مبتلا کرے گی۔ اقدامی حکمت عملی کا سب سے بڑا حامی سر ہنری رالنس تھا جو وزیر ہند کی کونسل کا رکن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت ہند فوراً کوئٹہ پر قبضہ کر لے تاکہ درہ بولان پر اس کا قبضہ اور تصرف مان لیا جائے اور امیر افغانستان کو زر امداد دیا جائے تاکہ وہ روسیوں کے پھندے میں نہ پھنس جائے۔ لیکن سر جان لارنس اپنی عدم مداخلت کی حکمت عملی پر ایسی سختی سے پابند تھا کہ اس نے کسی دوسرے کی رائے کی زیادہ پروا نہیں کی۔ اس نے اقدامی حکمت عملی کے حامیوں کو بتا دیا کہ اگر کبھی روس ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے تو ہماری حفاظت کا بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ ہم افغانستان میں نہ پھنسے ہوئے ہوں بلکہ ہماری فوجیں خود ہمارے علاقوں میں تیار رہیں۔ اور سب سے بڑھ کر حفاظت کا ذریعہ یہ ہوگا کہ اہل ہند ہماری حکومت سے مطمئن ہوں اور ہماری ایمان داری اور نیک نیتی کا انھیں پوری طرح یقین ہو۔[1] سر جان لارنس کی عدم مداخلت کی حکمت عملی کو بعد میں لارڈ لٹن نے بدلنے کی کوشش کی لیکن اس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں جن کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ وسط ایشیا کے واقعات اس تیزی سے وقوع پذیر ہو رہے تھے کہ حکومت ہند بالکل غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے عرصے تک خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی تدبیر یہ تھی کہ سیاست کاری کے اصول کے مطابق حکومت افغانستان سے دوستانہ تعلقات

---

[1] Lord Lawrence, by Sir Charles Aitchison, p. 194.

بڑھائے جائیں تاکہ وہ روسیوں کے اثر سے باہر رہے نہ یہ کہ افغانستان میں فوجی اقدام کی کوشش کی جاتی۔ اس ضمن میں لارڈ لٹن نے جو غلط رائے قائم کی اسکا خمیازہ حکومت ہند کو بھگتنا پڑا۔

سر جان لارنس کی حکومت کو ہم کامیاب حکومت نہیں کہہ سکتے۔ اس کو اگرچہ ہندوستان کے نظم ونسق کا وسیع تجربہ تھا لیکن وہ بجائے اپنے ماتحتوں کی رہبری کرنے کے خود ان کی رائے پر چلتا تھا۔ اُڑیسہ کے قحط کی ذمہ داری اگرچہ بڑی حد تک حکومت بنگال پر عاید ہوتی ہے لیکن خود گورنر جنرل بھی اس سے بری الذمہ نہیں کہا جا سکتا۔ سر جان لارنس روزمرہ کے نظم ونسق کے کاموں اور بندھے ٹکے فرائض کو اچھی طرح سے انجام دیتا تھا لیکن اس میں نئے حالات کے لئے نئے حل تلاش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس میں تخیل کی بڑی کمی تھی جو حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار میں ہونا ضروری ہے۔ انگلستان سے واپسی پر سر جان لارنس کو اس کی خدمتوں کے صلہ میں لارڈ کا خطاب اور ایوان بالا کی رکنیت سے سرفراز کیا گیا۔

لارڈ میئو
سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۸۷۲ء

انگلستان کی قدامت پسند حکومت نے اپنی حکومت کے ایک رکن لارڈ میئو کو جو ائرلینڈ کا چیف سکرٹری تین مرتبہ رہ چکا تھا سر جان لارنس کا جانشین مقرر کیا۔

لارڈ میئو نے ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے امیر افغانستان سے تعلقات استوار کرنے کی جانب توجہ کی۔ سر جان لارنس نے افغانستان کے متعلق جو عدم مداخلت کی حکمت عملی اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر شیر علی نے روسی حکومت سے تعلقات بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ لارڈ میئو نے محسوس کیا کہ اگر حکومت ہند نے افغانستان کے معاملات کی طرف اسی طرح بے توجہی کی جیسی کہ پچھلے چند سال میں کی تھی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ افغانستان پوری طرح روس کے حلقۂ اثر میں آجائے گا۔ چنانچہ لارڈ میئو نے امیر شیر علی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء میں انبالہ کے مقام پر لارڈ میئو نے امیر شیر علی کا بڑے شان وشوکت کے ساتھ

خیر مقدم کیا۔ وائسرائے اور امیر صاحب میں سیاسی معاملات پر گفت وشنید ہوئی اگرچہ ہوم گورنمنٹ نے لارڈ میئو کو مستقل معاہدہ کرنے کا مجاز نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی اس نے بڑی قابلیت سے امیر صاحب کو روس کے اثر سے نکال لینے کی پوری کوشش کی۔ حکومت ہند نے امیر شیر علی کی فرمان روائی کو تسلیم کیا اور بارہ لاکھ روپیے سالانہ بطور زر امدادی کے دینا قبول کیا۔ اس کے علاوہ حربی آلات کی معقول تعداد مقرر کی گئی جو حکومت ہند حکومت افغانستان کو سالانہ بھیجا کرے گی تاکہ وہ اپنی مدافعت کا اچھا انتظام کرسکے۔ اس ملاقات سے برطانوی حکومت اور افغانستان کی حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔[1]

لارڈ میئو نے امیر شیر علی سے معاملوں کی یکسوئی کے بعد حکومت ہند کی جانب سے سر ڈگلس فورسنھ کی صدارت میں ایک وفد سینٹ پیٹرسبرگ روانہ کیا تاکہ افغانستان کے متعلق روسی حکومت کو حکومت ہند کے نقطہ نظر سے واقف کرائے۔ روسی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ دریائے جیحوں (Oxus) افغانستان کی شمالی سرحد پر خط فاصل تصور کرے گی اور اس کا پورا احترام کرے گی۔ اس سے اس قسم کا وعدہ لے لینا لارڈ میئو کی خارجی حکمت عملی کی زبردست کامیابی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ یورپین سیاست میں بعد میں دوسری پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے روس کے وعدوں کی زیادہ اہمیت نہیں رہی اور وسط ایشیاء کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہ نکل سکا۔

مالیاتی اصلاح

سر جان لارنس کے عہد سے حکومت ہند نے مفاد عامہ کے کاموں پر کافی رقم خرچ کرنا شروع کر دی تھی لیکن آمدن اور خرچ کا توازن جیسا ہونا چاہیئے ویسا نہ تھا۔ لارڈ میئو نے جب گورنر جنرلی کا جائزہ لیا تو حکومت ہند کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ اس نے سر رچرڈ ٹمپل اور رچرڈ اسٹریچی جیسے تجربہ کار ماہران مالیات کی تجویزوں کے بموجب محصول

[1] Hunter, Life of Lord Mayo. p. 125-128.

آمدنی اور محصول نمک میں اضافہ کرکے بجٹ کو متوازن کر دیا۔ تعمیرات کے محکمہ کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ اس لئے کہ حکومت کو بہت بڑی رقم اس محکمہ کے کاموں کی توسیع پر خرچ کرنی پڑتی تھی۔

لیکن لارڈ میئو کا سب سے اہم کارنامہ صوبجاتی مالیات کی تنظیم ہے۔ قانون مجالس ہند ۱۸۶۱ء نے اگرچہ پریسی ڈنسیوں کی حکومت کو مقامی حالات کے مدنظر قوانین بنانے کا اختیار دے دیا تھا لیکن اب تک پورے ملک کی مالیات مرکزی حکومت ہی سے متعلق تھی۔ چنانچہ کل برطانوی ہند کی آمدنی ایک جگہ جمع ہوتی تھی جس کی منظوری ہندوستان کے مختلف حصوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل دیتا تھا۔ یہ انتظام ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے موزوں نہ تھا جہاں ہر صوبے کے حالات اور ضروریات الگ الگ ہیں۔ صوبجاتی حکومتوں کو محصول لگانے یا قرض لینے کی اجازت نہ تھی۔ وہ صرف مقامی محصول (لوکل سس) وصول کرسکتی تھیں جو سڑکوں کی تعمیر اور ابتدائی مدرسوں کے اخراجات کے واسطے لئے جاتے تھے۔ معمولی اخراجات کے لئے انھیں مرکزی حکومت کی منظوری لینی ہوتی تھی۔ پھر ہر صوبے کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مرکزی حکومت سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے۔ اگر کوئی صوبہ اپنے اخراجات میں کمی اور کفایت کرتا تو اس کو اس سے فائدہ نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ بعض صوبوں کی کفایت سے مرکزی حکومت کے پاس جو رقم بچتی تھی وہ دوسرے اپنے کام میں لاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صوبہ فضول خرچی کی طرف مائل تھا۔ اور مرکزی حکومت کے سامنے اپنے مطالبے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔ اپنے مقامی آمدنی کے ذریعوں کو ترقی دینے کی طرف سے صوبے غفلت برت رہے تھے۔ لارڈ میئو کی حکومت نے ۱۸۷۰ء میں ایک تجویز منظور کی جس کی بدولت صوبجاتی حکومتوں کو بعض مالیاتی حقوق حاصل ہوگئے اور بعض محکموں کے انتظام کے لئے مرکزی حکومت سے مستقل امداد مقرر ہوگئی اگر کسی صوبے کی آمدنی اور خرچ متوازن نہ ہوں تو ایسی حالت میں صوبجاتی حکومت

یا تو مقامی محصولوں سے کمی پوری کرے گی یا اپنے اخراجات کم کرے گی۔ اگر سال کے ختم پر صوبجاتی حکومت کے پاس کچھ رقم بچ رہے گی تو وہ مرکزی حکومت کو واپس نہیں کی جائے گی بلکہ صوبجاتی حکومت کے تصرف میں رہے گی۔ صوبجاتی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار تک کی خدمتوں پر تقرر کرسکیں۔ لارڈ میئو کا خیال تھا کہ اس انتظام سے مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہوگی جس سے دونوں کے لئے سہولت ہوگی۔ لیکن مختلف صوبوں کی حقیقی ضروریات اور ان کے اخراجات کا باقاعدہ تعین نہیں کیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں جو مختلف صوبوں کے اخراجات تھے انھیں کو رقموں کے تعین کی بنیاد قرار دیا گیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ صوبے جو حال ہی میں برطانوی مقبوضات میں شریک کئے گئے تھے ان کی ضرورتیں ان صوبوں سے مختلف تھیں جو پہلے سے انگریزی حکومت کے تحت آچکے تھے۔ اس طرح بعض صوبوں کے ساتھ مرکزی حکومت فیاضی سے پیش آئی اور بعض دوسرے صوبوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی۔

لارڈ میئو کی صوبجاتی مالیات کی تجویز عہد حالیہ کی انتظامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس تجویز میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کی اسی وقت ترقی اور نشو و نما ممکن ہوگی جب کہ حکومت کی مالیات میں عدم مرکزیت پیدا کی جائے۔ بغیر ایسا کئے تعلیم، حفظان صحت، تعمیرات اور دوسری مقامی ضرورتوں کی پابجائی ممکن نہیں ہوسکتی۔ پہلی مرتبہ مقامی حکومت اختیاری کے اداروں کی ضرورت کا ذکر ہمیں لارڈ میئو کی اس تجویز میں ملتا ہے[1]۔ بعد میں رپن نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ لارڈ میئو نے صوبوں کی حکومتوں کو محکمہ رجسٹری، جیل، پولیس، تعمیرات اور سررشتہ تعلیمات کا انتظام سپرد کردیا اور ان کے لئے رقم مقرر کردی گئی۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مرکزی حکومت کے کام کا بوجھ

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 517.

ہلکا ہو جائے۔ صوبوں کی حکومتوں کو مقامی محصول لگانے کا اختیار دے دیا گیا تاکہ وہ اس طرح اپنی آمدنی بڑھا سکیں اور ان میں اپنی حیثیت اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ اب ہر صوبہ کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے رقم مقرر کردی گئی جو وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا مجاز تھا۔ اگر اس رقم کے علاوہ کوئی صوبہ خرچ کی ضرورت محسوس کرتا تو وہ اپنے شہریوں پر محصول لگاکر رقم مہیا کرسکتا تھا۔ اس انتظام سے مرکزی حکومت کو بہت بچت ہونے لگی اور صوبوں کا مالی انتظام بھی بہتر ہو گیا۔

دیسی ریاستیں

لارڈ ڈلہوزی کو دیسی ریاستوں کے معاملات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس لئے مختلف ریاستوں میں اپنے دوروں میں والیان ملک پر یہ بات اچھی طرح واضح کردی کہ برطانوی حکومت ریاستوں میں اچھا نظم ونسق دیکھنا چاہتی ہے اور اگر کہیں بدنظمی پھیلے گی تو بالادست قوت کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ عوام کے مفاد کی نگہداشت کی خاطر مداخلت کرے۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ (پولٹیکل ڈپارٹمنٹ) نے اس امر پر خاص طور پر زور دیا کہ مختلف ریاستوں میں جب وزیر اعظم مقرر کیا جائے تو حکومت ہند سے دریافت کرلیا جائے۔ اگر حکومت ہند کسی شخص کے دیوان (وزیر اعظم) ہونے کو پسند نہ کرے تو والیٔ ملک مجاز نہ ہوگا کہ اپنی رائے پر اصرار کرے۔ اگرچہ یہ حق حکومت ہند کو کسی معاہدہ کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو اس پر اصرار تھا اس واسطے والیان ملک خاموش ہو گئے۔

لارڈ ڈلہوزی نے راجپوتانہ میں والیان ملک کا جو دربار کیا اس میں جن الفاظ میں انھیں نصیحت کی ان کا لب ولہجہ ملاحظہ ہو:-

"آپ کو چاہئے کہ اپنی رعایا کے ساتھ رحم
اور انصاف سے پیش آئیں ہم (یعنی انگریزی حکومت)
یہ نہیں چاہتے کہ آپ ہمارے سامنے جب آئیں تو
آپ کے ہاتھ تحفوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب آپ آئیں تو آپ کے ہاتھ (ظلم
وزیادتی کی آلائش سے) پاک ہوں۔ آپ چاہے
کیسے ہی قیمتی تحفے لائیں لیکن ان کے ذریعہ سے
آپ برطانوی حکومت کی رضامندی کو نہیں خرید سکتے۔
آپ کی شان وشوکت سے ہماری نظر میں آپ کی وقعت نہیں
بڑھے گی۔ آپکی خوشامد ہیری دوستی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں
بن سکتی۔ ہمارے دل میں آپ کی قدر ومنزلت نہ توان تحفوں سے
ہوگی جو آپ ہمیں پیش کرنے کی غرض سے لائیں گے اور نہ آپ
کے اور آپ کے خدمتگاروں کی شان وشوکت سے
بلکہ اس طرز عمل سے جو آپ اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے
اختیار کریں گے . . . . . اگر ہم آپ کے حقوق اور مراعات
کا لحاظ رکھتے ہیں تو آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ آپ بھی ان لوگوں
کے حقوق کا خیال رکھیں جن پر آپ کی حکومت قایم ہے۔ ہم آپ
کے اختیارات کو قایم رکھنے میں آپ کے پشت وپناہ ہیں اور
ہم اس کے صلہ میں توقع رکھتے ہیں کہ آپ اپنی ریاستوں میں
اچھی حکومت قایم رکھیں گے۔ ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ راجپوتانہ کے
طول وعرض میں ہر جگہ امن وامان اور عدل وانصاف کا دور
دورہ ہو۔ ہر شخص کی ملکیت محفوظ رہے۔ مسافر ایک جگہ سے
دوسری جگہ بلا کھٹکے آجا سکیں کاشتکار اپنی محنت کا پھل پائے اور
اور تاجر اپنے بیوپار سے نفع کمائے۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنے اپنے
علاقے میں سڑکیں بنائیں، آبپاشی کا انتظام کریں تاکہ رعایا کی
حالت میں بہتری کی صورت پیدا ہو اور آپ کی ریاستوں کی آمدنی
میں اضافہ ہو۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ بیماروں کے لئے علاج کا
کا انتظام کریں اور تعلیم کی اشاعت کریں۔" [1]

[1] The British Crown and the Indian States, p. 63-64.

لارڈ میؤ نے محکمۂ سیاسیہ کو براہ راست اپنے تحت لے لیا تھا۔ اس لئے والیان ریاست کی نابالغی کے زمانے کے لئے بعض عام اصول بنائے جن پر مختلف ریاستوں میں عمل کیا گیا۔ ایسی حالت میں بالواسطہ حکومت ہند کی نگرانی قایم کردی گئی۔ بالواسطہ راجپوتانہ کے والیان ریاست کو یہ بات جتادی گئی کہ حکومت ہند کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ معاہدوں کی لفظی پابندی کرے بلکہ بالادست قوت کی حیثیت سے وہ ان کے انتظام کو بہتر بنانے کیلئے جب ضروری خیال کرے مداخلت کرسکے گی۔ ان کی خود مختاری اور مطلق حکمرانی کے اصول اسی وقت تک ہیں جب تک کہ اندرونی نظم و نسق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی جس کا تعین کرنا حکومت ہند کا فرض ہے اس کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صورتوں میں بالادست قوت کے معاشی اور مالی مفاد کو ترقی دینے کی تدبیریں اختیار کرنے میں بڑی سہولت ہوگئی۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ ملک میں ریلوے کی وسعت عمل میں آرہی تھی۔ لارڈ میؤ کے ایماء پر یہ اصول تسلیم کرلیا گیا کہ جس ریاست میں سے ریلوے لائین گزرے وہاں اس کے لئے مفت زمین حاصل کرلی جائے اور اس پر حکومت ہند کا اقتدار اور اختیار سماعت تسلیم کیا جائے۔ چونکہ محکمۂ سیاسیہ کی طرح تعمیرات (پی۔ڈبلیو۔ڈی) کا محکمہ بھی براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھا اسلئے ریلوں کے لئے ریاستوں سے زمینیں حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ لارڈ میؤ یہ چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں کے نظم و نسق میں بہتری پیدا ہو لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ سب کچھ انگریزی حکومت کے اشارہ پر ہو۔ اگرچہ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے والیان ریاست سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اندرونی آزادی کا احترام کیا جائے گا لیکن عملی طور پر حکومت ہند کو اپنی صوابدید پر یہ اختیار حاصل رہا کہ اگر کسی ریاست کے انتظام میں خرابی پیدا ہو تو وہ مداخلت کرکے انتظام کو درست کرے۔ لارڈ میؤ کے زمانے میں الور اور کاٹھیاوار کی بعض ریاستوں میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ لارڈ میؤ نے ان والیان ریاست کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ الور کے راجا کو گدی سے ہٹا کر اس کے

اختیارات عارضی طور پر ایک کونسل کے سپرد کر دیئے گئے جس کے ارکان کو حکومت ہند نے منتخب کیا تھا میو نے والیان ریاست کی اولاد کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اجمیر میں ایک کالج قایم کیا جو راجکمار کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کالج کی تعلیم میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ راجکماروں کو ان کی آیندہ ذمہ داریوں کیلئے تیار کیا جائے۔ اور انھیں ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے لئے مفید ہو اور آیندہ انھیں اچھا حکمراں بننے میں مدد دے۔ ریاستوں کا انتظام درست کرنے کی یہ نہایت مناسب تجویز تھی جس سے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوئے۔ بعد میں راجکوٹ اور لاہور میں بھی اسی قسم کے کالج قایم کئے گئے جن میں وہی اصول مدنظر رکھے گئے جن کے مطابق اجمیر کے راجکمار کالج کو قایم کیا گیا تھا۔

لارڈ میو نے ۱۸۷۰ء میں ریاست الور کے معاملوں میں وہاں کی بدنظمی کے باعث مداخلت کی۔ راجا کو گدی سے ہٹا کر ریاست کا انتظام ایک مجلس کے سپرد کر دیا جس کی صدارت انگریزی حکومت کے ایجنٹ کے ذمہ قرار پائی اور وہی اصل کرتا دھرتا بن گیا۔ حالانکہ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے والی الور سے معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے ریاست کی فوجی حفاظت[1] کے علاوہ یہ وعدہ کیا تھا کہ اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی تاج سے براہ راست تعلق پیدا ہو جانے سے والیان ریاست کو اپنی بقا کے متعلق تو اطمینان پیدا ہو گیا تھا لیکن لارڈ کیننگ ہی کے وقت سے انکی دستوری حیثیت کو برطانوی مرکزی حکومت کے مقابلے میں کمزور کرنے کی کوشش کی گئی اور لارڈ میو نے خاص طور پر اس رجحان کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ اب برطانوی حکمت عملی کا منشا اپنے مقبوضات کو وسیع کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مفاد یہ تھا کہ مرکزی حکومت کے اثر اور نفوذ کو بڑھایا جائے اور ہندوستان کے سیاسی نظام میں ریاستوں کو ایک لازمی جزو کی حیثیت سے جگہ دی جائے۔

لارڈ میو کے عہد حکومت میں نہروں ریلوں اور سڑکوں کی توسیع کی تجویزوں کو خود اس کی ذاتی نگرانی میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ حکومت ہند میں

[1] Aitchison, Vol. III, p. 322

محکمہ زراعت اور محکمہ تجارت قایم ہوئے تاکہ ان دونوں شعبوں پر ان کی اہمیت کے لحاظ سے توجہ کی جاسکے اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہو۔ اعداد و شمار کا محکمہ قایم ہوا اور ملک میں پہلی مرتبہ مردم شماری لی گئی۔ لارڈ میئو جیل کے انتظام میں بھی اصلاح کرنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ فروری ۱۸۷۲ء میں جزیرہ انڈمنس گیا تاکہ خود حالات کا معائنہ کرے۔ وہاں ایک قیدی نے اس کو قتل کر دیا۔ لارڈ میئو کی دردناک موت پر ہر طرف رنج و الم کا اظہار کیا گیا اس واسطے کہ وہ ایک اصلاح پسند اور محنتی حکمراں تھا اور رعایا کی بھلائی کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اس کے قتل کے بعد گورنر مدراس لارڈ نیپیر نے گورنر جنرل کے فرائض ۱۸۷۲ء کی ابتدا تک سنبھالے جب کہ انگلستان سے لارڈ نارتھ بروک اس عہدہ پر نامزد ہو کر آگئے۔

لارڈ نارتھ بروک
۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء

لارڈ نارتھ بروک کا انتخاب ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے کے عہدہ کے لئے مسٹر گلیڈسٹن نے کیا جو اس زمانے میں انگلستان کا وزیر اعظم تھا لارڈ نارتھ بروک لبرل وزارت میں نائب معتمد جنگ کی خدمت پر فائز رہ چکا تھا۔ وہ نظم و نسق کے عملی مسائل کا کافی تجربہ رکھتا تھا۔ اور مزاج میں اپنے پیشرو لارڈ میئو اور اپنے جانشین لارڈ لٹن سے بالکل مختلف تھا۔ نہ اس میں میئو کی سی قوت عمل تھی اور نہ لٹن کی سی آب و تاب۔ اس کی ہر بات بنی تلی اور احتیاط کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کے نظم و نسق کی خصوصیت سر جان لارنس کی سی بے عملی ہے۔ وہ آگے قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سرگزشت (میموارز) میں لکھا ہے کہ میری پالیسی کا اصول یہ تھا کہ معاملے جیسے چل رہے ہیں انھیں اسی طرح سے چلنے دیا جائے تاکہ کسی قسم کا ملک میں ہیجان نہ پیدا ہو۔[1]

لارڈ نارتھ بروک کو مالیات کے معاملوں کا کافی تجربہ تھا۔ اس نے

---

[1] Thomas George, Earl of North brook, "A Memoir" by B. Mailet, p. 69.

حکومت ہند کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں اگرچہ انگلستان کی حکومت کی مخالفت کرنی پڑی لیکن اس نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔ اس زمانے میں ہندوستان سے باہر جانے والے مال پر بحساب قیمت دس فی صدی اور دوسرے ملکوں سے آنے والے مال پر تین فی صدی محصول حکومت ہند وصول کیا کرتی تھی۔ لارڈ نارتھ بروک نے درآمد کے محصول کو گھٹا کر پانچ فی صدی کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اکثر برآمد ہونے والی اشیا کا محصول بالکل معاف کر دیا تاکہ ہندوستانی تجارت کو ترقی کا موقع ملے۔ چونکہ ہندوستان سے اکثر اشیائے خام باہر جاتی تھیں اس واسطے اس تجویز سے کاشتکاروں کو فائدہ ہوا۔ حکومت انگلستان چاہتی تھی کہ درآمد پر جو پانچ فی صد محصول رکھا گیا ہے اسے اٹھا دیا جائے تاکہ منچسٹر کے کپڑے کی گرنیوں والوں کو نفع کمانے کا موقع ملے۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک نے اس کا صاف جواب دے دیا کہ یہ محصول کسی حالت میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت ہند ہندوستان کے مفاد کے مقابلہ میں انگلستان کے تاجروں کے مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔ اس نے محصول آمدنی کو ختم کر دیا جو کیننگ کے زمانے میں رائج کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کے متوسط طبقہ کا بار ہلکا ہو اور اس کی وفاداری سلطنت برطانیہ کے ساتھ استوار ہو۔[1] لارڈ نارتھ بروک کا خیال تھا کہ اگر محصول آمدنی کو ختم کر دیا گیا تو اس سے ملک میں بہتر سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ حکمت عملی کے طور پر محصول آمدنی کو ختم کرنے کے خاطر خواہ نتائج نکلے لیکن معاشی نقطۂ نظر سے لارڈ نارتھ بروک کی رائے کی صحت مشتبہ ہے۔ اگر محصول آمدنی کے بجائے محصول نمک کو ختم کیا جاتا تو عوام کو زیادہ فائدہ ہوتا۔ لیکن گورنر جنرل کو عوام کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقے اور تاجروں کی جو سیاسی شعور رکھتے تھے اور جن کی رضامندی کو حکومت عوام کے مفاد

---

[1] Ibid., p. 69-80.

کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ لارڈ نارتھ بروک نے اپنے عہد میں کوئی نیا محصول نہیں جاری کیا۔ اس نے بعد میں لکھا تھا کہ "اہل ہند انفعالی طور پر ہمارے وفادار رہیں گے اگر ہم ان پر محصولوں کا بار نہ ڈالیں۔ رہا عملی طور پر ہماری وفاداری ہیں ان کا سرگرم ہونا اس کی ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔"

بنگال اور بہار کا قحط

۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۴ء میں بنگال کے بعض حصے اور بہار کا پورا علاقہ قحط سے متاثر تھا۔ لارڈ نارتھ بروک کے حکم سے حکومت ہند نے چاول کی بہت بڑی مقدار برما سے خرید کر قحط زدہ علاقوں میں تقسیم کی اور گزشتہ قحطوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اس دفعہ بہت اچھا انتظام کیا۔ متاثرہ علاقوں میں حکومت کی طرف سے امدادی کام جاری کر دئے گئے تاکہ رعایا کی تکلیف میں کمی ہو اور گاؤں کے غریب لوگوں کو روزگار فراہم ہو جائے۔ دیہات میں نہریں کھدوانے اور سڑکیں بنوانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا گیا جس سے ملک کو بھی آیندہ فائدہ پہنچا اور وقتی امداد سے بہت سے لوگوں کی جانیں بچ گئیں۔ اس ضمن میں حکومت ہند کے رکن مالیات سر رچرڈ ٹمپل کی کوششیں قابل تعریف ہیں جس کی انتظامی قابلیت تمام رکاوٹوں پر غالب آگئی۔ اس نے اس وقت تک قحط کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جب تک کہ متاثرہ علاقوں میں لوگوں کو پھر سے اطمینان حاصل نہ ہو گیا۔ اگرچہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جارج کیمبل قحط زدہ علاقوں میں احتیاط سے روپیہ خرچ کرنا چاہتا تھا لیکن مرکزی حکومت نے بڑی فیاضی اور دریادلی کا ثبوت دیا۔ چونکہ قحط کو دور کرنے میں مرکزی حکومت نے تمام روپیہ صرف کیا تھا اس لئے سارا انتظام اور نگرانی بھی مرکزی حکومت کی رہی اور لفٹنٹ گورنر بنگال پر اس دفعہ بھروسہ نہیں کیا گیا جس کی اس کو شکایت تھی۔ قحط کے ختم ہو جانے کے بعد بھی غلہ کے ذخیرے باقی رہ گئے جنھیں حکومت نے سستے داموں بیچ ڈالا۔ سر رچرڈ ٹمپل نے معترضوں کو یہ جواب دیا کہ اگر وقت پر بارش نہ ہو جاتی تو اندیشہ تھا کہ قحط کا سلسلہ آئندہ سال بھی چلے گا۔ چنانچہ

احتیاطاً غلہ کے ذخیرے جمع کر لئے گئے تھے تاکہ ضرورت کے وقت رعایا کو تکلیف نہ ہو اور فاقوں سے جانیں ضائع نہ ہوں۔ لیکن چونکہ بارش ہو جانے کی وجہ سے اس ذخیرہ کو استعمال کی نوبت نہیں آئی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ حکومت نے فضول خرچی سے کام لیا۔ اگر آئندہ کے لئے ذخیرہ نہ رکھا جاتا تو عین وقت پر حکومت رعایا کی مدد کرنے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی آنے والی مصیبت کے لئے پیش بندی کرنا حکومت کا فرض تھا۔[1]

ریاست بڑودہ میں مداخلت

مہاراجہ ملھار راؤ گائکواڑ والی بڑودہ اور حکومت ہند میں کچھ عرصے سے اَن بن چلی آرہی تھی۔ حکومت ہند کے بعض انتظامی معاملات کے متعلق مہاراجہ کو فہمائش بھی کی گئی لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اس زمانے میں بڑودہ میں کرنل فیر ریزیڈنٹ مہاراجہ کا مخالف تھا۔ اختلاف کی اصلی وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ کے جانشین کو ریزیڈنٹ اس کی اولاد نہیں تصور کرتا تھا اور اسکے خلاف حکومت ہند کو اپنی رائے سے مطلع کر چکا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں ریزیڈنٹ کو کسی نے شربت میں زہر دینے کی کوشش کی تو حکومت ہند نے اس واقعہ کی نسبت تحقیق کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جو چھ ارکان پر مشتمل تھا تین انگریز اور تین ہندوستانی اس کا صدر کلکتہ ہائیکورٹ کا چیف جسٹس سر رچرڈ کوچ تھا۔ ہندوستانی ارکان مہاراجہ گوالیار مہاراجہ جے پور اور سر ڈنکر راؤ تھے۔ ان تینوں کی رائے تھی کہ مہاراجہ بڑودہ زہر خورانی کے معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں لیکن انگریز ارکان نے مہاراجہ پر جرم کو ثابت قرار دیا۔ مہاراجہ کی طرف سے سٹر سر جنٹ نیشنا ئن نے بڑی قابلیت سے مقدمہ کی قانونی پیروی کی۔ غرضکہ آخری تجویز کے لئے معاملہ کو وائسرائے کی خدمت میں پیش کر دیا گیا جس کو بالادست قوت کے نمائندے کی حیثیت سے والیان ملک پر ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ جب یہ دیکھا گیا کہ مقدمہ ثابت نہیں ہوتا تو حکومت ہند نے وزیر ہند کے مشورے سے

---

[1] Temple, Men and euents of my time in India, P. 403, 404

بدانتظامی کے الزام میں مہاراجہ کو گدی سے ہٹا کر مدارس بھیج دیا اور اس کے ایک نوعمر رشتہ دار کو گدی نشین کیا گیا۔ سر مادھوراؤ کو بحیثیت وزیر اعظم نظم ونسق کے وسیع اختیارات دئے گئے۔ جب تک راجہ نابالغ رہا حکومت کی نگرانی ریاست پر قایم رہی۔ مہاراجہ کے خلاف حکومت ہند نے جو فیصلہ کیا اس پر دیسی زبان کے اخباروں میں سخت تنقید کی گئی۔ خود بڑودہ کی رعایا میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ حکومت ہند کے طرز عمل پر یہ تنقید بالکل صحیح ہے کہ جس الزام کی بناء پر مہاراجہ بڑودہ کے خلاف ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا اور مقدمہ چلایا گیا تھا اس کے تحت اس کو معزول نہیں کیا گیا بلکہ بدنظمی کے ایک عام اور مبہم الزام پر جس کا قانونی تعین ممکن نہ تھا لارڈ نارتھ بروک نے ریاست بڑودہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو ان الفاظ میں حق بجانب قرار دیا جن سے اس کی دیسی ریاستوں سے متعلق حکمت عملی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہئے کہ کسی دیسی ریاست کے باشندے بدانتظامی کے خلاف صرف بالادست قوت سے رجوع کر سکتے ہیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ والیان ریاست کو اب ان انقلابی بغاوتوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا جو قدیم زمانے میں ظلم وزیادتی کا واحد علاج تھا۔ لیکن اب ملکۂ معظمہ کے راج میں ظلم وزیادتی کو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی ایسی حکومت کے تحت بدنظمی پھیل جائے جس کی پشت پناہی پر بالادست قوت موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انگریزی حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ ایسی ریاست کے انتظام کو درست کرنے کی کوشش کرے جہاں ابتری پھیلی ہوئی ہو۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے کمیشن مقرر کرنے کا حق جیسا کہ مہاراجہ بڑودہ کے متعلق تحقیق اور تفتیش کے لئے مقرر کیا گیا حکومت ہند کو کس طرح حاصل ہوا۔ کیا معاہدوں میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ معاہدوں میں ایسی کارروائیوں کا حکومت ہند کو مجاز نہیں کیا گیا ہے لیکن عمل درآمد یہ رہا ہے کہ بالا دست قوت کی حیثیت سے حکومت ہند نے خود یہ حق حاصل کر لیا ہے۔ پھر قانون کا یہ عام اصول ہے کہ جب تک کسی شخص پر جرم ثابت نہ ہو جائے اس کو بے خطا سمجھنا چاہئے۔ لیکن بالا دست قوت اس قسم کے معاملات میں عدالتی فیصلہ کا انتظار کئے بغیر من مانے طور پر جو کچھ چاہتی ہے خود کر لیتی ہے۔ چنانچہ مہاراجہ بڑودہ کو اس سے پہلے کہ کمیشن اپنی رپورٹ پیش کرے حکومت ہند نے تمام اختیارات سے قطعاً محروم کر دیا تھا۔ اس سے صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے ریاستوں کی جاگیردارانہ نوعیت پر کچھ عرصے سے زور دینا شروع کیا تھا تاکہ والیان ریاست کو اس کا احساس ہو کہ وہ تاج برطانیہ کے ماتحت ہیں اور اس کی رضامندی ان کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔

افغانستان سر جان لارنس کی تقلید میں لارڈ نارتھ بروک نے بھی افغانستان کے اندرونی معاملوں میں عدم مداخلت کی حکمت عملی اختیار کی۔ امیر شیر علیخاں چاہتا تھا کہ کوئی معاہدہ ہو جائے تاکہ حکومت ہند کے ساتھ ان کے تعلقات واضح ہو جائیں۔ اس زمانے میں روسی اثر ترکستان میں بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے امیر شیر علی کو تشویش ہو گئی تھی۔ روسی فوجیں افغانستان کی شمالی سرحد تک پہنچ گئی تھیں۔ ۱۸۷۳ء میں روسیوں نے خیوا پر قبضہ کر لیا تھا اور خان خیوا روسی حکومت کا باجگزار بن گیا تھا۔ ان حالات میں امیر افغانستان نے حکومت ہند کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنا ایک سفیر بات چیت کی غرض سے وائسرائے کے پاس روانہ کیا۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک افغانستان کے معاملے میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں اس نے اپنے ایک خط میں جو سر لوی میلٹ کے نام ہے لکھا تھا کہ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت ہند افغانستان کی بابت اپنی حکمت عملی میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ نظری طور پر روس کا خطرہ چاہے کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو لیکن اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا کہ

وہ ہندوستان پر حملہ کرے گا۔[1]

جب انگلستان میں ڈزرائیلی کی سرکردگی میں قدامت پسند حکومت برسر اقتدار ہوئی تو لارڈ نارتھ بروک کو نئی حکومت کے دفتر خارجہ نے خطرہ کی اہمیت اور اس کے نتیجوں کی جانب متوجہ کیا۔ لارڈ سالسبری نے جو اس قدامت پسند حکومت میں وزیر ہند تھا، امیر افغانستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کی تائید کی اور ضرورت کے وقت اس کو مدد دینے اور اس کے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک کو وزیر ہند کی حکمت عملی سے اتفاق نہ تھا۔ اس لئے اس نے استعفا دے دیا اور اس کی جگہ لارڈ لٹن وائسرائے مقرر ہوا۔ لارڈ نارتھ بروک کا خیال تھا کہ اگرچہ وزیر ہند کا عہدہ وائسرائے کے عہدہ سے بلند ہے لیکن پارلیمنٹ نے وائسرائے اور اس کے ساتھیوں کو بعض ایسے حقوق بھی دئے ہیں جن کی وجہ سے وہ وزیر ہند کا تابع فرمان نہیں کہا جاسکتا۔[2]

---

[1] Mallet, Earl of North brook, p. 99. The Cambridge History of India, Vol. IV, p. 215.

[2] Mallet, Ibid, p. 91.

سترھواں باب

لارڈ لٹن کی شہنشاہیت پسندی

لارڈ لٹن انگلستان کی قدامت پسند جماعت کا ایک با اثر رکن تھا۔ کابینۂ وقت اور وزیر ہند سالبری نے اس کو اس لئے ہندوستان بھیجا کہ وہ وہاں جا کر افغانستان کے بارہ میں نئے اصول کار کو نافذ کرے جو انگلستان کی خارجی حکمت عملی کے مطابق ہوں۔ چنانچہ لارڈ لٹن کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے پیشرؤوں کی طرح عدم مداخلت کی منفیانہ حکمت عملی کو ترک کر کے امیر شیر علی کے ساتھ معاہدہ کرے تاکہ افغانستان میں برطانوی مفاد کا تحفظ ممکن ہو اور وہاں روسی حلقۂ اثر نہ قائم ہو سکے۔

لٹن نے سرحد پر فوجی استحکام کی خاطر خان قلات سے کوئٹہ اور اس کے مضافات کو خرید لیا جو ہندوستان کی سرحد پر فوجی نقل و حرکت کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت اہمیت رکھتے تھے۔ کوئٹہ سے درۂ بولان کے حملہ آور کی مدافعت موثر طور پر ممکن تھی۔ امیر شیر علی کو یہ انتظام پسند نہیں آیا۔ اس کے دل میں شبہہ پیدا ہوا

کہ کہیں حکومت ہند کوئٹہ سے آگے بڑھ کر قندھار پر قبضہ کا ارادہ تو نہیں رکھتی۔ مہاراجہ کشمیر سے گلگت حاصل کیا گیا تو اسے بھی افغانستان میں شبہہ کی نظر سے دیکھا گیا اس واسطے کہ یہ مقام بھی افغانستان کی شمالی سرحد پر واقع تھا۔ امیر شیر علی انگریزی حکومت کی نیت سے کھٹک گیا تو اس نے روسی حکومت سے اپنے تعلقات بڑھانے شروع کر دئے۔ چنانچہ ایک روسی وفد کابل آیا جس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس اثناء میں یورپ میں روس اور ترکی جنگ چھڑ گئی اور حکومت برطانیہ نے اپنی خارجی مصلحتوں کے مدنظر ترکوں کی طرفداری کا فیصلہ کیا۔ روس نے جو شرطیں ترکی سے منوالی تھیں انھیں انگریزوں کے اشارہ پر ۱۸۷۸ء کی برلن کانگریس میں رد کر دیا گیا۔ روس چونکہ اس موقع پر یورپ کے اکثر ملکوں سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا اس واسطے وہ خاموش ہو گیا۔ اور انگریزی حکومت کو سیاست کاری کی بڑی بھاری جیت رہی۔ ترکی میں جب روس کو اپنے سیاسی منصوبے پورا کرنے کا موقع نہ ملا تو اس نے افغانستان کی سرحد پر فوجیں بھیجنا شروع کیں تاکہ انگریزوں کو وزا پریشانی ہو۔ امیر شیر علی کو اپنی شمالی سرحد پر روسی فوجوں کا جماؤ اگرچہ ناپسند تھا لیکن وہ اس بارہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس موقع پر لارڈ لٹن تدبیر اور معاملہ فہمی سے کام لیتا تو ممکن تھا امیر شیر علی حکومت ہند سے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لٹن نے اپنے طرز عمل سے معاملات کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا جن کی وجہ سے دوسری جنگ افغانستان کی نوبت آئی۔

لارڈ لٹن نے امیر افغانستان کو کہلا بھیجا کہ حکومت ہند یہ ارادہ کر رہی ہے کہ عنقریب ایک وفد کابل بھیجے تاکہ ملکۂ وکٹوریہ کے ملکہ ہند (امپرس آف انڈیا) ہونے کا افغانستان کے دار السلطنت میں باقاعدہ اعلان کیا جائے۔ امیر صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ ساری کارروائی بالکل غیر ضروری ہے۔ اس قسم کا کوئی انتظام اس واسطے قرین مصلحت نہ ہوگا کہ وفد کے ارکان کی جان کی حفاظت حکومت افغانستان اپنے ذمہ نہیں لے سکتی۔ لارڈ لٹن کو یہ جواب بہت ناگوار گزرا۔ اس نے اس کو اپنے لئے اور اپنی حکومت کے لئے

ایک طرح کی ذلت اور ہتک سمجھا۔ خود وائسرائے کی کونسل کے تین ارکان جن میں سر ولیم میور، سر ہنری نارمن اور سر آرتھر ہاب ہاوس شامل تھے لٹن کے اس اقدام کے خلاف تھے اور امیر افغانستان کو حق بجانب سمجھتے تھے کہ وہ حکومت ہند کے وفد کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت نہ دے۔

جنوری ۱۸۷۷ء میں افغانی نمائندے سید نور محمد اور سر لوئس پیلی کی پشاور میں ملاقات ہوئی تاکہ معاملات کی صفائی کر لی جائے۔ سید نور محمد نے حکومت ہند کی اس خواہش کو ماننے سے انکار کیا کہ انگریزی ریزیڈنٹ مستقل طور پر کابل میں رہے۔ اس نے یہ بات واضح کر دی کہ اگر امیر شیر علی حکومت ہند کو اس کی اجازت دے دیں کہ ان کا ریزیڈنٹ کابل میں رہے تو افغانی لوگ یہ خیال کریں گے کہ افغانستان پر انگریزوں نے اپنا اثر قایم کر لیا ہے۔ ایسی حالت میں خود امیر شیر علی اپنے تخت و تاج کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اسلئے کہ افغانی آزادی کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں غرضیکہ جس اصول پر لٹن نے افغانستان سے تعلقات قایم کرنے چاہے وہ حکومت افغانستان کے لئے ناقابل قبول تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی نوعیت دونوں ملکوں کے لئے ناقابل اطمینان بنی۔

آخر لٹن نے امیر صاحب کو پیغام بھیجا کہ اس کو حکومت ہند کی جانب سے جو زر امدادی ملتا ہے اس میں اضافہ کر دیا جائے گا اور اس کے چھوٹے بیٹے عبد اللہ خان کو اس کی مرضی کے مطابق اس کا جانشین تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور اگر افغانستان کی سرحد پر کوئی غیر ملکی حکومت حملہ کرے گی تو حکومت ہند اس کی مدد کرے گی۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جبکہ امیر صاحب ہرات میں انگریزی ریزیڈنٹ کا مستقل طور پر قیام تسلیم کر لیں۔ لیکن امیر صاحب اس شرط کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ غرضکہ حکومت ہند اور حکومت افغانستان میں بات چیت کچھ عرصے تک بند رہی۔ اب تک لارڈ لٹن نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا تھا جس سے کشیدگی بڑھتی۔ اس نے یہ ضرور کیا کہ گلگت پر قبضہ ہو جانے کے بعد قبائلی علاقوں میں فوجی چوکیاں بنانے کی کوشش کی۔ اس سے امیر افغانستان کے شبہوں میں اضافہ ہوا اور وہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ انھیں کے خلاف ہے۔ کپتان کیوگناری تک نے جو لٹن کا معتمد الیہ اور

اس کی حکمت عملی کے مداحوں میں تھا اس کو متنبہ کیا کہ قبائلی علاقے میں حلقہ اثر بڑھانے کی ہر کوشش کو امیر صاحب اپنے خلاف ایک حربہ تصور کریں گے۔ اس لئے اس بات میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس دوران میں امیر شیر علی نے روس کے ساتھ خفیہ معاہدہ کرلیا روسی وفد کا کابل میں سرکاری طور پر استقبال کیا گیا۔ لٹن کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے وزیر ہند سے اس کی اجازت حاصل کرلی کہ امیر شیر علی کو مجبور کیا جائے کہ روسی وفد کی طرح انگریزی وفد کو افغانستان جانے کا موقع دے۔ لٹن کا خیال تھا کہ اگر اب زیادہ عرصے تک افغانستان کے معاملات کی طرف سے حکومت ہند نے بے توجہی برتی تو برطانوی مفاد کو سخت نقصان پہنچ جائے گا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ امیر شیر علی کے اس اختیار کی حد بندی کی جائے کہ وہ بغیر انگریزی حکومت کی اجازت کے جس بیرونی طاقت سے چاہے بات چیت کر سکے۔ جب روسی حکومت کو معلوم ہوا کہ حکومت ہند اپنا وفد بھیجنے والی ہے تو روسی سفیر اسٹول ٹاف کو واپس بلا لیا گیا۔ سیاست کاری کے اصول کے مدنظر یہ ایسا موقع تھا کہ لٹن چاہتا تو بجائے انگریزی مشن بھیجنے پر اصرار کرنے کے امیر صاحب سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی دوسری تدبیریں کرتا۔ لیکن اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سر نیول چمبرلین کی سرکردگی میں ایک سفارت افغانستان روانہ کردی۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۷۸ء کو یہ سفارت علی مسجد پہنچی یہاں انھیں معلوم ہوا کہ اگر وہ اور آگے بڑھے تو ان کے خلاف افغانی حکومت قوت استعمال کرے گی۔ چنانچہ علی مسجد سے وہ پشاور چلے آئے۔ لٹن نے برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد ۲۱ نومبر ۱۸۷۸ء افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ سر سیمول براون کی سرکردگی میں درہ خیبر کی طرف سے میجر جنرل رابرٹس کی سرکردگی میں درہ پیوار کی طرف سے اور جنرل اسٹورٹ کی سرکردگی میں درہ بولان کی طرف سے انگریزی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ بغیر کسی مقابلے کے انھوں نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ امیر شیر علی نے بھاگ کر ترکستان کے روسی علاقہ میں پناہ لی

اس نے ترکستان کے روسی گورنر کوف مان کو ہر حیثیت آمادہ کرنا چاہا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کچھ اس کی مدد کرے لیکن کوف مان اپنی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایسا کوئی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ امیر شیر علی نے جب یہ خواہش کی کہ اس کو روس کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرز برگ جانے کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ وہاں جا کر زار کے روبرو اپنا معاملہ پیش کر سکے تو بھی اس کو کوئی ہمت افزا جواب نہیں دیا گیا بلکہ ٹالنے کی کوشش کی گئی۔ اس بے کسی اور پریشانی کے عالم میں ۲۱ فروری ۱۸۷۹ء مزار شریف کے مقام پر اس نے وفات پائی۔

امیر شیر علی کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے اسکے بیٹے یعقوب خاں کو امیر افغانستان مان لیا اور مئی ۱۸۷۹ء میں گندمک کے مقام پر اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے نئے امیر نے وعدہ کیا کہ وہ کابل میں انگریزی ریزیڈنٹ اور ہرات میں انگریزی ایجنٹ کو رکھے گا اور خارجی امور میں حکومت ہند کے مشورہ پر عمل کرے گا۔ حکومت ہند نے چھ لاکھ روپیہ سالانہ زر امدادی دینے کے علاوہ وعدہ کیا کہ اگر افغانستان پر کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہوگی تو اس کی فوجی امداد کی جائے گی۔ یعقوب خاں نے درۂ بولان کے قریب کے ضلعے پشین اور سبی انگریزوں کے حوالے کر دئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ افغانستان میں جہاں جہاں انگریزی فوجیں ہیں وہ سب فوراً ہندوستان واپس ہو جائیں گی سوائے قندھار کی فوج کے جو موسم سرما کے آخر تک وہاں رہے گی اور پھر وہ بھی واپس ہو جائے گی۔ صلح نامہ گندمک لارڈ لٹن کی حکمت عملی کی انتہائی کامیابی سمجھنا چاہئے اس لئے کہ اس میں جو شرطیں طے ہوئیں ان سے انگریزوں کو وہ سب کچھ مل گیا جو وہ عرصے سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بقول لارڈ بیکنس فیلڈ انگریزوں کو ہندوستان کی حفاظت کے لئے سائنٹفک سرحد مل گئی۔ لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ دوبارہ انگریزی حکومت کو یہ تجربہ ہوا کہ افغانستان میں کوئی ایسی حکومت مستحکم بنیادوں پر قایم نہیں سمجھنا چاہئے جس کی پشت پناہی پر غیر ملکی طاقت ہو۔

سر لوئی کیوگناری نے ۲۴۔ جولائی ۱۸۷۹ء کا بل میں ریزیڈنٹ کی نئی خدمت کا جائزہ لیا۔ ۲ ستمبر کو افغانوں نے ریزیڈنسی میں گھس کر اس کو قتل کر ڈالا اور ریزیڈنسی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ انگریزی افواج دوبارہ افغانستان پر حملہ آور ہوئیں اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب خاں نے پیشتر اس کے کہ انگریزی فوج کابل پہونچنے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور سر لوئی کیوگناری کے قتل کے واقعہ سے اپنی بے تعلقی ثابت کی۔ وہ تخت و تاج سے دستبردار ہو گیا اور اپنے آپ کو پوری طرح سے انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ انگریز فوجی افسروں نے کابل پہنچ کر کیوگناری کے قتل کے واقعہ کی مکمل تحقیقات کی تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یعقوب خاں کا اس میں کوئی اشارہ شامل نہ تھا لیکن یہ کہ اس کی جانب سے بے پروائی برتی گئی۔ چنانچہ اس بنا پر اس کو قیدی کی حیثیت سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔

افغانستان میں ہر طرف نراج کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر طرف سے افغانوں کے لشکر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے اور پہاڑوں میں جا کر چھپ جاتے۔ رابرٹس کے لئے بڑا دشوار ہو گیا کہ وہ ہندوستان کے برطانوی علاقے کے ساتھ رسل و رسائل کا سلسلہ جاری رکھ سکے انگریزی فوجیں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھیں کہ جلال آباد، قندھار اور کابل پر قبضہ رکھیں۔ پورے ملک کو زیر تصرف لانا بس کی بات نہ تھی اس واسطے کہ افغانی قوم انتہائی اشتعال کی حالت میں تھی اور وہ انگریزوں کو کسی حالت میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ افغانستان میں اس وقت کسی باقاعدہ حکومت کا وجود بھی نہ تھا جس کے ساتھ انگریزی حکومت معاہدہ کر لیتی۔ بالآخر لارڈ لٹن اس نتیجہ پر پہنچا کہ افغانستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ مشرقی افغانستان کا صدر مقام قندھار قرار پایا اور وہاں کے ایک سردار شیر علی خاں کو حکومت ہند نے حکمران مان لیا۔ اسی طرح شمال مغربی افغانستان پر جس کا صدر مقام کابل ہو گا عبد الرحمٰن کو حکمران تسلیم کر لیا گیا جو امیر شیر علی سابق امیر افغانستان کا

بھتیجا تھا۔ وہ عرصے سے روسی علاقہ میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت کے خلفشار کو دیکھ کر اس نے شمالی افغانستان میں قسمت آزمائی کرنی چاہی۔ اپنے گرد حمایتوں کی ایک بڑی جماعت جمع کر لی۔ روس کے علاقے میں گیارہ سال رہنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ افغانستان کے لئے بمقابلہ روس کے انگریزوں کی دوستی زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ لیکن اس نے انگریزوں کے ساتھ اپنی دوستی کے اظہار میں بڑی احتیاط برتی تاکہ افغانی لوگ اسے مشتبہ نظروں سے نہ دیکھنے لگیں۔ چنانچہ اپنی خود نوشت سوانحعمری میں وہ لکھتا ہے۔

میں انگریزوں کے ساتھ اپنی دوستی اور موافقت کو کھلم کھلا نہیں ظاہر کر سکتا تھا اس واسطے کہ میری قوم جاہل اور متعصب ہے۔ اگر میں انگریزوں کی جانب اپنا رجحان کھلم کھلا ظاہر کرتا تو میری قوم مجھے کافر کہتی جس نے کافروں کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہے۔[1]

یہی وجہ تھی کہ امیر عبدالرحمن نے شروع سے انگریزوں کے ساتھ اپنا رویہ ایسا رکھا کہ جس سے اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو اور یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنی دانشمندی اور قوت کے بل پر سب کچھ حاصل کر رہا ہے نہ کہ انگریزوں کی مہربانی سے۔

اسی دوران میں (اپریل ۱۸۸۰ء) انگلستان میں جو عام انتخاب ہوا اس میں قدامت پسند جماعت نے لبرل جماعت کے ہاتھ سخت شکست کھائی۔ لارڈ بیکنس فیلڈ کی جگہ مسٹر گلیڈسٹن نے اپنی کابینہ بنائی جس میں لارڈ ہارڈنگ ٹن وزیر ہند کے عہدہ پر فائز تھے۔ لبرل جماعت نے پارلیمنٹ میں قدامت پسندوں کی خارجی حکمت عملی پر سخت تنقیدیں کی تھیں اور خاص کر دوسری جنگ افغانستان کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد لارڈ لٹن کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ رپن کو وائسرائے

[1] The life of Abdur Rahman, Vol. II, p. 117.

مقرر کیا گیا۔ نئے وائسرائے کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہندوستان جاکر افغانستان کے معاملے کو سلجھائے اور عبدالرحمٰن کو امیر تسلیم کرلے۔

لارڈ رپن کے ہندوستان آنے کے بعد ایوب خاں نے جو امیر شیر علی کا بیٹا تھا اور جس نے ہرات کے قرب وجوار میں زبردست لشکر جمع کرلیا تھا قندھار پر حملہ کر دیا۔ اس نے میوند کے مقام پر جنرل بروز کی انگریزی فوج کو شکست دی لیکن جنرل رابرٹس نے ایوب خاں کو قندھار پر شکست دے کر بھگا دیا۔ لارڈ لٹن نے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ شمالی افغانستان پر عبدالرحمٰن نے اپنی حکومت کا نقشہ جما لیا تھا لیکن قندھار میں شیر علیخاں کی حکومت کمزور تھی۔ لارڈ رپن افغانستان کی تقسیم کے خلاف تھا۔ اس کے ایما پر شیر علیخاں ہندوستان چلا آیا اور اس کا وظیفہ کر دیا گیا اور پورے ملک میں عبدالرحمٰن کی حکومت تسلیم کرلی گئی۔ انگریزی فوج افغانستان سے واپس بلالی گئی۔ پشین اور سی پی کے ضلعوں پر عبدالرحمٰن نے انگریزوں کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ عبدالرحمٰن نے ایوب خاں کو شکست دیکر ایران بھگا دیا اور اب پورے ملک میں اس کا کوئی بھی مدمقابل باقی نہ رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ لارڈ ہیکنس فیلڈ اور لارڈ سالبری نے ظاہر میں لارڈ لٹن کی مہم افغانستان کی تائید کی لیکن حقیقت میں وہ دونوں یہ نہیں چاہتے تھے کہ افغانستان سے جنگ کی نوبت آئے[1] ہاں ان کا منشاء یہ ضرور تھا کہ افغانستان کے معاملات میں حکومت ہند نے جو دخل نہ دینے کا اصول اختیار کیا ہے اسکو ترک کر دیا جائے اور وہ ان تمام معاملوں سے عملی طور پر باخبر رہے جو وسط ایشیا کی سیاست میں روسی اثر کے تحت رونما ہو رہے تھے اور جن سے مشرقی ممالک میں حکومتوں کا توازن متاثر ہونے کا امکان تھا۔ لارڈ سالسبری کا تو یہ خیال تھا کہ اگر لارڈ لٹن کے طرزِ عمل کی روک تھام نہ کی گئی تو وہ برطانوی سلطنت کیلئے خطرے پیدا کر دیگا لیکن اس روک تھام

[1] Roberts, History of British India, p. 451.

کی نوبت آنے سے پہلے ہی لٹن اپنی اقدامی حکمت عملی میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ جہاں سے اس کو واپس لانا مشکل تھا۔ اگر حکومت انگلستان اس کے اصول کار کو ناپسند کرتی تھی تو ضروری تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتا اس کی روک تھام کر لینی چاہیے تھی۔ ان حالات میں انگلستان کی حکومت کو دوسری جنگ افغانستان کی ذمہ داری سے بری نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خود اپنی پالیسی کی حدیں معین نہ کرسکی جن سے آگے بڑھنے کی وائسرائے کو اجازت نہ ہونی چاہیے تھی۔ دوسری جنگ افغانستان میں حکومت ہند کو جان اور مال کا جو نقصان برداشت کرنا پڑا وہ ناقابل تلافی تھا۔ آخر میں اس مہم کا کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے حکومت ہند کی سبکی کے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا خیال ناقابل عمل تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لٹن میں تدبیر پیش بینی اور اصابت رائے کی کمی تھی۔

اندرونی نظم و نسق

لارڈ لٹن کے ابتدائی عہد حکومت میں دکن اور جنوبی ہند میں سخت قحط پڑا جس کے اثرات دو سال تک جاری رہے (۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء)۔ حکومت ہند نے قحط زدہ علاقوں میں غریبوں کی جانیں بچانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی اور صوبجاتی حکومتوں کا ہاتھ بٹایا۔ حکومت ہند نے اس موقع پر یہ اصول اختیار کیا کہ غریبوں سے کام لے کر بطور معاوضہ ان کے قوت لایموت کا انتظام کیا جائے۔ لٹن نے سر رچرڈ اسٹریچی کی صدارت میں قحط کے اسباب اور حالات پر تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ اگرچہ حکومت کا یہ فرض ہے کہ قحط کے موقع پر غریبوں کی امداد کرے لیکن اس کے ساتھ حکومت کو چاہیے کہ لوگوں میں خود اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا احساس زائل نہ ہو۔ خیرات کی تقسیم سوچ سمجھ کر ہونی چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔ رپورٹ میں عام اصول پیش کر دئے گئے جنھیں ہر صوبہ اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھال سکتا تھا تاکہ مقامی حالات ہر صورت میں مدنظر رہیں۔ اس ضمن میں زراعت پیشہ

آبادی کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کی جانب حکومت کو متوجہ کیا گیا۔ حکومت کا فرض قرار دیا گیا کہ قحط کے زمانے میں خاص طور پر نجی تاجروں کو سہولتیں فراہم کرے تاکہ ان کے ذریعے سے غلہ ان علاقوں میں بھی پہنچ جائے جہاں رسل و رسائل کی دشواری ہے۔ غالباً کمیشن کی اس سفارش کو آج کل جبکہ مملکت کا اثر و نفوذ تجارتی معاملات میں بڑھ رہا ہے اچھی نظر سے دیکھا جائے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ زمانہ آزاد تجارت کے عروج کا زمانہ ہے۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ قحط زدہ علاقوں میں حکومت کے محاصل معاف کر دینے چاہئیں اور وسیع پیمانے پر تقاوی تقسیم کرنی چاہئیں جنھیں قسط وار کاشتکاروں سے وصول کیا جا سکتا ہے۔ انھیں سفارشوں کے مطابق بعد میں ۱۸۸۳ء میں "ضوابط تدارک قحط" (فیمن کوڈ) مرتب کی گئی جس میں اصول بتا دئیے گئے جن کی روشنی میں صوبے اپنے مقامی ضابطے بنا سکتے تھے اور جن میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی جا سکتی تھی۔

لٹن آزاد تجارت کے اصول کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے متعدد اشیاء پر درآمدی محصول بند کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی بندرگاہوں میں دنیا بھر سے بے کسی روک ٹوک کے مال کی درآمد ہوتی رہے لیکن اہل ہند میں وہ لوگ جو صاحب فکر تھے لٹن کے اصول کے خلاف تھے۔ خاص طور پر لنکا شائر کے کپڑے کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا اس کو اٹھا دینے سے حکومت ہند کی آمدنی متاثر ہوتی تھی۔ چنانچہ خود انگریز اعلیٰ حکام میں ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو لنکا شائر کے کپڑے پر سے محصول اٹھا دینے کو ہندوستان کے مفاد کے خلاف تصور کرتی تھی۔ دراصل لنکا شائر کے سرمایہ داروں کا قدامت پسند پارٹی میں بہت اثر تھا۔ اسی اثر کی وجہ سے جولائی ۱۸۷۷ء میں دارالعوام میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ہندوستان میں جو لنکا شائر سے کپڑا جاتا ہے اس پر محصول نہیں لگانا چاہئے اس لئے کہ اس قسم کا محصول اصول تجارت کے خلاف ہے۔ وائسرائے کی کونسل کی اکثریت کی بھی یہی رائے تھی کہ لنکا شائر کے کپڑے پر درآمدی محصول برقرار رکھنا چاہئے

لیکن لارڈ لٹن نے اپنی کونسل کی اکثریت سے اختلاف کیا اور اپنے اختیار تمیزی سے اکثریت کی رائے کے خلاف فیصلہ کیا جس کا اسے دستوری حق بہ حیثیت وائسرائے حاصل تھا۔

لارڈ میو کے عہد حکومت میں جو مالیاتی عدم مرکزیت کی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی اسے سر جان اسٹریچی نے بہ حیثیت رکن مالیات اور زیادہ فروغ دیا۔ محکمہ فوج کے متعلق بجٹ میں جو تخمینے پیش کئے گئے تھے ان میں بڑی غلطیاں نکلیں۔ چنانچہ فوجی محاسبی کے دفتر کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ آئینی سول سروس (اسٹیٹوٹری سول سروس) کا قیام لارڈ لٹن کے ایما پر ہوا اور ایسے ضابطے بنائے گئے جن کی رو سے ہندوستانیوں کے لئے اعلیٰ عہدوں کی ۱/۶ تعداد محفوظ کر دی گئی جنھیں حکومت ہند نامزد کرے گی۔

۱۸۷۸ء میں حکومت ہند نے ورنا کلر پریس ایکٹ منظور کیا جس کے بموجب کلکٹر یا مجسٹریٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید پر کسی دیسی زبان کے اخبار کے اڈیٹر سے ضمانت طلب کر سکے اگر وہ سمجھے کہ کسی شائع شدہ مضمون سے برطانوی حکومت کے خلاف یا مختلف نسلوں یا مذہبوں کے لوگوں میں آپس میں نفرت پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ مقامی زبانوں کے ہر اخبار یا رسالے میں جو مضمون شائع ہونے والا ہوتا تھا اس کا پروف پہلے حکومت کا مقرر کیا ہوا افسر دیکھ کر جب اجازت دیتا تو اس وقت وہ شائع کیا جا سکتا تھا۔ لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ قانون نے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ایک خطرناک آلۂ کار دیدیا ہے جو اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس قانون کو ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے ناپسند کیا اس لئے کہ اس میں دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کی خصوصیت تھی اور انگریزی کے اخباروں اور رسالوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ اس سے صاف نسلی امتیاز ظاہر ہوتا تھا۔ خود وائسرائے کی کونسل کے تین ارکان اس قانون کے جاری کرنے کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چند اخباروں کی بے لگامی کی وجہ سے حکومت کو اس قسم کا قانون منظور کرنے کا حق نہیں ہو سکتا جو انگریزی زبان اور دیسی زبانوں کے

اخباروں میں بے جا فرق و امتیاز کرے۔

لٹن سے پہلے کسی وائسرائے پر انگلستان میں ایسی سخت نکتہ چینی نہیں ہوئی جیسی کہ اس پر ہوئی۔ ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۸ء تک جو قحط پڑا اس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوگئیں۔ افغانستان کی لڑائی میں بھی ہزاروں جانیں کام آئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ انگلستان کی لبرل جماعت نے خاص طور پر لٹن کو ملامت کا نشانہ بنایا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ وہ رائے قایم کرنے میں اکثر بڑی جلد بازی سے کام لیتا تھا جو ایک مدبر کی شان کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و توازن سے زیادہ اس کا تخیل اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ چنانچہ بعض امور میں جو رائے اس نے قایم کی اور جس کے بموجب وہ اپنے زمانے میں کوئی عملی اقدام نہ کرسکا اس پر آئندہ حکومت ہند نے عمل کیا۔ مثلاً وہ ہندوستان کی مالیات کے لئے طلائی معیار قایم کرنا چاہتا تھا جس پر بعد میں عمل ہوا۔ وہ شمال مغربی صوبہ پنجاب سے علحدہ قایم کرنا چاہتا تھا۔ جو کرزن کے عہد حکومت میں قایم ہوا۔ وہ ہندوستانیوں کو لارڈ بنانے کے موافق تھا اور چاہتا تھا کہ والیان ریاست کی ایک انڈین پریوی کونسل بنائی جائے تاکہ وائسرائے کو مشورہ دے سکے۔ ابتک حکومت ہند کی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ دیسی ریاستیں سوائے حکومت ہند کے توسط کے کسی دوسرے ذریعہ سے نہ کسی بیرونی حکومت سے اور نہ آپس میں سیاسی بات چیت کریں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور الگ تھلگ رہیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے انگریزی حکومت اور والیان ریاست کے درمیان جو معاہدے ہوئے ان میں یہ شرط ضرور رکھی گئی کہ وہ کمپنی کے بغیر آپس میں بے تعلق رہیں۔ لارڈ لٹن پہلا حکمران ہے جس نے اس ضمن میں ایسی حکمت عملی کو رائج کرنا چاہا جس کا مقصد حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ والیان ریاست کو ملکی سیاست میں اس سے زیادہ اہمیت حاصل ہو جتنی کہ اب تک انھیں حاصل تھی یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دہلی میں لارڈ لٹن نے ایک بڑا زبردست دربار کیا جس میں ملکۂ وکٹوریہ کے قیصر ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ پارلیمنٹ نے قانون بابتہ خطابات شاہی (رائل ٹائٹلز ایکٹ) منظور کردیا تھا جس کا

مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اس امر کا اعلان کیا جائے کہ ملکہ وکٹوریہ ۱۸۵۸ء
کے بعد سے سارے ہندوستان کی مقتدر اعلیٰ ہوگئی ہیں جس میں ریاستیں بھی
شامل ہیں۔ یہ قانون انگلستان کی قدامت پسند جماعت کے شہنشاہی اصول کے
موافق تھا۔ لبرل پارٹی اس کی مخالف تھی۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں کثرت رائے
سے یہ قانون منظور ہوگیا جس کا ذکر ملکہ وکٹوریہ نے اپنی شاہی تقریر میں بھی کردیا
لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ اس قانون کے منظور ہونے کے بعد
تاج برطانیہ کے اس تعلق کی نوعیت بالکل بدل جائے گی جو والیان ریاست
اور اس کے درمیان موجود ہے۔ اب آئندہ سے گویا تاج برطانیہ ہندوستان
کے شریفوں اور امیروں کی تمناؤں، امیدوں ہمدردیوں اور مفاد سے
وابستہ سمجھا جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے طبقہ امراء اور والیان
ریاست کے جذبۂ وفاداری سے جو ملکہ کے ساتھ اُنھیں ہے سیاسی فائدہ
اٹھانا چاہئے۔ دہلی دربار کے موقع پر لٹن نے والیان ملک کی پریوی کونسل
کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن برطانوی حکومت نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور
صرف اس پر اکتفا کیا کہ بعض والیان ملک کو "مشیر ملکہ" کے لقب سے یاد
کیا جائے[1] قدامت پسندوں میں سے بعض کو اس تجویز کے منظور کرنے میں
اس لئے تامل تھا کہ کہیں یہ نہ ہو کہ والیان ریاست اپنے متفقہ فیصلوں سے
حکومت ہند کے لئے زحمت کا موجب بن جائیں۔ لیکن آئندہ کے تجربہ
سے ثابت ہوگیا کہ ان کا یہ خدشہ کوئی اصلیت نہیں رکھتا تھا۔

لٹن کو ظاہری شان وشوکت اور طمطراق کا بڑا شوق تھا۔ اس کا
خیال تھا کہ اس کے اظہار سے انگریزی وقار میں اضافہ ہوگا اور انگریزی
حکومت کا رعب داب ہندوستانی رعایا اور والیان ملک سب کو مرعوب
کردے گا۔ لیکن تعجب ہے کہ اس وقت جب کہ دہلی میں بڑے
پیمانے پر شاہی دربار کی تیاریاں ہورہی تھیں جنوبی اور مغربی ہند میں قحط کی

[1] Lady Betty Balfour, Lytton's Indian Administration, p. 109.

پر چھائیاں پڑنے لگی تھیں۔ لیکن اس پر بھی دربار ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا اور اس کے ذریعہ سے لٹن کے پیش نظر جو شہنشاہی منصوبے تھے انھیں اس نے پورا کیا۔ دہلی دربار کی کامیابی کے متعلق اس نے وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ کو جو خط لکھا اس میں وہ لکھتا ہے:

"راجاؤں اور مہاراجاؤں سے تعلقات قایم کرنے کا مجھے جو موقع ملا ان کی وجہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ اپنے خاندانی شجروں اور دستاویزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ والیان ملک کا ایک ایسا طبقہ اس ملک میں موجود ہے جس سے مفر نہیں۔ ہم قطعی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اس طبقہ کو اپنا دوست بنائیں اور پھر اس کو حکم دے کر جو چاہیں کام لیں۔ لیکن ہم نے اب تک کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جس کی بنا، پر یہ کہا جا سکے کہ ہم تاج برطانیہ کو مرکز قرار دے کر والیان ملک کے طبقہ کو اس کے گرد جمع کریں۔ ہر راجا نے جس سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا مجھ پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کا خاندان بہت قدیم ہے۔ نیز یہ کہ بالادست قوت نے وقتاً فوقتاً کس طرح اس کے خاندان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ مجھے ان سے مل کر یہ احساس ہوا کہ یہ طبقہ ان اعزاز کو جو حکومت برطانیہ انھیں عطا کرتی ہے بڑی قدر کی نظر سے دیکھتا ہے جیسے سلامی میں ایک توپ کا اضافہ یا یہ حق کہ وائسرائے باز دید کے لیے آئے یا دربار میں باعزت جگہ ملنا وغیرہ) ٹھیک اسی طرح جس طرح اگلے زمانے میں اکبر اعظم یا بادشاہ اورنگ زیب کے اعزاز و نوازش کو یہ طبقہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا"

کچھ ہی دن کے بعد لارڈ لٹن نے لارڈ سالسبری کو جو خط لکھا اس میں بھی اس نے والیان ریاست کی اہمیت اور حیثیت کی نسبت ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔

"میری دانست میں ہمارے قابل اور تجربہ کار انگریز حکام کی یہ بڑی زبردست غلطی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہندوستان میں اچھی حکومت قایم کر کے اس ملک پر پائیدار قبضہ رکھ سکتے ہیں۔ اچھی حکومت سے مراد

یہ ہے کہ رعایا کی حالت سدھاری جائے۔ عدل و انصاف بے رو رعایت برتا جائے۔ آبپاشی کے کاموں پر خوب روپیہ خرچ کیا جائے وغیرہ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا کاشتکار طبقہ شعور و احساس سے بالکل محروم ہے۔ اس میں جب کبھی تھوڑی بہت حرکت پیدا ہوتی ہے تو وہ اطاعت شعاری کے لئے۔ اپنے برطانوی محسنوں کے لئے نہیں بلکہ دیسی امیروں اور والیان ریاست کے لئے چاہے وہ ان پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کریں۔ دیسی رائے عامہ کی نمائندگی صرف بابو لوگ کرتے ہیں جنھیں ہم نے اتنی تعلیم دے دی ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے اخباروں میں باغیانہ مضمون لکھ سکیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بابوؤں کا طبقہ خود اپنے معاشری وجود کی نقیض پیش کرتا ہے۔ اسٹریا نے اپنے اطالوی صوبوں کے نظم ونسق میں جو غلطیاں کیں ان سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ دراصل اٹلی کے کسی حصے میں ایسی اچھی حکومت نہیں تھی جیسی کہ ان صوبوں میں تھی۔ اسٹریا کے ارباب حل وعقد نے الطالیہ کے کسانوں کے مفاد کی حفاظت کی اور اطالوی امیروں کے طبقے کے ساتھ بے التفاتی کا برتاؤ کیا اس لئے کہ اس طبقے سے وہ ڈرتے رہتے تھے۔ جب اطالوی امیروں کے طبقے کو اسٹریا کی حکومت کے بقا سے اپنے فائدے کی کوئی امید نہیں رہی تو اس نے اس کے خلاف سازش کی۔ ہوا یہ کہ کاشتکاروں نے یا تو ان امیروں کا ساتھ دیا یا بالکل بے تعلق بن کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے امیروں کا ساتھ اس واسطے دیا کہ وہ قومی زندگی میں ان کے رتبے کو بلند خیال کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے غیر ملکی محسنوں کے خلاف حملہ کرنے میں ان کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کا طبقۂ امرا اور یہاں کے والیان ریاست نہایت با اثر جماعت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے سامنے اس وقت سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح ہم والیان ریاست کو قابلیت کے ساتھ اور موثر طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل ہمیں فوراً بنا بنایا مل جائے

ایک طرف تو ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم والیان ریاست کی دلی وفاداری حاصل کریں جس کا انحصار اس پر ہے کہ ان کا مفاد برطانوی حکومت سے وابستہ و پیوستہ رہے اور دوسری جانب ہم یہ نہیں چاہتے کہ انھیں ایسے اختیارات اور اقتدار حاصل ہو جائے جو انھیں ہم سے بے نیاز کر دے۔ اسے ہماری خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ یہ طبقہ جذبات اور ظاہری علامتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے جو حقائق سے بہت کم مطابقت رکھتی ہیں[1]۔"

لارڈ لٹن نے اپنے ذاتی اثر کو جو والیان ریاست پر اسے حاصل تھا بعض معاہدوں کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ متعدد ریاستوں کے ساتھ نمک بنانے کے متعلق حکومت نے معاہدے کئے۔ بعض دفعہ ناجائز اثرات ڈالے گئے۔ ان معاہدوں کی رو سے اکثر ریاستوں کو نمک بنانے کے حق سے محروم کر دیا گیا اور اس کے عوض انھیں کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوا۔ بعض صورتوں میں یہ کہا گیا کہ نمک سازی پر حکومت ہند کی نگرانی قایم کر دی گئی ہے۔ مثلاً ریاست منڈی اور دوسری چھوٹی ریاستوں میں یہی طریق کار اختیار کیا گیا۔

لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ اگر والیان ریاست کا تاج برطانیہ کے ساتھ شخصی نوعیت کا تعلق قایم ہو گیا تو اس سے برطانوی شہنشاہی مقاصد کو ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ وہ اور دوسرے شہنشاہیت کے حامیوں کی طرح سمجھتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد تاج کو نئے حقوق و اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ مغل شہنشاہ کا سارا اقتدار اب تاج برطانیہ کو منتقل ہو گیا اور چونکہ ملکہ وکٹوریہ مغلیہ سلطنت کی جانشین تھیں اس واسطے انھیں خودبخود وہ سب اقتدارات حاصل ہو گئے جو مغل بادشاہوں کو حاصل تھے۔ لیکن والیان ریاست نے ان تصورات کو ہمیشہ اپنی اصلی حیثیت اور مفاد کے منافی سمجھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا۔

[1] Lady Betty Balfour, Lytton's Indian Administration, p. 109.

اٹھارواں باب

لارڈ رپن کی اصلاح پسندی

افغانستان کے معاملے کو بخیر و خوبی ختم کرنے کے بعد لارڈ رپن نے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی۔ اس کے خیالات بہت کچھ لارڈ ولیم بنٹنک سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ اسی کی طرح اس کے عہد حکومت میں بھی اہل ہند کی ترقی اور فلاح کی طرف انگریزی حکومت نے توجہ کی۔ وہ اپنے خیالات اور تصورات میں لارڈ لٹن کی بالکل ضد تھا۔ اگر ہم انگلستان میں انیسویں صدی عیسوی کے آخر کے لبرل اصول کی نمایاں مثال دیکھنا چاہیں تو وہ ہمیں رپن کی زندگی میں ملے گی۔ اس ملک میں انگریزی حکومت کا مقصد اور منشا یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے نظم و نسق کی کارگزاری بڑھائی جائے لیکن جو کچھ ہو وہ دفتر شاہی حکومت کے ایما پر ہو۔ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو اب تک جو مادی فائدے حاصل ہوئے وہ اعلیٰ درجہ کی کارگزاری رکھنے والی دفتر شاہی حکومت کے ذریعے سے ہوئے۔ دفتر شاہی حکومت نے اپنے پیش نظر یہ مقصد

کبھی نہیں رکھا کہ خود اہل ہند کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ملک کے انتظام کا بوجھ سنبھالیں۔ ظاہر ہے جس زمانے میں انگریزوں کو اس ملک میں اپنی حکومت کی بنیادوں کو وسیع اور مستحکم کرنے کی ضرورت تھی اس وقت یہ خیال ارباب اقتدار کے دماغ میں کیسے آسکتا تھا کہ اہل ہند کو نظم و نسق میں برابر کا شریک کیا جائے۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہد میں بھی بعض انسانیت کا احترام کرنے والے انگریز ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں برک نے ایک موقع پر کس قدر انصاف پسندی اور نکتہ سنجی سے کہا ہے کہ "ہندوستان میں انگریز قوم کی حیثیت ایک تربیت گاہ کی سی ہے جہاں یکے بعد دیگرے حکام کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ خود غرض عہدہ داروں کی ایک قوم ہے، یہ ایک جمہوریت یا دولت مشترکہ ہے جس میں عوام کا وجود شامل نہیں یہ ایک ایسی مملکت ہے جو صرف مجسٹریٹوں پر مشتمل ہے۔"

صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی زمانے ہی میں نہیں بلکہ بعد میں جبکہ اس ملک میں انگریزی راج کی بنیادیں خوب مضبوط ہو چکی تھیں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو کبھی منہ نہیں لگایا اور ان سے الگ تھلگ رہ کر اپنے کام سے کام رکھا۔ ہندوستانیوں کی مرضی یا منشاء معلوم کرنے کی بھی زیادہ پروا نہیں کی گئی بلکہ یہ خیال کیا گیا کہ انگریز جس چیز کو اہل ہند کیلئے اچھا سمجھتے ہیں وہی ان کے لئے اچھی ہے۔ لیکن یہ طرز عمل زیادہ عرصے تک جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ بنٹنگ نے سب سے پہلے اس کی ضرورت کو محسوس کیا کہ نظم و نسق کے اعلیٰ عہدوں کے دروازے اہل ہند کے لئے کھول دیئے جائیں۔ اس کے بعد رپن نے اہل ہند کے اس احساس کو ہمدردی کے ساتھ محسوس کیا کہ خود ان کے ملک کی حکومت میں ان کی آواز کا کوئی اثر اور کوئی وزن نہیں۔ اس نے اہل ہند کے جذبات کا تجزیہ اپنے اس مراسلہ میں کیا ہے جو ۱۸۸۲ء کے آخر میں وزیر ہند کو بھیجا تھا اور جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کی نظر کس قدر وسیع تھی۔ یہ مراسلہ ہندوستان کی دور جدید

کی تاریخ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں اس کا ترجمہ دینا ضروری ہے۔
وہ کہتا ہے۔

"اگر کوئی شخص ذرا سی توجہ کے ساتھ ان حالات کا مشاہدہ کرے جو اس ملک میں رونما ہو رہے ہیں تو اس کو کبھی اس بات کو تسلیم کرنے میں شبہہ نہ رہے گا کہ ہم ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، آزاد پریس کا بڑھتا ہوا اثر، مطلق العنانی کی جگہ قانونی حکومت کا رواج، ریلوں اور تار وغیرہ کی سہولتیں، یورپ سے آمد و رفت کی آسانیاں، مغربی تصورات کی اشاعت، یہ سب اسباب ایسے ہیں جن کا اثر لوگوں کے طبیعتوں پر پڑنا لازمی تھا۔ نئے نئے خیالات اور نئی نئی امنگیں جنم لے رہی ہیں۔ رائے عامہ کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے اور اس وقت ایک قسم کی تحریک وجود میں آرہی ہے جو آنے والے سالوں میں اور زیادہ ترقی کرے گی۔ اس صورت حالات میں چاہے کوئی حکومت ہو اس کا کام دشوار ہو جایا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک ایسی حکومت کا کام جو تقریباً مطلق العنان نوعیت رکھتی ہو۔ رفتار کو تیز کرنے میں یقیناً خطرہ ہے لیکن اس میں اس سے بھی زیادہ خطرہ ہے کہ زمانے کا ساتھ نہ دیا جاسکے اب ہمارے روبرو مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کی جو نئی روح اس ملک میں پیدا ہوئی ہے اس کو کس طرح صحیح راستے پر ڈالا جائے۔ اگرچہ یہ روح ابھی پختگی سے عاری ہے اور اس کے مظاہر میں سطحی پن پایا جاتا ہے لیکن اس کی پوری ترقی اور نشو و نما سے ملک کو جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں انھیں حاصل کرنا چاہئے اور ساتھ ہی اس کی طرف بے اعتنائی برت کر یا اسے دبانے کی کوشش کرکے اس کو اپنے لئے ایک مستقل سیاسی خطرہ نہیں بنا لینا چاہئے۔ ان امور کے پیش نظر ان تمام کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جو بادی النظر میں حقیر نظر آتی ہیں لیکن ان کے ذریعے سے ان حوصلوں اور امنگوں کے اظہار کے لئے راہ کھل جاتی ہے جو خود ہم نے اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں پیدا کی ہیں اور جو نتیجہ ہیں ہماری تعلیم کا اور اس تمدن اور مادی خوش حالی کا جو ہماری کوشش سے وجود میں آئی۔ اس طرح کی تدبیروں

سے لوگوں کے شعور کی سیاسی تربیت ہوگی جو بجائے خود ایک اعلیٰ نصب العین ہے اور اس کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ آئندہ کی ترقی کے لئے راستہ صاف ہو جائیگا۔ ہر سمجھدار آدمی اس بات کا متوقع ہوگا کہ پچاس سال کے آزاد پریس اور تیس سال کی تعلیم کی ترویج سے اسی قسم کے نتائج برآمد ہوں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف سے مغربی خیالات اس ملک میں پھیل رہے ہیں۔ ملکی رسمیں، عادتیں اور تعصبات کی دیواریں ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں۔ ریلوے اور اسی قسم کے دوسرے اثرات کی بدولت ذات پات کی بندشیں ڈھیلی پڑ رہی ہیں۔ غرضکہ ملک کے سمجھ والے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مقصدوں اور طبیعتوں میں ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جنھیں کوئی ہوشمند حکومت نظرانداز نہیں کرسکتی۔ اگر یہ حکومت چاہتی ہے کہ اس کے انتظام کا ڈھانچہ ان قوتوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے جنھیں خود اسی نے تخلیق کیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنے در و بست کو ان مقصدوں کے موافق بنالے۔ لیکن اب تک اس حکومت نے ان قوتوں کو نہ تو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوئی کوشش کی اور نہ ان کو قابو میں رکھنے کی۔ لیکن اگر بفرض محال ایسی کوئی ضرورت درپیش نہوتی جو ملکی حالات نے پیدا کردی ہے اور جن کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ ترقی اور تغیر کے زمانے کا ساتھ دیا جائے تو بھی یقیناً حالات کا اقتضا اور انگریزی حکومت کے شایان شان یہی ہے کہ ان لوگوں کی سیاسی تربیت کرے جن پر وہ حکمرانی کرتی ہے تاکہ جوں جوں زمانہ گزرے وہ اس لایق ہو جائیں کہ اپنے ملک کے انتظام میں حصہ لے سکیں۔ ہندوستان میں جو اس وقت سیاسی مقاصد پیش نظر ہیں ان میں اس سے زیادہ بلند مقصد مجھے کوئی اور نظر نہیں آتا۔ در اصل اس مقصد کو سب سے پہلے حکومت ہند کے سامنے ایک قدامت پسند (لارڈ میو) نے پیش کیا جسے لبرل جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اب لبرل اصول کے ماننے والوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ لارڈ میئو کی پالیسی کو اپنے ہاتھوں غیر موثر نہ بنادیں اور اس مقصد سے اختلاف کرنے والوں

کی بے اعتنائی کے زیر اثر اس کو ختم نہ کر ڈالیں جو اس کی حکیمانہ دور اندیشی اور اس کے معنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حکومت ہند کے سامنے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایک ان کی حکمت عملی ہے جنھوں نے اس ملک میں آزاد پریس قایم کیا، تعلیم کی اشاعت کی، اہل ہند کو پبلک سروس میں زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کی کوشش کی اور حکومت خود اختیاری کی ہمت افزائی کی۔ دوسری حکمت عملی ان کی ہے جو پریس کی آزادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جنھیں تعلیم کی ترقی میں اپنے لئے خطرات نظر آتے ہیں اور جو ہر اس اقدام کو جس کا منشاء ہندوستانیوں کو اپنے امور کے انتظام میں زیادہ اختیارات دینا ہو خوف اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہیں ہمیں ان دونوں اصول کار میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ ایک ترقی کی طرف لے جانے والا ہے اور دوسرا جبر اور مطلق العنانی کی طرف۔ لارڈ لٹن نے ثانی الذکر کو پسند کیا اور میں اول الذکر کو ترجیح دیتا ہوں۔ دونوں کے نتیجوں سے ان اصول کار کی اچھائی، برائی کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔[1]

لارڈ رپن ہندوستان کی انگریزی حکومت میں لبرل رجحانوں کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں جبکہ لارڈ میئو کی رائج کی ہوئی پنج سالہ مالیاتی سبیل بندی کا وقت آیا تو رپن نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور صوبجاتی حکومتوں سے مقامی حکومت خود اختیاری کی تجویزوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے یہ واضح کیا کہ یہ کافی نہیں کہ مرکزی حکومت سے صوبوں کو مالیاتی اختیار تحویل کئے جائیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ صوبے مقامی جماعتوں کو اختیارات تحویل کریں۔ اکثر صوبجاتی حکومتوں نے رپن کے خیالات کی تائید کی۔ چنانچہ ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء حکومت ہند نے مقامی حکومت خود اختیاری کے متعلق اپنی تجویز منظور کی جس کا منشاء یہ تھا کہ چند عام اصول کا تعین کر دیا جائے اور باقی عملی تفصیلوں کو صوبجاتی حکومتیں اپنے

---

[1] Wolf, Life of Lord Ripon, Vol. II, p. 92-94.

اپنے حالات کے مدنظر پر کریں۔ مقامی بورڈوں اور بلدیات کے ارکان کے انتخاب یا نامزدگی کے متعلق بھی صوبجاتی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے مخصوص حالات میں جو اصول بھی مناسب خیال کریں اس پر عمل کریں رپن چاہتا تھا کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے ادارے قایم کرنے سے لوگوں کے سیاسی شعور کی تربیت ہو اور ہندوستانیوں میں جو قابل اور ہوشمند افراد ہیں انھیں ملکی نظم ونسق کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ممکن ہے شروع شروع میں ضلع کے افسراعلیٰ کو مقامی بورڈوں اور بلدیات کی نگرانی کرنی پڑے لیکن کچھ عرصے بعد اس کی نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہنی چاہئے۔ اگر اہل ہند کے قابل لوگوں کو آزادی عمل حاصل نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ وہ مقامی اداروں میں اتنی دلچسپی نہیں لیں گے جتنی کہ انھیں لینی چاہئے۔ رپن کے پیش نظر یہ نہیں تھا کہ وہ مغربی طرز کے جمہوری ادارے ہندوستان میں قایم کرے بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس ملک میں قدیم سے پنچایت کا جو طریقہ رائج تھا اسے زندہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کے متعلق ایک خط میں ذکر بھی کیا ہے[1]۔ یہ بات اس نے اس واسطے صاف کردی کہ انگلستان میں اور ہندوستان میں اس کے مخالف اس کی اسکیم کی نسبت اس قسم کے خدشے ظاہر کر رہے تھے۔ بعض قدامت پسند انگریزوں کا خیال تھا کہ رپن اصلاح کے میدان میں بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کا ساتھ ہندوستانیوں کی زندگی کی سست رفتاری نہیں دے سکے گی۔ لبرل اصول کا اطلاق خود انگلستان کی زندگی میں کافی تجربے کے بعد ممکن ہوا ہے۔ ان اصولوں کو ہندوستان کی سرزمین میں باسرسبز ہونے کے لئے ضرور ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی زندگی سیاسی تجربوں کے وسیع میدان سے گزرے۔ بعض کو یہ اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کے نمایندوں کو نظم ونسق میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کی کارگزاری کا معیار گر جائے گا جس کی رپن نے پیش بینی نہیں کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ

---

[1] Wolf, Ibid., p. 100.

اس نے اس کی اچھی طرح پیش بینی کی تھی۔ حکومت ہند نے مقامی حکومت خود اختیاری کی جو تجویز منظور کی تھی اس میں اس کی نسبت اشارہ موجود تھا۔ اس تجویز کے متن میں تھا کہ وہ نظم ونسق کی کارگزاری بڑھانا اس تجویز کا مقصد نہیں ہے بلکہ عوام کی سیاسی تربیت۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اس امر کا یقین ہے کہ جوں جوں مقامی حالات کے علم میں اضافہ ہوگا اور مقامی مفاد کو پیش نظر رکھا جائے گا اس کا نتیجہ مقامی نظم ونسق کی شکل میں ظاہر ہونا لازمی ہے۔ لارڈ رپن کا یہ خیال تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں لبرل اصلاحیں نافذ کی جائیں لیکن ہندوستان کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بہتر ہوگا کہ پہلے مقامی اداروں میں ہندوستانیوں کو سیاسی تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاسی تجربے کی بدولت جو غلطیاں ہونگی وہ مقامی نوعیت کی ہوں گی جن سے پورے ملک کے نظم ونسق کو زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔

حکومت ہند کی تجویز کے بموجب تمام ہندوستان میں مجالس ضلع اور بلدیات کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ مجوزہ قاعدوں کی رو سے ان مجلسوں کی تشکیل میں نمایندہ عنصر کو داخل کیا گیا اور غیر سرکاری ارکان کی اکثریت رکھی گئی۔ سرکاری طور پر نامزد شدہ ارکان کی تعداد کسی حالت میں بھی $\frac{1}{3}$ سے زاید نہ ہوگی۔ مجالس ضلع اور بلدیات کی صدارت غیر سرکاری ارکان کرسکیں گے۔ بلدیات اور مجالس ضلع کو مقامی نوعیت کے محصول لگانے اور انھیں وصول کرنے کا اختیار ہوگا۔ جہاں غیر سرکاری ارکان میں مجلس ضلع کی صدارت کے لئے کوئی موزوں شخص موجود نہ ہو تو حاکم ضلع (مجسٹریٹ و کلکٹر) صدارت کے فرایض انجام دے گا۔ حاکم ضلع کو اس کا اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ اس امر کا تعین کرے کہ موزوں شخص موجود ہے یا نہیں اور اس ضمن میں اس کی رائے قطعی ہوگی۔ حاکم ضلع کی نگرانی میں مقامی مجالس ضلع بعض مخصوص مدوں کے تحت محصول لگانے کی مجاز ہوں گی اور قرض بھی لے سکیں گی۔ حاکم ضلع سے توقع کی جائے گی کہ وہ تاامکان مجلس ضلع کے فیصلوں میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرے سوائے ایسے حالات کے

جیسے بلدیاتی ملکیت کی فروخت، قرضے لینا یا ایسے محصول لگانا جن کی مجلس کو اجازت نہیں ہے۔ حکومت ہند کی تجویز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی نظم ونسق میں لبرل اصول کی کارفرمائی مدنظر ہے۔ رپن چاہتا تھا کہ مجالس ضلع اور بلدیات کے غیر سرکاری ارکان یہ محسوس کریں کہ ان کے ہاتھ میں انتظامی قوت دیگئی ہے اور انھیں اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہے۔ جہاں حالات اجازت دیں وہاں مجالس ضلع کے صدر غیر سرکاری ارکان بھی ہو سکتے ہیں جنھیں مجلس نے کثرت رائے سے منتخب کیا ہو۔ اگر حاکم ضلع مجلس ضلع کا صدر ہوگا تو اسکو اس کی کارروائیوں میں رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔ نظم ونسق کی عام کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی صراحت کردیگئی کہ اگر کسی بلدیہ میں بدانتظامی پھیلے گی اور ارکان اپنے فرائض کا احساس نہیں کریں گے تو حکومت اس بلدیہ کو منسوخ کر سکتی ہے۔

عام طور پر حکومت ہند کی مقامی خود اختیاری کی تجویز کا ہندوستان میں خیر مقدم کیا گیا۔ سوائے حکومت بمبئی کے دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے رپن کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی۔ حکومت بمبئی شروع سے اس قسم کی اصلاحوں کے خلاف تھی اور انھیں قبل از وقت سمجھتی تھی۔[1] اکثر صوبوں کی مقامی مجالس مقننہ نے حکومت ہند کی تجویز کے بموجب مقامی حکومت خود اختیاری کو وسعت دینے کی بابت قوانین بنائے۔

رپن کے عہد حکومت کا دوسرا کارنامہ ورناکلر پریس ایکٹ کا منسوخ کرنا ہے جسے لارڈ لٹن کے زمانے میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس قانون کے بنانے میں جو نسلی فرق اور امتیاز برتا گیا تھا وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے جذبات کو مجروح کرنے والا تھا۔ اگر کوئی ایسا عام قانون اس ضمن میں وضع کیا جاتا جس کا اطلاق انگریزی زبان اور دیسی زبانوں کے سب اخباروں پر ہوتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن صرف دیسی زبانوں کے اخباروں کی قانون میں تخصیص کرنا ہندوستانیو

[1] Wolf, Ibid., p. 105.

کو سخت ناگوار ہوا۔ خود پارلیمنٹ میں اس قانون کی لبرل جماعت کی طرف سے سخت مخالفت کی گئی تھی اس لئے کہ اس کی رو سے کسی عدالت کے خلاف مرافعہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو لبرل اصول کے خلاف تھا۔ رپن کے وائسرائے ہونے کے بعد وزیر ہند ہارٹنگٹن نے ۲۸ جنوری ۱۸۸۱ء کو ایک سرکاری مراسلہ روانہ کیا جس میں ورناکلر پریس ایکٹ کو منسوخ کرنے اور معمولی قانون کے ذریعے باغیانہ مضامین شائع کرنے والے اخباروں اور رسالوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی ہدایت کی گئی خاص طور پر انگلستان کا وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن اس قانون کو جلد منسوخ کرنے کا حامی تھا۔ چنانچہ اس قانون کو حکومت ہند نے منسوخ قرار دیا اور دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کے خلاف جو امتیاز برتا جاتا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔

رپن کی تعلیمی حکمت عملی کا محرک اُس اصول میں ملتا ہے جس کی بناء پر اس نے مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کو ہندوستان میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ رپن کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ جب تک عام لوگوں میں ابتدائی تعلیم کی اشاعت نہ ہوگی اس وقت تک مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں سے اہل ملک کو اتنا فائدہ نہیں پہنچے گا جتنا کہ پہنچنا چاہیئے۔ اس وقت جو تعلیمی نظام ہندوستان میں رائج تھا وہ بڑی حد تک سر چارلس وڈ کے اس مراسلہ پر مبنی تھا جو ۱۸۵۴ء میں بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس میں تھوڑی بہت ترمیمیں ہوئیں۔ اس نظام تعلیم میں اعلیٰ اور وسطانی تعلیم پر زیادہ توجہ کی گئی تھی۔ ابتدائی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی چنانچہ رپن نے اس ضمن میں وزیر ہند کو جو مراسلہ لکھا اس میں یہ امر واضح کیا کہ صرف وسطانی اور اعلیٰ تعلیم پر توجہ کرنے سے یہ سیاسی خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ایسے عوام کو خطاب کرے گا جو تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوں گے[1] رپن کی تجویز یہ تھی کہ انگریزی حکومت

ـــــــــــــــــــ

[1] Letter to Hartington, June 3, 1881 (Wolf, II, p. 114).

کو چاہیئے کہ عوام کی ابتدائی تعلیم کو سرکاری اثر سے متاثر نہ ہونے دے۔ بجائے اس کے کہ حکومت کی جانب سے ابتدائی تعلیم کے لئے براہ راست مدرسے قایم کئے جائیں حکومت کو چاہیئے کہ اس قسم کے مدرسوں کو جو مقامی اداروں نے قایم کئے ہوں یا نجی ہوں امداد دے تاکہ وہ اچھی طرح سے چل سکیں۔ حکومت کے وسیلوں کے سوا ذاتی انفرادی امداد کے حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ ان تجویزوں پر غور کرنے کیلئے اکتوبر ۱۸۸۲ء میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا گیا۔ ایک سال کے بعد اس کمیشن کی سفارشوں کو حکومت ہند نے قبول کرلیا اور صوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی سفارش کی۔ رپن کا عہد حکومت اس کے تھوڑے عرصے کے بعد ختم ہو گیا۔ صوبوں نے جیسا کہ چاہیئے حکومت ہند کی سفارشوں پر توجہ نہیں کی اور عوام کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ لیکن رپن نے اس ضمن میں جو کوششیں کیں ان سے کم از کم یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ اس کے عملی محرکات کیا تھے

معاشرتی اصلاح کے ضمن میں رپن نے کارخانوں کے مزدوروں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ ۱۸۸۱ء میں حکومت ہند نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ان بچوں کیلئے محنت کے اوقات زیادہ سے زیادہ ۹ گھنٹے مقرر کئے گئے جنکی عمر سات اور ۱۲ سال کے درمیان ہو۔ کارخانوں کے معائنہ کے لئے انسپکٹروں کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلیں کہ قانون پر عمل ہو رہا ہے۔ جن کارخانوں میں ایسی مشین استعمال کی جاتی ہے جس سے جان کا خطرہ ہو سکتا ہے اسکے گرد احاطہ بندی لازمی قرار دی گئی تاکہ ناواقف مزدور اور بچے نقصان نہ اٹھائیں۔

میسور کی حوالگی رپن نے اپنی لبرل حکمت عملی کو صرف برطانوی ہند تک محدود نہیں رکھا بلکہ والیان ریاست کے ساتھ حکومت ہند کے تعلقات میں بھی اس اصول کو برتنے کی کوشش کی۔

لارڈ ولیم بنٹنک نے میسور کے راج کی بد انتظامیوں کی وجہ سے ۱۸۳۱ء میں اس ریاست کو حکومت ہند کے تحت لے لیا تھا اور یہاں کا پورا دست انگریز افسروں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اگرچہ بعد میں بنٹنک کو اس بات کا یقین ہو گیا

کہ میسور کے نظم ونسق کے متعلق اسکو جو رپورٹیں دی گئی تھیں وہ درست نہ تھیں اور یہ کہ ریاست کو برطانوی حکومت کے تحت لینے کا اہم اقدام حق بجانب نہ تھا۔ چنانچہ بنٹنک چاہتا تھا کہ ریاست راجا کو واپس دیدی جائے لیکن برطانوی حکومت اس پر آمادہ نہ ہوئی برطرف شدہ راجا کا ۱۸۶۷ء میں انتقال ہوگیا۔ اب برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اسکا متبنی لڑکا جب بالغ ہوجائے تو اسکو راج گدی دیدی جائے ۱۸۸۱ء میں یہ لڑکا سن شعور کو پہنچا تو رپن نے برطانوی حکومت کے وعدے کے مطابق اسکو میسور کا حکمران تسلیم کرلیا۔ لیکن ان شرطوں کے ساتھ کہ اس وقت تک جو قوانین میسور کے دروبست میں نافذ ہو چکے تھے وہ علی حالہ برقرار رکھے جائیں گے۔ نظام حکومت میں کوئی اہم تبدیلی بغیر گورنر جنرل کی مرضی کے نہیں کی جائے گی اور اراضی کا جو بندوبست کر دیا گیا ہے وہ جوں کا توں قایم رہے گا۔ جو انگریزی فوجی چھاؤنیاں میسور میں ہیں وہ موجود رہیں گی اور اگر ان کے علاوہ ریاست کے دوسرے مقامات میں چھاؤنیاں قایم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو حکومت ہند کو اختیار ہوگا کہ انھیں اپنے منشاء کے موافق قایم کرے جن کے لئے حکومت میسور علاقے فراہم کرے گی۔ میسور میں برطانوی سکہ رائج رہے گا۔ ریل اور تار برقی کے قیام کے لئے جو زمین درکار ہوگی وہ دربار میسور حکومت ہند کو بے معاوضہ دے گا۔ دربار میسور حکومت ہند کو سالانہ ۳۵ لاکھ روپیے پیش کش کے طور پر پیش کردیگا جس کے عوض حکومت ہند ریاست کی دفاع کی ذمہ دار ہوگی۔ مہاراجا میسور کے لئے یہ بھی لازمی گردانا گیا کہ ریاست کے مالی اور عدالتی انتظام کے متعلق حکومت ہند جو ضروری مشورے وقتاً فوقتاً دے انھیں عملی جامہ پہنائے تاکہ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہو۔ اگرچہ اس موقع پر رپن نے یہ بہت اچھا کیا کہ ریاست میسور کو اس کے جائز وارث کے سپرد کر دیا لیکن جو شرطیں لگائیں وہ حق بجانب نہیں کہی جا سکتیں۔ ان سے ایک ایسی نظیر قایم ہوگئی جس سے دوسری ریاستوں کے حقوق پر حکومت کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کی زد پڑنے لگی۔[1]

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 77-84.

البرٹ بل

۱۸۸۳ء میں حکومت ہند کے خلاف یورپین آبادی نے سخت احتجاج شروع کیا جس نے ایک زبردست شورش کی شکل اختیار کرلی۔ ہوا یہ کہ مرکزی مجلس مقننہ میں ایک مسودہ قانون پیش تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس نسلی امتیاز کو دور کیا جائے جو ہندوستانی ججوں اور مجسٹریٹوں کے خلاف اب تک روا رکھا گیا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں تعزیرات ہند میں یہ دفعہ شامل کی گئی کہ ضلعوں میں کوئی ہندوستانی مجسٹریٹ یا سشن جج کسی یورپین کے مقدمہ کی سماعت کا مجاز نہ ہوگا حالانکہ پریسی ڈنسی ٹاونز (کلکتہ، مدراس اور بمبئی) کی حدوں میں ہندوستانی مجسٹریٹوں اور سشن ججوں کو یورپینوں کے مقدموں کے حق سماعت سے محروم نہیں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی آئی۔ سی۔ ایس کے ارکان اپنے سفید فام ہم عصروں کے مقابلے میں اس فرق و امتیاز کو اپنے لئے ایک طرح کی ذلت سمجھتے تھے۔ رپن کے عہد کے شروع ہی میں مہاراجہ سرجو تندرا ناتھ موہن ٹگور نے جو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن تھے اس مسئلہ کو کونسل میں اٹھانا چاہا۔ لیکن رپن کے کہنے پر اسوقت انھوں نے اس مسئلہ پر بحث ملتوی کردی۔ رپن نے اس بات میں صوبجاتی حکومتوں سے دریافت کیا جنھوں نے سوائے کورگ کے استثناء کے اس خیال کی تائید کی کہ انگریز اور ہندوستانی حکام کے اختیارات میں جو نازیبا امتیاز برتا جاتا ہے اس کا خاتمہ کردیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد سرکورٹنی البرٹ نے کونسل میں اپنا مسودہ پیش کیا تاکہ تعزیرات ہند میں ترمیم کردی جائے اور انگریز اور ہندوستانی عہدہ داروں میں قانونی امتیاز مٹ جائے اور ایک ہی سروس کے ارکان کی حیثیت سے ان کے رتبوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اس ترمیم کو پیش کرتے وقت یورپین باشندوں کو اطمینان دلانے کے لئے اس کی صراحت کردی گئی کہ ہندوستانی کووننٹڈ سروس کے افراد کے انتخاب میں انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے اور پھر انھیں ٹریننگ میں اتنے عرصے تک رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں عملی تجربے کے ساتھ رائے کی پختگی پیدا ہوجائے۔ ان سب امور سے

یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ یہ ہندوستانی عہدہ دار اپنے اختیارات کو مناسب طریقے پر استعمال کریں گے اور یورپین باشندوں کو ان کے خلاف شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ صرف آسام کے لفٹیننٹ گورنر سر۔سی۔ الیٹ نے حکومت ہند کی تجویز پر شبہہ ظاہر کیا اور بتلایا کہ ہندوستانی جج ممکن ہے نسلی تعصب برتیں لیکن اس نے کوئی ایسا اندیشہ نہیں ظاہر کیا کہ اگر اس ترمیم کو منظور کیا گیا تو ملک کے طول و عرض میں احتجاج کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ خود رپن کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ اس مسودہ قانون کے خلاف یورپین باشندے اس قدر چراغ پا ہوں گے۔ جب مسودہ قانون کے متعلق وزیر ہند کو مطلع کیا گیا تو اس نے بھی اس کی منظوری صادر کردی۔

اب انگلو انڈین اخباروں نے رپن اور اس کی تجویزوں کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ کلکتہ میں انگلو انڈینز اور یورپینوں کی ایک انجمن قایم کی گئی تاکہ مسودہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے جلسے کئے جائیں اور انگلستان میں رائے عامہ کو اس کے چھپے ہوئے اثرات سے واقف کرایا جائے۔ اس انجمن کے جواب میں ہندوستانیوں نے مسودہ قانون کی موافقت میں دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع کرانے شروع کئے اور جلسے منعقد کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اینگلو انڈینوں اور ہندوستانیوں کے درمیان سخت نسلی نفرت پھیلنے لگی جس کے اثرات بہت بعد تک رہے۔ انگریز پلانٹر نے خاص طور پر البرٹ بل کی مخالفت میں حصہ لیا اور اس کی مخالفت میں جو تحریک پیدا ہوئی اس کی مالی حمایت اس طبقے نے کی۔ ان کا ایک وفد انگلستان پہنچا تاکہ وہاں اخباروں کو روپیہ دیکر مضامین لکھوائے۔ انگلستان کے اخباروں میں اس موضوع پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا خود وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن ذرا گھبرا گئے اور انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں قدامت پسند جماعت اس مسئلہ سے پورا فائدہ اٹھاکر ان کی پارٹی کو نقصان نہ پہنچا دے۔ چنانچہ اس کے ایما پر رپن کو لکھا گیا کہ وہ مسودہ قانون میں ایسی تبدیلیاں کردے

گئیں جن کی رو سے یورپین ملزمین کو یہ حق دے دیا گیا کہ اگر ان کا مقدمہ کسی ہندوستانی جج کے روبرو پیش ہو تو وہ ایسی جیوری کا مطالبہ کر سکتے ہیں جس کے نصف ارکان ان کی قومیت کے افراد پر مشتمل ہوں۔ غرضکہ یورپین لوگوں کو عدالت کے روبرو جو امتیازی حقوق حاصل تھے وہ برقرار رہے۔

البرٹ بل میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ اگر کوئی اقلیت منظم ہو کر کوشش کرے تو وہ حکومت کو اپنے مطالبوں کے آگے جھکنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ہندوستان کے سیاست دانوں پر تنظیم کی اہمیت واضح ہوئی اور انھوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ان کی بھی کوئی منظم جماعت ہونی چاہئے جو حکومت کے روبرو ان کی ضرورتوں اور شکایتوں کو پیش کر سکے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے البرٹ ہال میں ایک سیاسی کانفرنس کی گئی جس میں سر ندرناتھ بنرجی اور اے۔ ایم بوس نے شرکت کی اور یہی دونوں اس کی روح رواں تھے۔ کانفرنس تین دن تک جاری رہی۔ ہندوستانی سیاست دانوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور ایک بین الہندی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا جو برطانوی حکومت کے سامنے ہندوستان کے مطالبے پیش کر سکے۔ اسی کانفرنس کے زیر اثر جنوری ۱۸۸۵ء میں بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن قایم ہوا جس کے روح رواں فیروز شاہ مہتا، تلک اور طبیب جی تھے۔ اسی طرح مدراس میں مہاجن سبھا وجود میں آئی۔ غرضکہ ملک کے ان حصوں میں جہاں سیاسی شعور تھوڑا بہت پیدا ہو چکا تھا سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ بنگال کے اینگلو انڈینز کی سیاسی تنظیم سے تعلیم یافتہ ہندوستانی کافی متاثر ہوئے اور خاص طور پر ان کی احتجاجی ڈور دھوپ نے انھیں متاثر کیا جس کے نتیجہ کے طور پر لارڈ رپن کو البرٹ بل میں تبدیلیاں کرنی پڑیں جو اس طبقہ کے لئے قابل اطمینان تھیں۔

اگرچہ اینگلو انڈینوں اور یورپین طبقے میں لارڈ رپن کو مقبولیت حاصل

نہ تھی لیکن ہندوستانی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۸۴ء میں جب وہ مستعفی ہو کر انگلستان جا رہا تھا ہندوستانیوں نے اپنی نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے بڑے مظاہرے کئے۔ رپن سے پہلے اب تک کسی گورنر جنرل نے ہندوستانیوں کے دل میں گھر نہیں کیا تھا۔ رپن کو ہندوستانی اپنا ہمدرد اور سچا دوست سمجھتے تھے اور وہ یقیناً ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے۔
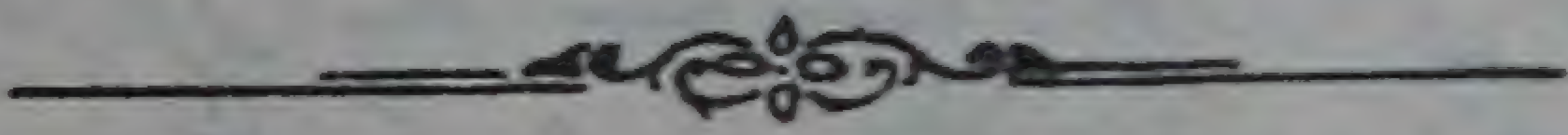
انیسواں باب

ڈفرن، لینسڈون اور الجن کے عہد حکومت میں قومی شعور کی ابتدا

لارڈ رپن کے استعفے کے بعد لارڈ ڈفرن اس کا جانشیں ہوا۔ ہندوستان آنے سے پہلے اس کو عملی سیاست کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ نائب وزیر ہند اور کناڈا کی گورنر جنرلی کے عہدہ پر رہ چکا تھا اور سینٹ پٹرز برگ اور قسطنطنیہ میں انگریزی حکومت کی سفارت کے فرائض بڑی خوبی سے ادا کر چکا تھا۔ روس میں رہنے سے اس کو ملک کی خارجی پالیسی اور ارادوں سے واقفیت حاصل ہوئی جن کی زد ایک طرح سے ہندوستان پر بھی پڑتی تھی۔ لارڈ ڈفرن اعلیٰ درجے کا خطیب اور ماہر سیاست تھا۔ البرٹ بل سے ہندوستان میں جو ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے ڈفرن سے بہتر شخص انگلستان میں نہیں مل سکتا تھا۔ ایک طرف ہندوستان کے انگریز باشندوں کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گئی تھی اور دوسری طرف تعلیم یافتہ ہندوستانی یہ محسوس

کر رہے تھے کہ انھیں خود اپنے ملک کے در و بست میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔ ڈفرن نے کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے ہر جماعت کو مطمین کرنے کی کوشش کرے۔

روس کا خطرہ

ڈفرن کے عہد میں وسط ایشیا اور افغانستان کی سیاست نے پھر ایک مرتبہ حکومت ہند کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ روس، افغانستان کی شمالی مغربی سرحد کی طرف انھیں مقصدوں سے آگے بڑھ رہا تھا جن کے زیر اثر حکومت ہند نے درۂ بولان اور درۂ خیبر پر اپنا قبضہ ضروری سمجھا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں روس نے شہر مرو پر قبضہ کر لیا جو افغانستان کی سرحد سے ۵۰ میل پر واقع تھا۔ انگلستان میں اس شہر کی فوجی اور جغرافی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا تھا اور اس پر روس کے قبضہ کو تشویش نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ روس اور انگلستان کے دفاتر خارجہ میں کشیدگی بڑھنے کے خوف سے دونوں حکومتوں نے یہ تجویز منظور کر لی کہ افغانستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کے تعین کے لئے ایک مشترک کمیشن مقرر کر دیا جائے تاکہ آئندہ سرحدی جھگڑے نہ پیدا ہوں۔ لارڈ ڈفرن نے امیر عبدالرحمٰن خاں سے راولپنڈی میں ملاقات کی اور اس پر آمادہ کر لیا کہ کمیشن جو فیصلہ کرے اسے وہ مان لیں۔ امیر صاحب کی ملاقات سے ڈفرن بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے ان کی قابلیت، فراست اور تدبر کی بڑی تعریف کی۔ حکومت ہند نے وعدہ کیا کہ اگر افغانستان پر روس کا حملہ ہوا تو ہتھیاروں اور فوج سے مدد کی جائے گی۔ اس کمیشن میں روس، انگلستان اور افغانستان کی حکومتوں کے نامزد شدہ ارکان شریک تھے۔ اس کے برطانوی رکن سر پیٹر لمڈن نے محسوس کیا کہ روس اور افغانستان کے سیاسی تعلقات میں کافی تلخی پیدا ہو چکی ہے اور دونوں حکومتوں کا خیال ہے کہ ان مقاموں پر جن پر جھگڑا ہے پہلے ہی سے اپنا قبضہ جمانا چاہئے تاکہ کمیشن کی تحقیق سے پہلے واقعات تکمیل شدہ امور کی صورت میں سامنے آئیں۔ گویا کسی مقام پر قبضہ کرنا اپنے حق کو منوانے کا بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ ایک تندخو روسی فوجی افسر نے جس کا نام جنرل کوماروف تھا افغانی فوج کو پنجدہ کے مقام سے بے دخل کر کے

خود قبضہ کر لیا۔ اب تک پنجدہ پر افغانستان کا قبضہ چلا آتا تھا۔ پنجدہ سے ہرات ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر تھا جو فوجی نقل و حرکت کے لحاظ سے نہایت اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ روس کی اس جارحانہ پیشقدمی کا یہ اثر ہوا کہ حکومت ہند کو تشویش ہوئی کہ کہیں اسی طرح آہستہ آہستہ روس پورے افغانستان کو نہ ہڑپ کر جائے یہ صورت حالات ایسی تھی جس سے وسط ایشیا کی سیاست کے توازن میں خلل پیدا ہونا لازمی تھا۔ حکومت ہند نے شمال مغربی سرحد پر فوجیں جمع کرنے کا حکم دے دیا۔ انگلستان میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ روس سے لڑائی ہوئے بغیر نہیں بچ سکتی۔ قدامت پسند جماعت نے پارلیمنٹ میں لبرل حکومت کی بے عملی پر سخت نکتہ چینی کی۔ گلیڈسٹن کی لبرل وزارت اپنی خارجی حکمت عملی کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ادھر سوڈان میں گورڈن کے مارے جانے اور مہدی کی تحریک نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ آئرستان کے مسئلہ میں بھی لبرل وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن نے ہاؤس آف کامنز میں صاف طور پر تسلیم کیا کہ صورت حالات سخت تشویش ناک ہے چنانچہ اس کی تجویز پر ہاؤس آف کامنز نے ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ کی منظوری دی تاکہ اگر کوئی اچانک صورت پیش آجائے تو عہدہ برآ ہونا ممکن ہو اور فوراً فوجوں کو نقل و حرکت میں لایا جا سکے۔ غرضکہ روس اور انگلستان دونوں روز بروز ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمٰن خاں نے اس موقع پر بڑی دانشمندی اور تحمل سے کام لیا۔ امیر صاحب جانتے تھے کہ اگر روس اور انگلستان میں لڑائی چھڑی تو تباہی ان کے ملک کی ہوگی۔ امیر صاحب اس پر آمادہ ہو گئے کہ پنجدہ کی بجائے سرحدی مقام ذوالفقار حکومت افغانستان کو دے دیا جائے۔ اس سمجھوتے سے ایک بڑی مصیبت سر سے ٹل گئی۔ اپنی خود نوشت سوانحعمری میں امیر افغانستان نے اپنے ملک کی حالت اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کی ہے۔

"میرا ملک ایک بکرے کے مثل ہے جس پر ایک طرف شیر کی اور دوسری طرف ریچھ کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ خداوندی مدد کے بغیر بہت عرصے تک

شکار (یعنی ملک افغانستان) کا بچنا مشکل ہے[1]

غرضکہ امیر عبدالرحمن خاں کی دانائی اور سمجھوتے کی وجہ سے روس اور انگلستان میں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ سرحدی کمیشن نے جو پہلے سے اپنے اجلاس کر رہا تھا یہ فیصلہ کر دیا کہ پنجدہ روس کو دے دیا جائے اور اس کے بدلے میں افغانستان کا ذوالفقار کے شہر پر قبضہ ہو جائے۔ حکومت انگلستان نے سر پیٹر لمڈن کے بجائے سر ویسٹ رج وے کو سرحدی کمیشن کی تحقیقات کے لئے رکن نامزد کیا۔ روس، انگلستان اور افغانستان کے نامزد شدہ ارکان نے بڑی محنت اور جانفشانی سے افغانستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کا تعین کر دیا جسے متعلقہ ملکوں نے تسلیم کر لیا اور جولائی ۱۸۸۷ء میں سینٹ پیٹرزبرگ میں اس ضمن میں ایک معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ یہ سرحد اس طور پر مقرر کی گئی کہ امیر افغانستان کا کوئی مالی نقصان نہ ہوا اور نہ ان کے ملک کا کوئی علاقہ ان سے چھینا گیا۔ اس سرحد کے تعین سے یہ فائدہ ہوا کہ روس اور انگلستان نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر ایک دوسرے سے بجائے جنگ کے سیاست کاری کے مدبرانہ طریقہ سے منوا لئے اور افغانستان پر جو دونوں طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی کم ہو گیا۔

امپیریل سروس ٹروپس روس سے جنگ کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت ہند نے اپنی فوج کی تعداد مستقل طور پر بڑھا دی جس کی وجہ سے تقریباً تین کروڑ روپے سالانہ کا خزانہ پر بار پڑا۔ اس کے علاوہ ڈفرن کی دعوت پر والیان ریاست نے بھی حکومت ہند کی رقمی امداد کی تاکہ انگریزی حکومت کو سرحدی استحکامات پر جو روپیہ خرچ کرنا پڑے اس میں وہ بھی شریک ہوں۔ اعلیحضرت مرحوم میر محبوب علیخاں آصف سادس نے انگریزی حکومت کا ہاتھ بٹانے کیلئے ساٹھ لاکھ روپے عنایت فرمائے تاکہ اس رقم کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے کام میں صرف کیا جائے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی پٹیالہ والی تقریر میں اعلیحضرت مرحوم کا اس ضمن میں شکریہ ادا کیا اور دوسرے والیان ریاست کو انکی پیروی کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ سب بھی حکومت برطانیہ کی حفاظت ملک کی ذمہ داری

ل 1. Roberts, History of British India, p. 475.

ہیں برابر کے شریک ہوں۔ بعد میں لارڈ ڈفرن نے اعلیحضرت مرحوم سے درخواست کی کہ مشترک مدافعت کی اغراض کے لئے وہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے اندر سواروں کا ایک دستہ مرتب کریں جس کا کل خرچ سرکار عالی کے ذمے ہو اور وہ امپریل سروس ٹروپس کے نام سے مشہور ہو۔ اس فوج کو جدید ترین طریقے پر فن جنگ کی تعلیم دی جائے اور جب کبھی برٹش گورنمنٹ کو ضرورت ہو تو اس کو استعمال کیا جا سکے۔ اس ساٹھ لاکھ روپیے سے جو اعلیحضرت مرحوم نے حکومت ہند کو تحفے کے طور پر دئیے تھے امپریل سروس ٹروپس کی ابتدائی تنظیم کی گئی۔ مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک نے حکومت ہند کی اس تجویز سے اختلاف کیا۔ ان کا یہ کہنا یہ تھا کہ سب سی ڈیری اور کنٹنجنٹ کی دو الگ الگ فوجوں کے موجود ہوتے ہوئے ایک اور تیسری نئی فوج کی کوئی ضرورت نہیں جس کے اخراجات کا بار حکومت سرکار عالی کے خزانہ پر ڈالا جائے۔ سب سی ڈیری فوج کے ضمن میں ریاست حیدر آباد نے کڑپہ کرنول اور بلاری وغیرہ کے ضلعے جن کی مجموعی سالانہ آمدنی ایک کروڑ روپیے کے قریب تھی، حکومت ہند کے حوالے کئے۔ کنٹنجنٹ کے سلسلے میں برار کے زرخیز ضلعوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اب تیسری فوج کے خرچ کے ضمن میں نہ معلوم کوئی اور حصہ ملک انگریزی حکومت کے سپرد کرنا پڑے۔ ان اعتراضوں سے حکومت ہند بہت ناراض ہوئی لیکن ان کا کوئی معقول جواب بن نہ پڑا۔ ڈفرن ارادہ کر چکا تھا کہ امپریل سروس ٹروپس کی بنا حیدر آباد میں پڑے تاکہ دوسرے والیان ریاست کو اس قسم کی فوج تیار کرنے کی ترغیب ہو اور اس طرح حکومت ہند کو کسی خرچ کے بغیر ایک ایسی فوج مل جائے جسے امپریل مقصدوں کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حیدر آباد کی طرح دوسری ریاستوں نے بھی امپریل سروس ٹروپس اپنے اپنے یہاں قایم کیں اور حکومت ہند نے بڑی ہوشیاری سے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

تیسری جنگ برما ۱۸۸۵ء

شمالی برما کے حکمران تھی بانے کچھ

عرصے سے اپنی آزادی کو عملی طور پر برتنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزی حکومت سے بلے پوچھے اپنے علاقہ میں فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کو خاص رعایتیں دیں۔ یہ بات انگریزوں کو سخت ناگوار گزری۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں شمالی برما میں جو انگریز ایجنٹ رہا کرتا تھا اس کو واپس بلا لیا گیا۔ اور جنوبی برما میں جو انگریز تاجر آباد ہو گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ شمالی برما کو بھی انگریزی حکومت اپنے تحت کرلے تاکہ انکے منافع میں اضافہ ہو۔ بہانہ یہ تراشا گیا کہ شمالی برما کی حکومت کا ایک انگریز کمپنی پر جرمانہ کرنا حق بجانب نہیں ہے جنوبی برما کے انگریز تاجر برابر حکومت ہند کو اکسا رہے تھے کہ شمالی برما کے حکمران کو سزا دینی چاہئے اسلئے کہ وہ انگریزوں کا سخت مخالف اور بدخواہ ہے۔ اسی دوران میں شمالی برما کے حکمران نے ایک مشن پیرس بھیجا اور بات چیت کے بعد یہ طے کیا کہ مانڈلے میں ایک فرانسیسی بینک قایم کیا جائے۔ ان سب باتوں سے جنوبی برما کے انگریز تاجر اور بھی چراغ پا ہو گئے اور انھوں نے متحدہ طور پر حکومت ہند کو لکھا کہ شمالی برما کے حکمران سے جواب طلب کیا جائے۔ چنانچہ حکومت ہند نے شمالی برما کے حکمران سے جواب طلب کیا کہ انگریز کمپنی پر کیوں جرمانہ کیا گیا۔ لارڈ ڈفرن چاہتا تھا کہ اس ضمن میں حکومت ہند کو تحقیقات کرنے کا مجاز کیا جائے لیکن تھی با نے اس کو اپنے اقتدار کے منافی سمجھتے ہوئے انکار کر دیا۔ اس پر ڈفرن نے لکھا کہ مانڈلے میں ایک انگریز سفیر کو رکھا جائے تاکہ وہ اس قسم کے واقعات کی چھان بین کر سکے۔ اور جب تک کہ یہ سفیر وہاں پہنچ نہ جائے انگریزی کمپنی پر جرمانہ کی جو کارروائی کی گئی ہے اسے ملتوی رکھا جائے۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ انگریز تاجروں کو اس کی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ شمالی برما میں سے ہو کر چین کو اپنا سامان لے جا سکیں۔ حکومت برما نے ان تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جنرل پرنڈرگاسٹ کی ماتحتی میں شمالی برما پر حملہ کر دیا گیا۔ رنگون میں پہلے سے فوج اکھٹی کر لی گئی تھی اور سامان جنگ تیار تھا۔ برما والے انگریزوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انھیں ہر موقع پر شکست اٹھانی پڑی۔ دس روز کے اندر انگریزی فوجیں شمالی برما کے صدر مقام آوا تک پہنچ گئیں۔ تھی با نے

بے شرط کے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا۔ یکم جنوری ۱۸۸۶ء پورا شمالی برما کا علاقہ انگریزی راج میں اعلان کر کے شامل کر لیا گیا۔ یہ علاقہ فرانس کے رقبے سے بڑا تھا اور اس کی آبادی اس وقت ۵۰ لاکھ تھی۔

تھی باکو گرفتار کر کے پہلے کچھ عرصے تک رنگون میں رکھا اس کے بعد اس کو وظیفہ دیکر رتناگری (صوبہ بمبئی) کے قلعہ میں نظربند کر دیا گیا جہاں اس نے ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو وفات پائی۔

شمالی برما کے بعض فوجی سرداروں نے اپنی چھوٹی ٹولیاں بنالیں اور انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔ وہ گھنے جنگلوں کے دشوار گزار راستوں سے واقف تھے جہاں وہ حملہ کرنے کے بعد جاکر چھپ جاتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اس قسم کا مقابلہ کسی منظم مملکت کے وسیلوں کے سامنے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتا۔ سر چارلس برنارڈ کی چیف کمشنری کے زمانے میں پورے شمالی برما میں انگریزی راج مستحکم ہو گیا اور نیا نظم و نسق قایم ہوا۔

شمالی برما کے الحاق کے لئے حکومت ہند نے جو بہانہ تراشا وہ معقول نہیں معلوم ہوتا۔ محض اس بناء پر کہ ایک انگریزی تجارتی کمپنی پر تھی باکی حکومت نے جرمانہ کیا تھا اس لئے اس کے پورے ملک پر قبضہ کر لیا جائے ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۲۶ء میں جب پہلی برما کی لڑائی ہوئی تو انگریزوں نے اراکان اور تناسیرم کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کیا۔ پھر ۱۸۵۲ء میں جب دوسری برما کی لڑائی ہوئی تو پیگو کا زرخیز علاقہ حکومت ہند کے ہاتھ آیا اور سمندر پر کسی طرف سے بھی شمالی برما کی حکومت کی رسائی باقی نہ رہی۔

اب واقعات کی رفتار نے یہ صورت اختیار کی کہ شمالی برما کا بھی انگریزی عملداری میں شامل ہونا ضروری ہو گیا خاص طور پر اس لئے یہ خواہش اور زیادہ شدید ہو گئی کہ فرانسیسیوں کی طرف سے حکومت ہند کو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ شمالی برما میں اپنی حکومت کا ڈول نہ ڈالیں۔ چنانچہ جنگ سے قبل ہی لارڈ ڈفرن نے اپنے ایک خط میں جو مغربی برما کے چیف کمشنر کے نام تھا اس قسم کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا کہ وہ اگر فرانسیسیوں کی

کارروائیاں ایسی ہیں جن سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہو کہ وہ ہم سے پہلے شمالی برما میں اپنی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں مجھے مطلق تامل نہ ہوگا کہ اس پورے علاقہ کو برطانوی عملداری سے ملحق کر دیا جائے۔ موجودہ حالات میں مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ طریق کار اس سے بہتر ہوگا کہ وہاں ہم اپنے زیر اثر کسی دوسرے حکمران کو گدی پر بٹھائیں[1]"

شمالی برما پر قبضہ ہونے کے باعث حکومت ہند کو شہنشاہ چین سے اپنے سیاسی تعلقات کی صفائی کرنی پڑی۔ اب تک برما چین کی بالادستی کو مانتا تھا۔ اگرچہ محض رسمی طور پر۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اس ضمن میں آئندہ پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں حکومت ہند نے معاملے صاف کرنے چاہے تبت پر بھی چین کا اقتدار چلا آتا تھا۔ حکومت ہند نے حکومت چین کو اس امر پر رضامند کر لیا تھا کہ اگر وہ تبت کو اپنا تجارتی مشن بھیجے تو وہ کوئی اعتراض نہ کرے گی اس شرط سے کہ تبت کی حکومت اس پر آمادہ ہو۔ اگرچہ حکومت چین نے اس کی اجازت دے دی تھی لیکن خود حکومت تبت نے اس پر اعتراض کیا اور مشن کا استقبال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ غرضکہ یہ معاملہ الجھ کر رہ گیا۔ شمالی برما پر قبضہ ہو جانے کے بعد حکومت ہند نے حکومت چین سے یہ طے کیا کہ وہ اس وقت تبت کو اپنا مشن نہیں بھیجتی بشرطیکہ چین کی حکومت پورے برما پر انگریزی تسلط کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ چین نے برما پر انگریزی اقتدار مان لیا۔ اس ملک پر چین کا اقتدار محض رسمی تھا۔ وہاں برطانوی تسلط تسلیم کرنے سے چین کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا۔ لیکن چین یہ بھول گیا کہ مغربی استعمار اپنی قوت کو بڑھا کر ایک دن خود اس کی شہ رگ کو اپنے قابو میں کرلے گا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء

رپن نے اپنی یادداشت میں جو لارڈ ہارٹنگٹن وزیر ہند کو بھیجی تھی صاف طور پر بتلا دیا تھا کہ

[1] Sir Alfred Lyall, Life of Marquis of Dufferin and Av, p. 398.

تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ملک کی حکمرانی میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جو انھیں دینا چاہئے۔ اگر انھیں ملک کے نظم ونسق میں شریک نہ کیا گیا تو ان کی توانائیاں کجروی اختیار کرکے انگریزی راج کی بنیادوں کو متزلزل کرنے والی ہونگی۔ اس کی پیشین گوئی ٹھیک نکلی۔ مقامی حکومت خود اختیاری کے جو ادارے رپن کے عہد میں قایم ہوئے انھیں بعد میں اس طریقہ پر چلایا گیا کہ وہ غیر موثر ہو گئے اور ان کے ذریعہ ہندوستانیوں کی جن تمناؤں کو پورا کرنا مقصود تھا وہ بھی پوری نہ ہوئیں۔ غرضکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی انگریزی حکومت سے بدگمانی برابر بڑھتی گئی۔ ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی تاریخ اور انگریزی لبرل ازم کے اصول سے واقف ہوچکا تھا۔ اس کی فطری خواہش یہ تھی کہ اپنے ملک میں بھی جمہوری طرز کی حکومت قایم کرے جسے سیاسی ارتقا کی آخری منزل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی جانتے تھے کہ ان کے ملک میں بھی انگلستان کی طرح نمایندہ ادارے قایم ہوں تاکہ ان کے ذریعے سے ان کے بہترین لوگوں کو عاملہ اور مقننہ میں داخل ہوکر ملک کی خدمت کا موقع ملے۔ ملک کے ہر گوشے کے انگریزی پڑھے ہوئے ہندوستانیوں میں یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اپنی آواز موثر بنانے کے لئے اپنی سیاسی تنظیم کریں۔ چنانچہ بنگال میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور بمبئی میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن نے ہندوستانیوں کے پبلک مسائل کو اپنا مرکز توجہ بنالیا تھا۔ لیکن انکی نوعیت مقامی تھی۔ اب ضرورت اس کی محسوس کی جارہی تھی کہ کل ملک کے لئے ایسی جماعت قایم کی جائے جو ہندوستانیوں کے جائز حقوق کی دیکھ بھال کرسکے۔ ۱۸۷۸ء میں سر ندرا ناتھ بنرجی نے بمبئی اور مدراس کے صوبوں کا دورہ کیا تاکہ ایک محضر تیار کیا جائے اور لارڈ سالبسبری وزیر ہند کے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا جائے جس کی رو سے انڈین سول سروس کے امتحان میں شرکت کرنے والے امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے کم کرکے ۱۹ سال کردی گئی تھی۔ اس طرح عمر کم کرنے سے جو تھوڑے بہت ہندوستانی سول سروس میں آجاتے تھے آئندہ وہ بھی نہیں آسکینگے۔ یہ محضر ہاؤس آف کامنز میں

پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔ اسی زمانے میں لارڈ لٹن کی شہنشاہی پالیسی سے ہندوستانیوں کے جذبات برطانوی حکومت کے خلاف ہوگئے۔ رپن نے اگرچہ تالیف قلب کی کوشش کی لیکن اس کی حکمت عملی کو بعد میں غیر موثر بنا دیا گیا۔ اب ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی محرومی اور بے اثری کا اور بھی زیادہ احساس ہوگیا۔ البرٹ بل کے ضمن میں اینگلو انڈین طبقہ نے جو دوڑ دھوپ کی اس سے اہل ہند کو سبق ملا اور انھوں نے سوچا کہ اگر وہ بھی منظم ہو کر کچھ کریں تو اس کا اثر ہونا لازمی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے البرٹ ہال میں جو پولیٹیکل کانفرنس ہوئی اس میں بھی سر ندرناتھ بنرجی نے ایک ایسی سیاسی جماعت کی ضرورت پر زور دیا جو ملکیوں کے حقوق اور مفاد کی نگہداشت کر سکے۔ ہندوستانیوں کے مقصدوں سے ہمدردی رکھنے والے بعض انگریز بھی تھے جو چاہتے تھے کہ ان کے جائز حقوق سے انھیں محروم نہ کیا جائے۔ ان میں مسٹر الن ہیوم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ انگلستان اور ہندوستان میں ایسا ربط قایم ہو جائے جو دونوں ملکوں کی فلاح و ترقی کا ضامن ہو۔ مسٹر ہیوم نے ایک بین الہندی جماعت کو تشکیل دینے کا خیال باضابطہ طور پر سب سے پہلے پیش کیا اور انھیں کے ایما پر انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ وہ احساس جو ملک کے مختلف حصوں کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے دلوں میں کچھ عرصے سے موجود تھا اب اس کی خارجی تشکیل کا وقت آگیا اور وہ بھی ایک انگریز ہمدرد کے ہاتھوں۔ مسٹر ہیوم کے پیش نظر یہ تھا کہ جس صوبے میں کانگریس کا اجلاس ہو وہیں کا گورنر یا لفٹننٹ گورنر اس کی صدارت کرے چنانچہ اس لئے وائسرائے لارڈ ڈفرن سے اس ضمن میں گفتگو بھی کی۔ لیکن ڈفرن نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر نہ کرسکیں گے۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ کانگریس کے کاروبار میں سرکاری عنصر کو شریک نہ کیا جائے۔ شروع شروع میں ڈفرن نے کانگریس کے مقصدوں سے کچھ ہمدردی کا اظہار کیا بلکہ اس لئے مسٹر ہیوم کو یہ

بھی مشورہ دیا کہ معاشری مسائل کے علاوہ سیاسی معاملوں پر بھی اس کے اجلاسوں میں بحث و مباحثہ ہو سکتا ہے[1]۔

شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند کے مقصدوں میں وحدت پیدا کرے، ملکی انتظام میں ان کی شرکت کا مطالبہ کرے اور انھیں وقتاً فوقتاً جو شکایتیں پیدا ہوں انھیں تجویزوں کی شکل میں حکومت کے روبرو پیش کرے۔ چنانچہ پہلی کانگریس کے صدر مسٹر ڈبلو سی بونر جی نے اپنے خطبہ صدارت میں صاف طور پر کہا کہ "ہمارا مقصد ملک کی وحدت کے ان جذبات کو مستحکم کرنا ہے جن کی ابتدا ہمارے محبوب لارڈ رپن کے عہد میں ہوئی ہے۔" انگریزوں میں مسٹر ہیوم کے علاوہ سر ڈیوڈ ڈیول، سر ولیم وڈربرن اور سر ہنری کاٹن بھی انڈین نیشنل کانگریس کے مقصدوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مسٹر ہیوم نے انگلستان جاکر جان برائٹ اور چارلس برڈلا کو آمادہ کر لیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اہل ہند کے جائز مطالبوں کی تائید کریں گے۔ لبرل جماعت کے بعض دوسرے افراد نے بھی اس ضمن میں اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ شروع میں اگرچہ کانگریسیوں کے لب و لہجہ میں احتیاط پائی جاتی تھی لیکن دو سال کے اندر اندر حکومت ہند ان کے مقصدوں سے بدظن ہو گئی اور اپنے ملازموں کے لئے کانگریس کی شرکت ممنوع قرار دی۔ لارڈ ڈفرن جس نے شروع میں کانگریس کے مقصدوں سے ہمدردی ظاہر کی تھی اس کی نسبت طنز اور تحقیر سے ذکر کرنے لگا[2]۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا کانگریس حکومت کی مخالف جماعت تصور کی جانے لگی۔ ڈفرن چاہتا تھا ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں کے نمائندوں کو مقننہ میں شریک کرنا چاہئے میزانیہ پر انھیں بحث کرنے کا حق دینا چاہئے۔ انھیں عاملہ کے ارکان سے سوالات کرنے کا بھی حق دینا چاہئے۔ اس نے سیاسی حالات کا جائزہ دینے کے

---

[1] The History of the Congress, by P. Sitaramayya, p. 107.

[2] Thompson and Garatt. Rise and fulfilment of British Rule in India, p. 543.

[3] Ibid., p. 544.

بعد اپنے ایک مراسلہ میں جو اس نے وزیر ہند کو بھیجا تھا اہل ہند کے ارادوں اور خواہشوں کی صحیح ترجمانی کی اور رپن کی طرح اس نے بھی وزیر ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ انگریزی حکومت کو چاہئے کہ بہت جلد سیاسی اصلاحیں نافذ کرے تاکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں شرکت کا موقع حاصل ہو سکے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی مجلس عاملہ کی ایک کمیٹی اصلاحات کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے مقرر کی۔ اس کمیٹی نے جو سفارشیں پیش کیں ان میں سب سے اہم یہ تجویز تھی کہ گورنر جنرل اور گورنروں کی مجالس مقننہ میں نیابتی طریقہ کو رائج کیا جائے۔ اب تک ان مجالس کی تشکیل میں انتخابی عنصر بالکل نہیں رکھا گیا تھا بلکہ تمام ارکان نامزد شدہ ہوتے تھے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنے مراسلہ میں جو وزیر ہند کے نام تھا اس کی وضاحت کردی تھی کہ اس کی اسکیم دراصل مجالس مقننہ کی توسیع کرنا چاہتی ہے۔ ان کی حیثیت کو بلند کرنا، ان کے وظیفوں کو بڑھانا اور طریق انتخاب کو رواج دینا بھی مقصود ہے تاکہ سیاسی اداروں کی حیثیت سے ان کے عام خد و خال لبرل نظر آئیں۔ لارڈ موصوف نے ساتھ ساتھ اس کی بھی وضاحت کردی کہ ہم ہندوستان میں پارلیمانی طریق حکومت رائج کرنے کا خواب وخیال بھی نہیں رکھتے۔ یہ اس واسطے کیا گیا تاکہ انگلستان کی قدامت پسند جماعت ان کی اسکیم کی طرف سے بدظن ہو کر چیخ پکار نہ کرے جس طرح رپن کے عہد میں کیا گیا۔ باوجود اس محتاط نقطہ نظر کے جو لارڈ ڈفرن اور حکومت ہند کی جانب سے اختیار کیا گیا وزیر ہند نے صاف جواب دے دیا کہ اس وقت تک حکومت ہند کی تشکیل میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی کرنے کے متعلق غور نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس کی تائید میں قطعی شہادتیں نہ فراہم کرلی جائیں۔

لارڈ ڈفرن کے ایما پر حکومت ہند نے ۱۸۸۶ء میں سر چارلس ایچی سن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ اس مسئلہ پر غور کرے کہ ہندوستانیوں کی تعداد اعلیٰ خدمتوں پر بڑھانے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس

کمیشن کے ۱۵ ارکان میں سے ۵ ہندوستانی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی اس تجویز پر غور کیا گیا کہ انڈین سول سروس کے مقابلہ کا امتحان انگلستان میں بھی ہونا چاہئے۔ لیکن یہ تجویز منظور نہیں کی گئی اس لئے کہ اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کے وہ طبقے جو معاشری لحاظ سے بلند رتبہ رکھتے ہیں لیکن انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ابھی پیچھے ہیں اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکینگے۔ کمیشن نے اس ضمن میں تمام تنقیحوں پر سوچ بچار کیا اور پبلک سروس کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ امپیریل سنٹرل، پراونشل اور سبارڈینیٹ پہلے کے تقررات وزیر ہند کی جانب سے ہوں گے۔ دوسرے کا تعلق تمامتر مرکزی حکومت سے رہے گا۔ اس کے تحت مالیات ریلوے اور ٹپہ وغیرہ کی اعلیٰ خدمتیں ہونگی۔ پراونشل اور سبارڈینیٹ سروس کے ارکان کا تقرر صوبجاتی حکومت کرے گی۔ ان سروسوں کے ارکان ترقی کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈسٹرکٹ جج اور سشن جج کی خدمتوں پر فائز ہو سکیں گے۔ یہ دونوں سروسیں تمامتر ہندوستانیوں پر مشتمل ہوں گی۔ کمیشن نے اس کی بھی سفارش کی کہ قابل نوجوان ہندوستانیوں کو امپیریل سروس میں داخل ہونے کے لئے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ چونکہ انگریزی عنصر کو کم کرنے سے برطانوی نقطہ نظر سے نظم و نسق میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے احتیاط لازم ہوگی۔

اب ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کا آہستہ آہستہ اثر بڑھ رہا تھا۔ انگلستان کے بعض لبرل خیال کے مدبرین کو بھی اہل ہند کے سیاسی مطالبوں سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں ہاوس آف کامنز میں چارلس بریڈلا نے ایک مسودہ قانون پیش کیا جس میں گورنر جنرل اور گورنر کی مجالس مقننہ کے ارکان کی تعداد بڑھانے، ان میں انتخابی عنصر شامل کرنے اور ان کے اختیارات وسیع کرنے کے متعلق تجویزیں تھیں۔ لیکن موصوف کے انتقال کے باعث اور آئرستان کے مسئلے کے انہماک کی وجہ سے پارلیمنٹ ہندوستانیوں میں سیاسی اصلاحیں نافذ کرنے کے مسئلہ پر غور نہ کر سکی اور چند سال کے لئے

معاملہ ٹل گیا۔

لارڈ ڈفرن کے جانشین لارڈ لینسڈون کے عہد حکومت میں کانگریسی انتہا پسندوں کا زور بڑھنے لگا۔ لارڈ موصوف کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مسئلے پر کافی مباحثہ ہوا اور وہ تمام مسائل بحث میں آئے جن کی نسبت ڈفرن نے اپنے مراسلے میں اشارہ کیا تھا۔ آخر ۱۸۹۲ء میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا جس کا منشاء ۱۸۶۱ء کے قانون مجالس ہند کی ترمیم تھا۔ مسٹر (بعد میں لارڈ) کرزن نے جو اس وقت نائب وزیر ہند کے عہدہ پر تھے اس مسودہ قانون کو ہاؤس آف کامنز میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا مقصد حکومت ہند کی بنیاد کو وسیع کرنا اور اس کے فرائض میں وسعت پیدا کرنا ہے تاکہ ہندوستانیوں کے غیر سرکاری عنصر کو حکومت کے کام میں زیادہ شرکت کے موقعے مل سکیں۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔[1] یہ گویا سرکاری طور پر اس نمایاں ترقی کا اعتراف تھا جو اہل ہند کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے گزشتہ تیس سال میں کی تھی۔ قانون مجالس ہند (انڈین کونسلز ایکٹ) ۱۸۹۲ء کی رو سے ذیل کے سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔

گورنر جنرل کی کونسل (امپیریل کونسل) کے زاید ارکان کی تعداد بجائے ۱۲ کے ۱۶ کر دی گئی۔ صوبجاتی مجالس وضع قانون کی تعداد بمبئی، مدراس اور بنگال کی پریسی ڈنسیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ۲۰ اور صوبہ شمال مغربی کے لئے ۱۵ قرار دی گئی۔ پنجاب اور برما میں پہلی مرتبہ مجالس وضع قانون قایم کی گئیں۔ گورنر جنرل اور گورنروں کو اختیار دیا گیا کہ مجالس کے ارکان کی نامزدگی کے متعلق اس قانون کے تحت اپنی صوابدید کے موافق تفصیلی قاعدے مقرر کریں تاکہ مختلف مفادوں کی نمائندگی

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 545.

ہو سکے۔ بلدیات، مجالس ضلع، جامعات اور اور تجارتی ایوان ان مجالس کے لئے انتخابی حلقے مقرر ہوئے۔ حکومت ہند کا سالانہ میزانیہ بحث کے لئے ارکان کے سامنے پیش کیا جائیگا اور ہر رکن کو چند روز پہلے میزانیہ کی ایک نقل بھیج دی جائے گی۔ ارکان کو اختیار ہوگا کہ میزانیہ کی مدوں کے متعلق تنقید اور بحث کر سکیں۔ محکمہ متعلقہ کا اعلیٰ افسر یا صدر ان اعتراضوں کا جواب دے گا۔ میزانیہ کے متعلق ارکان کوئی نئی تجویز پیش کرنے کے مجاز نہ ہونگے۔ ارکان مجلس کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق ہوگا تاکہ کسی مسئلہ کے متعلق حکومت سے معلومات فراہم کی جائیں جن کی اطلاع پہلے سے کرنا ہوگی۔ صدر مجلس کو اختیار ہوگا کہ اگر کسی سوال کو نامناسب خیال کرے تو اس کے پیش کرنے کی اجازت نہ دے۔ صوبجاتی مجلسوں کو اختیار ہوگا کہ گورنر جنرل کی اجازت حاصل کرنے کے بعد امپیریل کونسل کے کسی ایسے منظور کردہ قانون کی ترمیم یا تنسیخ کے متعلق بحث کر سکیں جو اس صوبہ سے تعلق رکھتا ہو۔

۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند سے امپیریل کونسل اور صوبجاتی مجلسوں کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔ اب ان کا کام محض وضع قانون نہیں رہا بلکہ انتظامی معاملوں کے متعلق ارکان مجلس حکومت سے سوالات کر سکتے تھے جو ایک نہایت اہم پارلیمانی حق ہے۔ اس کے علاوہ ان مجالس کے قیام میں بالواسطہ طریق انتخاب پہلی مرتبہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ یہ دونوں باتیں سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند کو غیر تشفی بخش اور اپنی امیدوں سے بہت کم قرار دیا اور مزید سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا۔ خاص طور پر یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ امپیریل کونسل اور صوبہ جاتی کونسلوں کے ارکان کا انتخاب براہ راست ہونا چاہیئے۔

لہ۔ Cambridge History of India, Vol. VI, p. 546-47.

شمالی مغربی سرحد لارڈ لینسڈاون کے عہد حکومت میں درۂ بولان تک ریل پہنچادی گئی اور کوئٹہ سے لیکر کشمیر تک سرحد پر انگریزی حلقۂ اثر بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ حلقۂ اثر قایم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت براہ راست ان علاقوں پر اپنی حکومت نہیں قایم کرے گی لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ کوئی دوسری طاقت وہاں اپنا عمل دخل بڑھائے۔ لارڈ ڈفرن کے عہد حکومت میں امیر عبدالرحمٰن خاں سے دوستانہ تعلقات کی تجدید ہوئی تھی لیکن لینسڈاون کے عہد میں حکومت افغانستان اور حکومت ہند کے تعلقات میں ایک طرح کی سرد مہری پیدا ہوگئی لارڈ لینسڈاون کے خطوں کا انداز امیر عبدالرحمٰن کی نظر میں دوستی اور اخلاص کے منافی تھا۔ اسے یہ بات بھی ناگوار تھی کہ لارڈ لینسڈاون اس کو اندرونی انتظامات کے متعلق بیٹھے بیٹھے مشورہ دیا کرتا ہے جس کی دراصل کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

برطانوی سرحد اور افغانستان کی سرحد کے درمیان ۲۵ ہزار مربع میل کا کوہستانی علاقہ ہے جہاں قدیم سے مختلف قبیلے آباد ہیں۔ حریت و آزادی انکی گھٹی میں شامل ہے۔ برائے نام یہ قبیلے امیر افغانستان کے ماتحت تھے۔ امیر افغانستان کو ان پر بس اتنا اثر حاصل تھا کہ جب کبھی وہ چاہتا ان قبیلوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرسکتا تھا۔ ان قبیلوں کا اس میں فائدہ تھا کہ وہ برطانوی علاقوں پر دھاوے کرکے لوٹ مار کریں اور تجارتی راستوں پر چھاپے مارکر مال و اسباب لوٹ لیے جائیں۔ حکومت ہند ایسی صورت میں قبائلی علاقوں پر فوج کشی کرتی جس سے اکثر روک تھام کے بجائے اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اول تو یہ کہ وسیع قبائلی علاقے میں فوج کشی سے حکومت ہند کے خزانہ پر بہت بار پڑتا اور دوسرے یہ کہ افغانستان کی حکومت سے کشیدگی پیدا ہونا لازمی تھا۔ لارڈ رابرٹس جب تک کمانڈر ان چیف رہا اس وقت تک سرحد پر اقدامی حکمت عملی پر عمل ہوتا رہا جس کی وجہ سے امیر عبدالرحمٰن حکومت ہند سے بدظن ہوگیا۔ ۱۸۹۸ء میں حکومت ہند نے لارڈ رابرٹس کے زیر سرکردگی ایک مشن افغانستان روانہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ امیر صاحب کے دل میں حکومت ہند کے مقصد و

کی نسبت جو شبہے پیدا ہو گئے ہوں انھیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن چونکہ شمالی افغانستان کی سرحد پر اسحق خاں نے اسی زمانے میں بغاوت کر دی تھی اور امیر عبدالرحمن اس کو فرو کرنے میں مصروف تھے اس لئے عارضی طور پر مشن کو ملتوی کرنا پڑا۔ دراصل امیر افغانستان لارڈ رابرٹس کو اس کے خیالات کی وجہ سے سخت ناپسند کرتا تھا اس لئے وہ اس کے مشن کا استقبال کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس اثناء میں حکومت ہند نے روسی خوف سے گلگت کی طرف جو فوجی چھاونیاں بنائیں تاکہ چترال کے علاقے تک پہنچ ہو سکے، اس سے امیر افغانستان کی بدظنی اور بڑھ گئی ۱۸۹۲ء میں مہتر چترال کے انتقال پر جو جانشینی کا قضیہ پیدا ہوا اس سے حکومت ہند نے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر رابرٹ سن کو اپنا سفیر بنا کر وہاں متعین کر دیا۔

حکومت ہند نے لارڈ رابرٹس کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد سر مارٹمر ڈیورنڈ کی سرکردگی میں افغانستان ایک مشن روانہ کیا۔ ڈیورنڈ نے بڑی ہوشمندی اور قابلیت سے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو حکومت ہند اور حکومت افغانستان کے درمیان پچھلے دنوں پیدا ہو گئی تھیں۔ جب تک ڈیورنڈ افغانستان میں رہا اس کی حفاظت افغانی فوج کے ذمے رہی۔ برنس اور کیوگناری کے قتل کی یاد ابھی تازہ تھی جن کی حفاظت کے لئے انگریزی فوجی دستے ہندوستان سے گئے تھے۔ امیر صاحب اور ڈیورنڈ میں ایک معاہدہ ہوا جس کے بموجب امیر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ قبائلی علاقوں کے معاملوں میں کسی قسم کا دخل نہ دیں گے۔ انگریزی اور افغانی کمشنروں نے قبائلی علاقوں اور افغانستان کی سرحد کا تعین کر دیا۔ سرحد کے بعض علاقے افغانستان کی حکومت کے حوالے کئے گئے جس کے عوض امیر عبدالرحمن خاں نے سوات، باجوڑ، دیر اور چترال کے معاملوں سے بے تعلقی کا وعدہ کیا۔ چمن کے مقام پر جہاں حکومت ہند نے ریلوے اسٹیشن قایم کیا تھا حکومت افغانستان اپنی ملکیت کے دعویدار تھی لیکن اس معاہدہ کے بموجب وہ اس دعوے سے دستبردار ہو گئی۔ امیر افغانستان کو حکومت ہند اب تک بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور زر امداد

دیا کرتی تھی۔ اس رقم کو اٹھارہ لاکھ کر دیا گیا۔ حکومت ہند کی طرف سے یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ امیر صاحب ہندوستان کے بندرگاہوں کے ذریعے باہر سے جو جنگی سامان منگائیں گے اس پر کسی طرح کی پابندیاں نہیں عائد کی جائیں گی۔ امیر عبدالرحمٰن خاں کو حکومت ہند کی طرف سے سر مارٹمر ڈیورنڈ نے انگلستان آنے کی دعوت دی۔ امیر صاحب نے دعوت کو قبول کر لیا لیکن وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ ان کی بجائے ان کے دوسرے بیٹے نصر اللہ خاں ۱۸۹۵ء میں انگلستان گئے جہاں ان کی آؤ بھگت کی گئی۔ اس موقع پر حکومت افغانستان چاہتی تھی کہ برطانوی حکومت سے یہ طے ہو جائے کہ افغانستان کا سفیر لندن میں رہا کرے لیکن انگریزی حکومت اس پر آمادہ نہ ہوئی[1]۔

لارڈ ایلگن کے عہد حکومت میں شمال مغربی سرحد کی طرح ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر بھی فوجی نقل و حرکت رہی۔ فرانس کے انڈوچین پر قبضہ کر لینے اور میکانگ تک پہنچ جانے اور ادھر انگریزوں کے شمالی برما پر تسلط قایم کرنے سے لازمی طور پر دونوں شہنشاہی ممالک میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی تھا۔ شمالی برما کی طرف سے انگریز اور انڈوچین کی طرف سے فرانسیسی اپنا اپنا حلقۂ اثر اسی طرح سے وسیع کرنے کی فکر میں تھے جس طرح افغانستان اور وسط ایشیا میں روس اور انگریز اپنی اپنی مملکتوں کی حفاظت کے لئے حلقہ ہائے اثر قایم کر رہے تھے۔ اس قسم کا عمل ہمیشہ وہاں نظر آتا ہے جہاں دو بڑی سلطنتیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر لوشائی، چن اور شان کی ریاستوں پر انگریزی حکومت نے اپنا حلقۂ اثر قایم کر لیا جو مشرقی برما میں واقع تھیں۔

اس عہد میں بعض دیسی ریاستوں کے معاملے بھی مرکز توجہ بنے۔ منی پور کی ریاست کے معاملات میں جو آسام کی سرحد پر واقع ہے لارڈ لینسڈون کی حکومت نے موثر مداخلت کی جانشینی کے قضیے کے ضمن میں وہاں جو بدامنی

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 428.

پھیلی اسے دور کرنے کو آسام کے چیف کمشنر کوئنٹن کو مامور کیا گیا۔ منی پور میں بلوہ ہوگیا لیکن آسام کے چیف کمشنر نے تھوڑی سی فوج کی مدد سے صورت حالات پر قابو پا لیا۔ راجا کے خاندان کے ایک نابالغ لڑکے کو راج گدی پر بٹھایا گیا اور اس کی نابالغی کے زمانے میں انگریز پولیٹکل ایجنٹ کے ذریعہ سے ریاست کا انتظام انجام پایا۔ اسی طرح قلات میں خان قلات کے خلاف حکومت ہند نے کارروائی کی۔ اس کی بدانتظامی کی وجہ سے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت ممکن نہ تھی۔ چنانچہ قلات کے سرداروں کے مشورہ کے بموجب خان کو برطرف کر کے اس کے بیٹے کو حکمران بنایا گیا۔ کشمیر کے حکمران مہاراجا پرتاب سنگھ کو حکومت ہند نے اس بنا پر گدی سے ہٹا دیا کہ اس کو کچھ ایسے ثبوت ملے جن سے پتہ چلتا تھا کہ مہاراجا روسیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کو برطرف کر کے ریاست کا نظم و نسق اسٹیٹ کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس کی صدارت برٹش ریزیڈنٹ کرے گا۔[1] کشمیر کی شمالی سرحد کی طرف جو علاقے روس کی سرحد سے ملتے تھے وہاں انگریزی چھاونیاں قایم کر دی گئیں جنھیں براہ راست حکومت ہند کے ماتحت کر دیا گیا۔ کشمیر کے معاملے میں حکومت ہند نے جو من مانی کارروائی کی اس کے خلاف پارلیمنٹ میں چارلس بریڈلا نے سخت احتجاج کیا۔ بعد میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ معزول مہاراجا پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ مشتبہ تھے۔[1]

لارڈ لینسڈون کے جانشین لارڈ الجن کے عہد میں ملک طاعون اور قحط کی مصیبتوں کا شکار رہا۔ ۱۸۹۶ء میں ہانگ کانگ سے غلہ سے لدے ہوئے جو جہاز بمبئی پہنچے ان میں ایسے چوہے بھی آ گئے جو طاعون سے متاثر ہو چکے تھے طاعون کی بیماری بمبئی کی گھنی آبادی میں ایسی جلد پھیل گئی جیسے گھنے خشک جنگل میں آگ

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 496, The British Crown and the Indian States, p. 85.

پھیل جاتی ہے۔ بمبئی کے علاوہ مغربی ہند اور وسط ہند کے دوسرے شہروں میں بھی طاعون کی وبا پھیل گئی۔ اس ضمن میں حکومت نے جو قرنطینہ کے قاعدے نافذ کئے اس سے اہل ملک میں سخت بد دلی پیدا ہو گئی اور حکومت کی بد انتظامیوں کے متعلق دیسی زبانوں کے اخباروں میں سخت نکتہ چینی کی جانے لگی۔ مسٹر تلک نے اپنے اخبار "کیسری" میں سخت تنقیدیں شائع کیں۔ طاعون کو دور کرنے کے لئے جو اعلیٰ افسر مقرر کئے گئے تھے ان میں سے دو کو جن کے نام مسٹر رینڈ اور لفٹننٹ ایرسٹ تھے پونا میں قتل کر دیا گیا۔ قاتلوں کو پھانسی دی گئی اور مسٹر تلک کو مشتعل کرنے کے الزام میں ڈیڑھ سال کی سزا دی گئی۔ بعد میں حکومت ہند نے اس امر کو تسلیم کیا کہ طاعون کی روک تھام کے لئے جو قرنطینہ کے قاعدے نافذ کئے گئے تھے ان میں ملک والوں کے رسم و رواج اور ذات پات کے فرق و امتیاز کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ قاعدے موثر نہ ہو سکے اور اہل ملک میں بد دلی پیدا ہوئی۔ انتہا پسندوں نے ان تمام دردناک واقعات کو انگریزی حکومت کی بد انتظامی اور رعایا کے حالات سے ناواقفیت پر محمول کیا۔

حکومت ہند کو شمال مغربی سرحد پر اس زمانے میں سخت شورش کا مقابلہ کرنا پڑا ۱۸۹۳ء میں حکومت افغانستان اور حکومت ہند میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے چترال کا علاقہ انگریزی حلقۂ اثر میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے گلگت میں جو پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا وہ کبھی کبھی چترال کے صدر مقام مستوج کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں چترال کے حکمران کے قتل ہونے پر جانشینی کا قضیہ پیدا ہو گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر حکومت ہند کے حکم سے انگریزی افواج نے چترال پر قبضہ کر لیا۔ لارڈ الجن چاہتا تھا کہ اس سرحدی علاقے پر جو روس کی سرحد سے ملا ہوا ہے مستقل طور پر قبضہ جما یا جائے لیکن لارڈ روزبری کی لبرل وزارت نے اس کی مخالفت کی اور حکم دیا کہ انگریزی فوجوں کو چترال کا تخلیہ کر دینا چاہئے۔ پیشتر اس کے کہ حکم کی تعمیل ہو لارڈ روزبری کی وزارت کی جگہ لارڈ سالسبری کی قدامت پسند

وزارت برسر اقتدار ہو گئی اور پچھلے تصفیہ کو رد کر کے حکومت ہند کو حکم دیا کہ چترال کے صدر مقام سے برطانوی سرحد تک فوجی نقل و حرکت کے لئے ایک سڑک بنانی چاہئے جس کی حفاظت کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قلعہ بندیاں ہوں جہاں انگریزی فوج مستقل طور پر رہے گی۔ قدامت پسند حکومت نے اپنی پیشرو حکومت کے تصفیہ کو جس طرح کالعدم قرار دیا اس کے باعث انگلستان میں سخت نکتہ چینی کی گئی اور کچھ عرصے بعد سرحد پر جو شورش پیدا ہوئی اس کا محرک اسی تصفیہ کو قرار دیا۔ مسٹر مارلے اور مسٹر اسکوئیتھ نے لارڈ سالسبری کی پالیسی پر پارلیمنٹ میں سخت تنقید کی۔ قدامت پسندوں اور لبرلوں کے اخباروں میں بہت دن بعد تک چترال کے مسئلہ کے متعلق بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔

اس میں شبہہ نہیں ۱۸۹۷ء میں شمال مغربی سرحد پر جو عام بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب چترال کا مسئلہ بھی تھا۔ قبائلی باشندے ہمیشہ سے اپنی آزادی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ پچھلے چند سالوں میں ان کے علاقوں میں سڑکیں بنائی جا رہی ہیں۔ ریلیں نکالی جا رہی اور چھاؤنیاں قایم ہو رہی ہیں۔ یہ سب باتیں ان کے نزدیک ان کی آزادی میں رکاوٹ ڈالنے والی تھیں۔ قبائلی علاقے اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کے ذریعے جو سرحد کا تعین کیا گیا تھا اس کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا گیا کہ ڈیورنڈ لائن تک انگریزی قبضہ ہو جائے گا اور یہی ہندوستان کی شمال مغربی سرحد قرار پائے گی۔ ملاؤں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین شروع کر دی جو اسلامی حکومتوں کو ایک ایک کر کے اپنی عملداری میں شامل کر رہے تھے۔ امیر عبد الرحمٰن خاں نے حال ہی میں ایک رسالہ شایع کیا تھا جس میں جہاد کی حقیقت اور اس کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ غرضکہ سرحد پر ایک عام شورش کے لئے مسالا تیار تھا۔ جون ۱۸۹۷ء میں وادیٔ توچی اور چکدرا اور مالاکنڈ کی چھاؤنیوں پر قبیلے والوں نے ہلہ بول دیا۔

تھوڑے دنوں بعد آفریدیوں، وزیریوں اور مہمندوں نے اپنے اپنے علاقوں میں انگریزی سرحد پر حملے شروع کر دئے۔ حکومت ہند کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ شورش اتنی بڑھ جائے گی۔ ان حالات کے مدنظر سر بینڈن بلڈ اور سر ولیم لاکھرٹ کی سرکردگی میں دو زبردست مہمیں روانہ کی گئیں قبیلے والوں نے بڑی بہادری اور استقلال سے مقابلہ کیا لیکن چونکہ ان کے مادی وسیلے محدود تھے اس لئے انھیں ہار ماننی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ غدر کے بعد سے اب تک انگریزی فوجوں کو اتنا سخت مقابلہ کبھی نہیں کرنا پڑا جتنا کہ اس وقت قبائلی لوگوں کے خلاف کرنا پڑا۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ افغانستان میں بھی اتنے سخت مقابلے کی نوبت نہیں آئی تھی۔[1]

---

[1] Roberts, History of British India, p. 513.

بیسواں باب

لارڈ کرزن کی خارجی اور داخلی حکمت عملی

۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن لارڈ الجن کا جانشین مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف چالیس سال تھی۔ وہ ایشیا کے اکثر ملکوں کا سفر کر چکا تھا۔ ترکی، مصر، ایران، افغانستان، جاپان، چین اور کوریا میں اس نے اپنے سفر کے دوران میں شخصی تعلقات قایم کر لئے تھے اور ان ملکوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس نے ایشیا کے مختلف ممالک کے متعلق تین تصنیفیں شائع کیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ کرزن سے پہلے کوئی گورنر جنرل مشرقی ممالک کے متعلق اس قدر وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے عہدہ پر فائز نہیں ہوا۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ حکومت ہند کے نظم و نسق کے ہر شعبے پر اپنا اثر چھوڑ جائے۔ اس کو تنقید کی پروا نہیں تھی۔ اسی لئے اس نے اپنے بہت سے مخالف پیدا کر لئے۔

سرحدی حکمت عملی اگرچہ لارڈ کرزن ہندوستان کے شمال و مغرب پر اقدامی حکمت عملی اختیار کرنے کا موئد تھا لیکن

اس ملک میں آکر اور یہاں کے صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنے اس خیال میں تبدیلی کرلی۔ چنانچہ اس کے حکم سے درۂ خیبر، وادیٔ خرم، وزیرستان اور دوسرے قبائلی علاقوں میں جو انگریزی فوجیں تھیں انھیں واپس بلالیا گیا۔ اس نے قبیلوں کی فوجیں بھرتی کیں تاکہ انھیں ان علاقوں میں استعمال کیا جائے اور ان کی مدد کے واسطے قبائلی علاقوں سے ذرا ہٹ کر برطانوی فوجیں متعین کردی گئیں تاکہ اچانک ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جاسکے۔ الجن کے عہد میں قبیلے والوں کو سزا دینے کی غرض سے برطانوی فوجیں قبائلی علاقوں میں گشتی چلی گئی تھیں اور اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا تھا کہ عقب میں رسل و رسائل کے ذرائع کو مضبوط کیا جائے۔ چنانچہ اس کا قوی اندیشہ تھا کہ یہ فوجیں رسل و رسائل کی کمی کی وجہ سے دشمن کی لشکر کشی کے وقت کہیں سخت پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں[1]۔ کرزن نے ان تمام تجویزوں کو جن کا مقصد قبائلی علاقے میں قلعہ بندی کرنا تھا رد کردیا۔ اس اقدامی حکمت عملی کی بجائے حکومت ہند نے ریلیں اور سڑکیں بنانے پر زیادہ توجہ کی تاکہ انگریزی چھاؤنیوں سے سرحدی ملیشیا کو آسانی سے مدد پہنچائی جاسکے۔ اس کے علاوہ کرزن نے قبائلی سرداروں کو ملانے کے لئے خوب روپیہ صرف کیا۔ اس نے سرحد کا دورہ کرکے کوئٹہ میں قبائلی سرداروں کا ایک دربار کیا اور انھیں یقین دلایا کہ انگریزی حکومت قبائلی علاقے پر قبضہ کی کوئی نیت نہیں رکھتی لیکن اس کے ساتھ وہ ان علاقوں میں بغاوت اور بدامنی کو بھی گوارا نہیں کرسکتی۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آئندہ دس سال تک سرحد پر امن و امان قایم رہا اور حکومت ہند کو ان پریشانیوں میں مبتلا نہ ہونا پڑا جن میں وہ بہت دنوں سے مبتلا تھی۔

قبائلی مسئلہ کو فوجی نقطہ نظر سے حل کرنے کے بعد کرزن نے سرحد کے انتظامی مسائل کی طرف توجہ کی۔ اب تک شمال مغربی سرحد کا سارا علاقہ

---

[1] Cambridge History of India, Vol. p. 466.

صوبہ پنجاب کے تحت تھا۔ یہ انتظام ان انگریزی فتوحات کا نتیجہ تھا جو شمال مغربی ہند میں برطانیہ کو انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں حاصل ہوئی تھیں۔ اگرچہ سرحدی معاملوں کی ذمہ داری حکومت ہند پر تھی لیکن عملی حیثیت سے مرکزی حکومت اپنی تمام کارروائیاں حکومت پنجاب کے توسط سے انجام دیا کرتی تھی۔

کرزن نے جب مرکزی حکومت کی معتمدی (سکریٹریٹ) کی اصلاح کی تو اس کے سامنے بعض ایسی اہم کارروائیاں پیش ہوئیں جن کا تعلق سرحدی امور سے تھا اور جن کے متعلق حکومت ہند کو جلد تصفیہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن دو عملی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ کرزن نے محسوس کیا کہ جب تک سرحد کا علٰحدہ صوبہ نہ قایم کیا جائے اس وقت تک وہاں کے نظم ونسق کی اصلاح ممکن نہیں جو زیادہ تر فوجی اور سیاسی معاملوں سے تعلق رکھتا ہے[1]۔ کرزن نے اس ضمن میں وزیر ہند کو جو یادداشت بھیجی اس کو منظور کر لیا گیا اور سنہ ۱۹۰۱ء میں شہنشاہ ایڈورڈ کی سالگرہ کے موقع پر سرحدی صوبے کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا انتظام ایک چیف کمشنر کے تحت رکھا گیا جو براہ راست حکومت کی ہدایتوں پر عمل کرتا تھا۔ صوبہ کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا۔ اس وقت تک اودھ اور موجودہ یوپی کے صوبہ کا نام صوبہ شمال مغربی تھا۔ یہ نام اس زمانے کی یادگار تھا جب کہ انگریزی راج شمالی ہند میں بنگال و بہار تک محدود تھا اور چونکہ یہ علاقہ بہار کے شمال و جنوب میں تھا اس لئے یہ نام پڑ گیا اور کرزن کے عہد تک باقی رہا حالانکہ برطانوی حکومت کی شمال مغربی سرحد بدل کر کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی۔ چونکہ ناموں میں التباس کا اندیشہ تھا اس واسطے شمال مغربی صوبہ کا نام یونائیٹڈ پروانس آف آگرہ اینڈ اودھ (یو۔پی) رکھا گیا۔

انگریزی حکومت کی شمال مغربی سرحد قبائلی علاقوں تک پہنچنے کا لازمی

---

[1] Ronaldshay, The life of curzon. Vol. II, p. 132.

نتیجہ یہ تھا کہ افغانستان سے سیاسی تعلقات پیدا کئے جائیں۔ ایسا کرنے کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ وسط ایشیا میں روس کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا۔ کرزن کے خیالات ہمیشہ سے شہنشاہیت پسندانہ تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی ہند کے اطراف جو ممالک واقع ہیں وہ انگریزوں کے زیر اثر رہیں نہ کہ کسی دوسری یوروپین طاقت کے۔ گورنر جنرل اور وائسرائے ہونے سے قبل جب کرزن ۱۸۹۴ء میں سیاحت کی غرض سے افغانستان گیا تھا تو اس نے امیر عبدالرحمٰن خاں کو یقین دلایا تھا کہ انھیں حکومت ہند سے جو شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کرانے کی کوشش کرے گا۔ ستمبر ۱۹۰۱ء[1] میں امیر عبدالرحمٰن خاں نے وفات پائی اور ان کی جگہ ان کے بڑے فرزند امیر حبیب اللہ خاں تخت و تاج کے مالک بنے۔ کرزن چاہتا تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں حکومت ہند سے جدید معاہدہ کریں جس کے بموجب دونوں حکومتوں کے تعلقات کا تعین ممکن ہو۔ لیکن امیر حبیب اللہ خاں نے اس کو غیر ضروری قرار دیا اور کرزن کو مطلع کر دیا کہ اس کے والد امیر عبدالرحمٰن خاں اور حکومت ہند کے درمیان جو تعلقات پچھلے بیس سال سے چلے آرہے ہیں وہ آئندہ بھی جاری رہیں گے۔ اس پر حکومت ہند نے یہ ادعا کیا کہ امیر عبدالرحمٰن خاں سے جو معاملے انگریزی حکومت نے طے کئے تھے ان کی نوعیت شخصی تھی۔ کرزن کی نیت یہ تھی کہ نئے امیر صاحب سے نیا معاہدہ کرے جس کی رو سے والیٔ افغانستان کی حیثیت ماتحت حکمران کی ہو کر رہ جائے۔ ویسے بھی عام طور سے ماتحت حکمران کے انتقال پر اس کے جانشین سے جدید معاہدہ کیا جاتا ہے تاکہ ان ذمہ داریوں کی توثیق حاصل کر لی جائے جو اس کے پیشرو نے قبول کی تھیں۔ جب کرزن جدید معاہدہ پر اڑا تو امیر حبیب اللہ خاں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ حکومت ہند کے ماتحت نہیں ہیں کہ ایسا کریں۔ چنانچہ حکومت ہند جو ۱۸ لاکھ روپیے سالانہ بطور زر امدادی حکومت افغانستان

[1] Ronaldshay, Ibid., p. 275.

کو دیا کرتی تھی وہ بھی حکومت افغانستان نے وصول نہیں کئے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اپنے نام کے ساتھ ہز مجسٹی کا لقب استعمال کرنا شروع کر دیا جس سے اپنے ملک کی مکمل آزادی جتانا مقصود تھا۔ کرزن نے افغانستان کے متعلق جو کارروائی کی تھی اس کو حکومت برطانیہ پسند نہیں کرتی تھی اس واسطے کہ اس کو روس کا ڈر لگا ہوا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں جب کرزن انگلستان گیا ہوا تھا تو ہوم گورنمنٹ کے ایماء پر منصرم وائسرے لارڈ ایمتھل نے سرلوئی ڈین کو امیر صاحب سے صلح و صفائی کے لئے بھیجا۔ چنانچہ سرلوئی ڈین کی سفارت کامیاب رہی۔ امیر صاحب اور حکومت ہند کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔ امدادی زر کی بقایا رقم حکومت افغانستان نے وصول کر لی اور حکومت برطانیہ اور حکومت ہند نے امیر حبیب اللہ خاں کے لئے ہز مجسٹی کا لقب تسلیم کر لیا۔

خلیج فارس

انیسویں صدی کے آخر میں عدن سے لے کر بلوچستان کے ساحل تک بحری راستے پر انگریزی حکومت نے اپنا اثر قایم کر لیا تھا۔ اس ساحلی علاقہ کے تمام حکمرانوں سے حکومت برطانیہ نے معاہدے کر لئے تھے جن کے موجب یہ حکمران برطانیہ کے علاوہ کسی دوسری یورپین طاقت کو کسی قسم کی رعایتیں دینے کے مجاز نہ تھے۔ خلیج فارس میں بھی برطانوی اثر مانا جا چکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے روس، فرانس اور جرمنی خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سلطان عمان نے حکومت فرانس کو بندرجہ میں بحری اجازت دے دی تھی جہاں کوئلہ کا ذخیرہ فرانسیسی جہازوں کے لئے رکھا جا سکتا تھا۔ اسی زمانے میں سلطان نے برطانوی تاجروں کے مال پر بعض محاصل لگائے جو حکومت برطانیہ کو سخت ناگوار گزرے برطانوی حکومت نے جب اسی ضمن میں حکومت فرانس سے دریافت کیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ ممکن ہے فرانسیسی قونصل نے اپنی ذمہ داری پر کوئی معاہدہ کر لیا ہو جس سے فرانسیسی دفتر خارجہ ناواقف ہے۔ حکومت ہند کو اس کی باوثوق ذریعوں سے اطلاع مل چکی تھی کہ بندرجہ پر فرانسیسی قبضہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ کرزن نے کرنل میڈ کو یہ اختیار دے کر روانہ کر دیا کہ اگر سلطان عمان بندرجہ

سے فرانسیسیوں کو فوراً بے دخل کرنے کا وعدہ نہ کرے تو اس کے محل پر حملہ کر دیا جائے۔ سلطان نے کرنل میڈ کی شرطیں مان لیں اور اس طرح وہ معاملہ جو حکومت برطانیہ اور حکومت فرانس کے درمیان خط وکتابت کے ذریعہ مدتوں میں طے ہوتا چند گھنٹے میں انگریزوں کے موافق طے ہو گیا۔ ہوم گورنمنٹ براہ راست فرانس سے اس موقع پر بگاڑ نہیں چاہتی تھی۔ انگلستان کے وزیر خارجہ لارڈ سالسبری کو اندیشہ تھا کہ خلیج فارس میں اثر ورسوخ کے لئے فرانس سے جو مسابقت ہو رہی ہے اس کا اثر دوسرے خارجی امور پر نہ پڑے چنانچہ جس طرح حکومت فرانس نے اس معاملہ کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ سلطان عمان سے ممکن ہے فرانسیسی قونصل نے اپنی ذمہ داری پر کوئی معاہدہ کر لیا ہو اسی طرح ہوم گورنمنٹ نے بھی خلیج فارس کی سیاست میں راست اقدام کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ گورنر جنرل ہند کی ذمہ داری پر اقدام کرایا جائے جس سے سرکاری طور پر انگلستان کے دفتر خارجہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ غرضکہ دونوں طرف سے سیاست کے داؤں پیچ چلے گئے۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ کرزن کی اولوالعزمی کے باعث فرانسیسیوں کو عمان کی سیاست میں نیچا دیکھنا پڑا۔ بعد میں فرانسیسی جہازرانوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ ان جہازوں کی جن پر حکومت فرانس کا جھنڈا ہو انگریزی ایجنٹ عمان کے ساحل پر تلاشی لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ اس معاملہ نے بہت طول کھینچا۔ آخر ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں یہ جھگڑا پیش ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ فرانسیسی جہازرانوں کو ساحل عمان پر حکومت فرانس کا جھنڈا استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔ نیز یہ کہ سلطان عمان کو ان پر حق عدالت حاصل ہوگا۔ غرضکہ اس طرح فرانسیسیوں کی یہ کوشش کہ خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کریں ناکام رہی۔

جرمنی بھی خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ بغداد ریلوے کا آخری اسٹیشن خلیج فارس کے ساحل پر بنانا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں ساحلی علاقے کے بعض شیوخ سے پٹہ پر زمین حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انگریزی سیاست کاری

نے جرمنی کے ان منصوبوں کو سرسبز نہ ہونے دیا۔ اسی طرح روس بندر عباس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ایران کے بیچ میں سے جو ریل بنانے کی روسی اسکیم تھی اس کے بموجب یہ مقام آخری اسٹیشن ہو۔ ۱۹۰۰ء میں روسی مشن نے خلیج فارس کے علاقوں کا دورہ کیا اور بندر عباس میں ایک روسی قونصل خانہ بھی قایم کیا گیا۔ کرزن روس کے خلاف فوجی قوت استعمال کرنے کی حمایت میں تھا لیکن ہوم گورنمنٹ اس حد تک اس کے ساتھ جانے کو آمادہ نہیں تھی۔ ہاں اس کو اس کی اجازت دی گئی کہ معقول حدوں کے اندر رہ کر روس کا کاٹ کیا جائے۔ چنانچہ خلیج فارس کے مختلف جزیروں میں انگریزی قونصل خانے قایم کئے گئے۔ ساحلی علاقے کے شیوخ اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو امدادی رقم دے کر بٹہ اور تار کی رعایتیں حاصل کی گئیں۔ حکومت ایران کے ساتھ تجارتی استحکام پیدا کرنے کے لئے دو سفارتیں بھیجی گئیں ایک انگلستان کے بورڈ آف ٹریڈ کی طرف سے اور دوسری حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۰۳ء میں لارڈ لینسڈ ون وزیر خارجہ نے پارلیمنٹ میں صاف طور پر اعلان کر دیا کہ خلیج فارس برطانوی حلقۂ اثر رہا ہے اور اب بھی ہے اور یہ کہ وہاں کسی دوسری مملکت کو بحری مرکز قایم کرنے یا قلعہ بندی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اس لئے کہ ایسا کرنے سے برطانوی مفاد خطرے میں پڑ جائے گا۔

کرزن نے ۱۹۰۴ء میں خلیج فارس کا ایک مختصر جنگی بیڑے کے ساتھ دورہ کیا۔ ساحلی علاقوں کے شیوخ سے سیاسی تعلقات استوار کئے گئے۔ اس نے ان شیوخ کو ایک دربار میں بذریعہ اعلان یقین دلایا کہ برطانیہ ان کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں اگر برطانوی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کسی جانب سے کوشش کی جائے تو اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔

کرزن نے جنوبی ایران کو روسی اثر سے بچانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ چنانچہ اس کے اصرار پر ہوم گورنمنٹ نے برطانوی سفیر مقیم طہران کو ہدایت کی کہ روس کو اچھی طرح جتا دیا جائے کہ اگر جنوبی ایران میں حلقۂ اثر قایم کرنے کی

کوشش کی تو برطانوی مفاد سے ٹکرانا لازمی ہوگا جسے کسی حالت میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر حکومت ایران نے اس ضمن میں روس کی ہمت افزائی کی تو برطانیہ کو اس ملک کے متعلق بھی اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی پڑیگی غرضکہ جب روس پر برطانوی حکمت عملی واضح ہوگئی تو ایران میں ریل بناتے اور جنوبی ایران میں بندرگاہ حاصل کرلینے کی کوشش ترک کردی گئی۔ سیستان کو روسی اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے بلوچستان اور سیستان کے درمیان راستہ بنایا گیا جس سے تجارت میں سہولت ہوئی۔ بعدمیں ۱۹۰۷ء میں اینگلورشین کنونشن کے ذریعہ ایران میں روس اور برطانیہ کے حلقہ ہائے اثر کا تعین کردیا گیا تاکہ ان دونوں ملکوں میں ٹکرانے کی نوبت نہ آئے۔ شمالی ایران جہاں روسی اثر پہلے سے موجود تھا پورے طور پر روس کے حلقۂ اثر میں دے دیا گیا۔ خیوا اور بخارا کے فتح ہوجانے کے بعد تقریباً ایک ہزار میل تک روس اور ایران کی سرحد متصل ہوگئی تھی۔ طہران روسی سرحد سے سو میل پر واقع تھا۔ لیکن جنوب میں برطانوی حلقۂ اثر قایم ہوجانے اور دونوں قوتوں کے توازن سے ملک ایران روسی تسلط سے بچ گیا۔

تبت کی مہم تبت پر چینی اقتدار کا بندھن ڈھیلا پڑنے سے روس کو یہاں اپنا اثر بڑھانے کا اچھا موقع ملا۔ چین کے جو دو سفیر (ریزیڈنٹ) تبت کے صدر مقام لہاسا میں رہتے تھے ان کے اقتدار سے اہل تبت اپنے آپ کو آزاد کرانے کی فکر میں تھے۔ یہاں کا حکمران دلائی لاما پر ایک روسی شخص کا بڑا اثر تھا جس کا نام دورجیف تھا۔ وہ بدھ مت کا پیرو اور حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ ۱۸۹۸ء میں حکومت تبت نے اس کو روس روانہ کیا تاکہ وہاں جاکر بدھ مت کے جو ماننے والے ہیں ان سے مذہبی اغراض کی تکمیل کے لئے چندہ جمع کرکے لائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دورجیف مذہبی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام بھی چپکے چپکے انجام دے رہا تھا۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء میں وہ پھر روس گیا اور زار کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی۔ روس کے تمام بڑے بڑے اخباروں میں دورجیف

کے کارناموں پر متعدد کتابیں شائع ہوئے جن میں یہ بات واضح کردی گئی کہ کس طرح وہ روسی اثر کو تبت میں بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب برطانوی سفیر مقیم سنٹ پیٹرزبرگ نے روسی وزیر خارجہ کو دورجیف کی کارروائیوں کے متعلق متوجہ کیا تو اس کو یہ جواب دیا گیا کہ اس کے روس آنے میں کوئی سیاسی محرک کارفرما نہیں ہے بلکہ وہ بدھ مت کے پیرول سے جو سلطنت روس میں آباد ہیں مذہبی تعلقات قایم کرنا چاہتا ہے۔ ادھر حکومت ہند کو بھی دورجیف کی نقل و حرکت اور تبت میں اس کے بڑھتے ہوئے اثر کے متعلق خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کرزن کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ دورجیف روس کا سیاسی ایجنٹ ہے جو تبت میں روسی حلقۂ اثر قایم کرنے کی فکر میں ہے۔[۱] خود دلائی لاما روس کی عظمت سے بیحد متاثر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورجیف نے اس کو یقین دلایا تھا کہ برطانیہ کے مقابلے میں روس کی حکمت عملی تبت کے لئے زیادہ ہمدردانہ ہوگی اس لئے کہ روس میں بھی بدھ مت ماننے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ خود تبت کا مفاد اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی خاطر روس سے سیاسی روابط استوار کرے نہ کہ برطانیہ سے جو عرصے سے تبت میں تجارتی مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھا۔ یہ خبر بھی اسی زمانے میں مشہور ہوئی کہ چین کو تبت پر جو حقوق اقتدار حاصل تھے وہ اسنے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعہ روس کے سپرد کردئیے ہیں۔ یہ خبریں حکومت ہند کے لئے کافی تشویش پیدا کرنے والی تھیں اور خاص طور پر اسلئے اور بھی کہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کی نسبت کسی ذریعہ سے بھی توثیق نہیں کی جاسکتی تھی۔ اہل تبت عرصے سے حکومت ہند سے کسی قسم کے سیاسی یا تجارتی تعلقات قایم کرنے سے بچ رہے تھے اور اس ضمن میں اس کی ہر تجویز کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کرزن نے ہوم گورنمنٹ کو لکھا کہ حکومت ہند ایک فوجی مشن تبت روانہ کرنا چاہتی ہے تاکہ دلائی لاما سے اس کے طرز عمل

---

[۱] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 427.

کے متعلق باز پرس کی جا سکے۔ ہوم گورنمنٹ اس کے اصرار پر آمادہ ہو گئی۔
چنانچہ کرنل ینگ ہسبنڈ کی سرکردگی میں فوج روانہ کر دی گئی۔ اہل تبت کو مطلع کیا گیا کہ کھمبا جنگ کے مقام پر وہ اپنے نمائندے بھیج دیں تاکہ وہاں ان کے اور چین کے نمائندوں سے بات چیت کر لی جائے۔ چین کے نمائندے تو وہاں آ گئے لیکن حکومت تبت نے اپنے نمائندے اس وقت تک بھیجنے سے انکار کیا جب تک کہ برطانوی افواج ان کے سرحدی علاقے کا تخلیہ نہ کر دیں برطانوی فوج کشی کے خلاف روس نے انگلستان کے دفتر خارجہ سے احتجاج کیا جس کا لارڈ لینسڈاؤن نے یہ جواب دیا کہ حکومت تبت کے رویہ نے حکومت ہند کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ نیز یہ یقین دلایا کہ برطانیہ تبت کے کسی علاقے پر قبضہ و تصرف کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ غرضکہ کرنل ینگ ہسبنڈ نے مارچ ۱۹۰۴ء میں گیانتسی پر فوج کشی کر دی۔ اہل تبت جو مقابلے پر آئے انھیں شکست کھانی پڑی۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انگریزی فوج نے لہاسا پر قبضہ کر لیا اور دلائی لاما فرار ہو گیا اور اپنے اختیارات ایجنٹ کے سپرد کر دیئے جس نے ذیل کی شرطوں پر کرنل ینگ ہسبنڈ سے صلح کر لی۔

(۱) یاٹنگ، گیانتسی اور گارٹوک کے شہروں میں تجارتی مرکز قائم کئے جائیں گے اور آیندہ اس ضمن میں کسی روک ٹوک کو روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۲) ایک برطانوی تجارتی ایجنٹ گیانتسی میں رہا کرے گا جسے وقتاً فوقتاً لہاسا جانے کی اجازت ہو گی۔

(۳) حکومت تبت ۷۵ لاکھ روپیئے تاوان جنگ سالانہ ایک لاکھ روپیے کے حساب سے ادا کرے گی۔

(۴) جب تک کہ تاوان کی پوری رقم ادا نہ ہو جائے انگریزی فوجیں وادیٔ چمبی پر قبضہ رکھیں گی جو بھوٹان اور سکم کے درمیان واقع ہے۔

(۵) حکومت تبت کو حق نہ ہو گا کہ اپنے کسی علاقے کو کسی بیرونی طاقت کے حوالے کرے اور نہ کسی بیرونی طاقت کا نمایندہ یا سفیر تبت میں رہے گا۔

(۶) کسی بیرونی طاقت کو تبت میں ریلوے، سڑکیں، تار اور کان کنی کے ضمن میں حقوق نہیں دئیے جائیں گے۔ اگر اس قسم کے حقوق دئیے گئے تو برطانوی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ بھی اس قسم کی رعایتیں حاصل کرے۔

وزیر ہند براڈرک کے اصرار پر تاوان کی رقم بجائے ۷۵ لاکھ کے ۲۵ لاکھ کردی گئی۔ صلح کی شرطوں میں اتنی اور ترمیم کی گئی کہ انگریزی فوجیں وادئ چمبی سے تین سال کے بعد ہٹالی جائیں گی۔

تبت کے سیاسی معاملوں پر پارلیمنٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ روزبری نے کرزن کی خارجی حکمت عملی پر سخت تنقید کی اور بتایا کہ ۱۹۰۳ء کی تبت کی مہم اور ۱۸۷۸ء کی افغانستان کی مہم میں جو لارڈ لٹن نے بھیجی تھی ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں موقعوں پر ہندوستان کی سرحد کی مملکتیں روس سے اتحاد قایم کرنے کی طرف مائل نظر آتی تھیں اور دونوں موقعوں پر قانونی یا اخلاقی حیثیت سے انگریزوں کو اس کا حق حاصل نہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ دخل دیں۔ دونوں موقعوں پر حکومت ہند کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر ان سرحدی ممالک میں روسی سفیر رکھ لئے گئے اور انگریزی نمائندوں کو رکھنے سے انکار کیا گیا تو برطانوی وقار بری طرح متاثر ہوگا۔ دونوں موقعوں پر حکومت ہند نے ہوم گورنمنٹ کو باصرار آمادہ کیا کہ اقدامی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ جس طرح لارڈ لٹن چاہتا تھا کہ کابل میں انگریزی ایجنٹ مستقل طور پر رہے اسی طرح لارڈ کرزن کی خواہش تھی کہ حکومت ہند کا نمائندہ گیانشی یا لہاسا میں رہے۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۸۷۸ء کی دونوں مہموں کے موقع پر روس سے جس قدر خطرہ محسوس کیا گیا وہ حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح افغانستان میں کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ ہوا اسی طرح تبت میں کسی تجارتی یا سیاسی مفاد کی ترقی نہ ہوسکی[1]۔ برطانوی سیاست خارجہ کا رجحان اس زمانے میں یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے روس سے سمجھوتے کی صورت اختیار کی جائے۔ یہ

[1] Roberts, History of British India, p. 537-38.

یہ حکمت عملی ان سیاسی حالات کا نتیجہ تھی جو اس وقت براعظم یورپ میں پیدا ہو رہے تھے اور جن کی وجہ سے انگریزی حکومت روس کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ روس کے اس دعوے کا انگریزوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ اگر لہاسا میں انگریزی ایجنٹ رکھا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وسط ایشیا کی سیاست کا توازن درہم برہم ہو جائے گا۔ ۲ جون ۱۹۰۴ء کو وزیر خارجہ لارڈ لینسڈاؤن نے روسی سفیر کو یقین دلایا کہ اگر یورپ کی کوئی دوسری طاقت تبت کے معاملوں میں دخل نہیں دے گی تو انگریزی حکومت بھی وہاں نہ حلقۂ اثر قایم کرے گی اور نہ اندرونی معاملوں میں کسی قسم کی مداخلت کرے گی۔ بعد میں یہی سمجھوتے کے رجحانات ۱۳ اگست ۱۹۰۷ء کے اینگلو رشن کنونشن کی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اس معاہدہ کی رو سے انگلستان اور روس دونوں نے یہ طے کیا کہ تبت کے متعلق آئندہ انھیں جو بھی کارروائی کرنی ہوگی تو وہ حکومت چین کے توسط سے کی جائے گی۔ دونوں حکومتیں تبت میں نہ تو کسی قسم کی رعایتوں کی خواہاں ہوں گی اور نہ وہاں اپنے ایجنٹ رکھیں گی۔[1]

اندرونی نظم و نسق لارڈ کرزن نے ملک میں انتظامی اصلاحات نافذ کرنے کی طرف خاص توجہ کی۔ بار بار قحط پڑنے کی وجہ سے ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کی مالگزاری وصول کرنے کے اصول پر تنقید کر رہا تھا۔ کاشتکاروں کی حالت واقعی روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ بعض مدبرین کی رائے ہوئی کہ سارے ہندوستان میں دوامی بندوبست نافذ کر دینا چاہئے جس کی تائید مسٹر گوکھلے نے بھی کی تھی۔[2] حکومت کے روبرو یہ تجویزیں بھی پیش کی گئی تھیں کہ کسان سے جو لگان وصول کیا جاتا ہے اس کی نظر ثانی کرنے کا جب وقت آئے تو اس میں اس وقت تک اضافہ نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ حکومت

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 430.

[2] Speeches of Gokhale, p. 21.

کو اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ زمین کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ نیز یہ کہ ہر صوبے میں ایک معینہ اوسط سے زیادہ مالگزاری وصول نہ کی جائیگی۔ کرزن نے کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے ترقی پسند پالیسی اختیار کی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں جو تجویز بابتہ مالگزاری (لینڈ ریونیو ریزولیوشن) منظور کی گئی اس کے بموجب ان مقاموں پر مالگزاری میں تخفیف کی گئی جہاں بارش کی کمی کی وجہ سے فصلیں خراب ہوگئی تھیں اور کاشتکار مقررہ لگان نہیں ادا کرسکتے تھے۔ تشخیص شدہ مالگزاری اور لگان پر نظر ثانی کرنے میں جو قاعدہ کی پابندیاں عاید ہوئی تھیں انھیں اٹھا لیا گیا تاکہ انتظام میں لوچ پیدا ہو جائے۔ تقاوی کے طریقے کو ترقی دی گئی تاکہ کسانوں کی مشکل آسان ہو۔ قانون بابتہ انتقال اراضی صوبۂ پنجاب کی رو سے موروثی کسان کو اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر کسی قرض خواہ کا روپیہ کسان پر ہو تب بھی وہ زمین کی قرقی نہیں کرا سکتا تھا کہ وہ قانونی طور پر انتقال کے ناقابل قرار دی گئی۔ اس طرح مقروض کسانوں کی جو زمینیں قرض خواہوں کی چنگل میں پھنس جایا کرتی تھیں اس سے نجات ملی۔ قرض دینے والے آئندہ احتیاط کرنے لگے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ نئے قانون کے بموجب وہ موروثی کسان کی زمین پر اپنی ڈگری جاری نہیں کراسکیں گے اور اس طرح ان کی رقم خطرہ میں پڑ جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کسان کو جب روپیہ کی ضرورت ہو تو وہ کہاں سے قرض لے۔ ساہوکار موروثی کسانوں کو بے دخل نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ انھیں قرض دینے سے بچنے لگے۔ ہندوستان میں زرعی قرضہ داری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ سیدھے سادے طریقے سے حل ہو جائے۔ فصل خراب ہونے کی صورت میں کسان مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ساہوکار سے قرضہ لے تاکہ بیج اور آلات کاشت کے لئے سرمایہ فراہم کرسکے۔ چنانچہ اس وقت تک جب تک کہ ساہوکار کے بجائے کوئی دوسرا انتظام نہ ہو ہندوستان کی زرعی زندگی میں ساہوکار کی خاص اہمیت ہے۔ لیکن اس کا

یہ مطلب نہیں کہ ساہوکار غریب کسانوں کا خون چوسے اور حکومت ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہے۔ کرزن نے ان تمام مسائل کو ماہروں کے مشورے سے حل کرنے کی کوشش کی۔ مقامی حکومتوں کے مشورے سے امداد باہمی کی اسکیم تیار ہوئی اور مارچ ۱۹۰۴ء میں مجالس امداد باہمی کا قانون حکومت ہند نے منظور کیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں مجالس امداد باہمی قایم کی گئیں تاکہ کسانوں کو ضرورت کے وقت برائے نام شرح سود پر قرضہ مل سکے۔ خاص طور پر بیج اور کھاد وغیرہ کے خریدنے کے لئے قرضے دئے جانے لگے۔ شروع میں امداد باہمی مرکزی حکومت سے متعلق تھی لیکن بعد میں اس کا تعلق صوبجاتی حکومتوں سے کردیا گیا۔ ۱۹۱۱ء تک ہندوستان میں تقریباً ساڑھے تین ہزار مجالس قایم ہوگئیں جن کا سرمایہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیے تھا۔ زراعت کو ترقی دینے کی مختلف تدبیریں کی گئیں پوسا (صوبہ بہار) میں ایک زراعتی کالج قایم کیا گیا جہاں ہندوستان کی زرعی پیداوار کو سائنٹفک طریقوں سے بڑھانے کی تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں اور طلبہ کو زراعت کے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک انسپکٹر جنرل آف اگریکلچر کا عہدہ قایم کیا گیا۔ امپیریل اگریکلچر ڈپارٹمنٹ کے ذمہ یہ کام قرار پایا کہ وہ دیہات میں تجربہ کرنے کے لئے (فارم) مزارع قایم کرے اور ان فارموں کے ذریعہ سے آس پاس کے علاقوں کی فصلوں کو بہتر بنانے اور بیج اور کھاد مہیا کرنے کا کام لیا جائے۔

زراعت کی ترقی کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کئی سال سے ہورہی تھی اور یہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ ملک میں قحط پڑنے کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ کاشتکار لگان ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا لیکن پھر بھی اس سے زیادہ لگان وصول کیا جاتا ہے۔ کئی سالوں کے متواتر قحطوں سے ہندوستان کی معیشت زرعی کا نظام درہم و برہم ہوگیا تھا اور کسانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ کرزن نے

سنہ ۱۹۰۱ء میں سر انتونی میکڈانلڈ کی صدارت میں قحط کے متعلق غور کرنے کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے رپورٹ میں اس بات پر زور دیا کہ پچھلے دنوں قحط کے زمانے میں حکومت کی جانب سے جو امدادی روپیہ رعایا کو تقسیم کیا گیا اس سے مفید مطلب نتیجے حاصل نہیں ہوئے کیونکہ اس سے لوگوں میں اپنی مدد آپ کرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جذبہ نہیں پیدا ہوا بلکہ وہ حکومت کی خیرات کے متوقع رہنے لگے۔ کمیشن نے سفارش کی کہ آئندہ جو امدادی روپیہ دیا جائے وہ بڑی احتیاط سے دیا جائے۔ خاص طور پر بیج اور مویشی خریدنے کے لئے رقم دینی چاہیئے۔ آبپاشی کو ملک کے ہر حصے میں بڑھانا چاہیئے اور لگان معاف کئے جائیں۔ کرزن نے قحط زدہ لوگوں کے لئے سرمائے کا افتتاح کیا جس میں نہ صرف ہندوستان سے بلکہ بیرون ہند سے امیر لوگوں نے چندے دئیے۔ کرزن نے آبپاشی کے محکمے کا میزانیہ پہلے کے مقابلہ میں دوگنا کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں سر کالن اسکاٹ مانکریف کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ آبپاشی کو وسعت دینے کے امکانوں پر غور کرے۔ کمیشن نے آبپاشی کو وسیع کرنے کی پر زور سفارش کی۔ کرزن نے حکومت ہند کی مالی حالت کے لحاظ سے اپنے عہد حکومت میں آبپاشی کی ترقی کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں وہ قابل تعریف ہیں۔

پولیس کا محکمہ پولیس کا انتظام برطانوی نظم و نسق کے لئے کبھی باعث فخر نہ ہو سکا۔ پولیس بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو رعایا کا خادم تصور کرتی وہ اپنے تئیں غیر ملکی حکمرانوں کا آلہ کار سمجھتی تھی۔ عام طور پر اس محکمہ میں رشوت ستانی رائج تھی جس کی روک تھام کی کوئی قابل لحاظ کوشش نہیں کی گئی۔ کرزن نے سنہ ۱۹۰۲ء میں وزیر ہند سے مشورہ کرنے کے بعد سر اینڈرو فریزر کی صدارت میں تمام صوبوں میں پولیس کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ پورے ملک میں اصلاح کا ایک ہی قسم کا منصوبہ اور خاکہ تیار کیا جا سکے[1]۔ کمیشن نے تمام ملک

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 372.

کا دورہ کرکے ہر جگہ کے مقامی حالات کی مفصل چھان بین کی اور ۱۹۰۳ء
میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ کمیشن نے بتلایا کہ پولیس کا انتظام موجودہ حالت
میں حکومت کے لئے بدنامی کا موجب ہے۔ بددیانتی اور رشوت ستانی عام
ہے۔ پولیس کے عہدہ داروں کی ٹریننگ کا جیسا انتظام ہونا چاہئے ویسا
نہیں کیا جاتا۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ پولیس کی تنخواہ میں اور جوانوں
کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے۔ اس کا اچھا اثر مترتب ہوگا۔ ہر صوبہ میں
صوبجاتی پولیس سروس ہونی چاہئے اور ٹریننگ اسکول کھولنے چاہئیں۔
کرزن نے اپنے عہد حکومت میں پولیس کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی
اور بجٹ میں ۵۰ لاکھ روپئے سالانہ پولیس کے محکمے کی توسیع کے لئے خاص
کروئے گئے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں سیاسی حالات کروٹ بدل رہے
تھے کرزن نے خاص طور پر خفیہ پولیس کی تنظیم پر کافی روپیہ خرچ کیا۔ کرزن
نے اپنے قیام ہندوستان کی آخری بجٹ کی تقریر میں اس کا ذکر کیا کہ
کمیشن نے جن اصلاح کی صورتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان کو عملی جامہ پہنانے
کی جلد کوشش کی جائے گی۔ پولیس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ وہ
اپنی آمدنی بڑھانے کے دوسرے ناجائز ذریعوں سے بے نیاز ہوجائے۔
حکومت کی پوری کوشش رہے گی کہ ہندوستان اور انگلستان کی آبادی کے
بہترین عناصر ہندوستان کی پولیس سروس میں شریک ہوا کریں تاکہ رعایا
کی بھلائی اور حفاظت کی تدبیریں عمل میں لائی جاسکیں۔

محکمہ آثار قدیمہ کرزن کو ہمیشہ سے علم تاریخ کا ذوق تھا۔ وائسرائے ہونے سے پہلے جب
وہ بہ حیثیت ایک سیاح کے ہندوستان آیا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ آثار قدیمہ کی
حفاظت کی طرف حکومت کو جتنی توجہ کرنی چاہئے وہ نہیں کررہی ہے۔ آثار قدیمہ کی دیکھ بھال
کا کام ضلع کے حکام اعلیٰ کے ذمہ تھا جن کے پاس پہلے سے انتظامی کام اتنا زیادہ ہوتا تھا
کہ وہ اس جانب ظاہر ہے زیادہ توجہ نہیں کرسکتے تھے۔ پھر چونکہ آثار قدیمہ کے
متعلق ان کی معلومات کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا اس لئے اگر وہ توجہ
کرنے کی کوشش بھی کرتے تو کوئی مفید نتیجہ نہ حاصل ہوتے۔ شاید آثار قدیمہ

کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ حکام ضلع نے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے انھیں اپنا تختۂ مشق نہیں بنایا۔ کرزن نے آثار قدیمہ کا ایک مستقل محکمہ سرجان مارشل کی نظامت میں قایم کیا اور ایک قانون کے ذریعے تحفظ آثار قدیمہ کا انتظام کیا گیا۔ بعض قدیم عمارتوں پر لوگوں نے کس مپرسی کے زمانے میں قبضہ وتصرف جما لیا تھا۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی۔ بعض پرانی عمارتوں کی درستی کرائی گئی تاکہ انھیں جہاں تک ممکن ہو اصلی حالت میں قایم رکھا جائے۔ سرجان مارشل کی سرکردگی میں ملک کے مختلف حصوں میں کھدائیوں کا کام سرانجام پایا جس کی بدولت ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

محکمہ صنعت وحرفت اور ریلوے

اگرچہ انگریزی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ صنعت وتجارت کے معاملوں سے بے تعلق رہے لیکن اب حالات ایسے پیدا ہو رہے تھے کہ حکومت زیادہ عرصے تک ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی کو اپنے حلقۂ عمل سے باہر نہیں تصور کر سکتی تھی۔ کرزن نے صنعت وحرفت وتجارت کے لئے ایک محکمہ قایم کیا جس کا صدر وائسرائے کی کونسل کا رکن ہوتا تھا۔ حکومت ہند کی جانب سے ایک ہفتہ داری رسالہ بھی جاری کیا گیا تاکہ تجارتی معلومات کی اشاعت عمل میں آئے۔ کرزن کے عہد حکومت میں ریلوں کی توسیع عمل میں آئی۔ اس کے ایما پر انگلستان سے سر ٹامس رابرٹسن کو جو ریلوے کے معاملوں کا مشہور ماہر تھا، ہندوستان روانہ کیا گیا تاکہ وہ اس ملک کی ریلوں کے لائحہ عمل تجویز کرے۔ ایک ریلوے بورڈ قائم کیا گیا تاکہ ریلوے کے مخصوص مسائل اس کے ذمہ رہیں اور حکومت اس کی ماہرانہ رائے پر عمل کرے۔ اب تک ریلوے کا محکمہ بھی مرکزی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی شاخ تھی۔ لیکن اب ریلوے کے تمام معاملے ریلوے بورڈ کے سپرد کر دئے گئے جس کو وسیع انتظامی اختیارات حاصل تھے۔ بورڈ کو ان لائنوں پر جو کمپنیوں کی تھیں اور ان پر بھی جو حکومت کی تھیں نظم ونسق کے اختیارات

تفویض کرنے سے پورے ملک میں ریلوے کے انتظام میں یکسانیت پیدا ہوگئی۔

کلکتہ میونسپل کارپوریشن کی جدید تنظیم

کرزن کے عہد حکومت سے پہلے لارڈ الجن کے زمانے میں کلکتہ کے میونسپل کارپوریشن پر غیر کارکردگی کا الزام لگایا جاچکا تھا۔ کرزن کے آنے کے بعد ہی بنگال کے لفٹننٹ گورنر الگزنڈر میکنزی نے لجسلیٹو کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جسکا مقصد یہ تھا کہ عاملانہ اختیارات منتخب شدہ ارکان کے ہاتھ سے نکال کر ایک کمیٹی کے سپرد کردیئے جائیں جسے حکومت نے نامزد کیا ہو۔ کارپوریشن کے صدر کو بھی اس کمیٹی کے ماتحت کردیا گیا۔ اس پر بنگال کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اس لئے کہ کارپوریشن میں منتخب شدہ ارکان کو رپن کے زمانے سے جو حقوق حاصل تھے ان سے وہ کسی صورت میں بھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھے۔ جب زیادہ گڑبڑ ہوئی تو تھوڑے دنوں کے لئے مسودہ کو قانون نہیں بنایا گیا اور وزیر ہند سے مشورہ طلب کیا گیا۔ لیکن اس دوران میں کرزن کے ایماء پر مسودہ میں جو تبدیلیاں کی گئیں وہ اور بھی زیادہ حقوق کو زائل کرنے والی تھیں۔ مثلاً اب تک کارپوریشن کے کل ارکان کی تعداد ۷۵ تھی جن میں سے ۵۰ منتخب شدہ ہوتے تھے۔ باقی ۲۵ نامزد شدہ ارکان تھے جو عام طور سے یورپین ہوتے تھے۔ کرزن کے ایماء پر منتخب شدہ رکنوں کی تعداد ۲۵ کردی گئی اور نامزد شدہ کی ۵۰۔ یہ مسودۂ قانون منظور ہوگیا۔ بنگال میں اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ کارپوریشن کے ۲۸ ارکان نے استعفی دے دیا۔ بنگال میں احتجاج کے جلسوں میں اس قانون کو مقامی حکومت خود اختیاری کے اصول کے منافی اور رجعت پسندانہ بتلایا گیا۔ اس قانون کے منظور ہونے سے ہندوستان کے قومیت پسند طبقے اور کرزن میں اختلاف شروع ہوگیا جو روز بروز بڑھتا گیا۔

تعلیمی پالیسی

کرزن کی تعلیمی حکمت عملی کو ہندوستان کا قومیت پسند طبقہ شبہہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۱ء میں شملہ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس میں ہر صوبے سے سرکاری ماہرین تعلیم کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس میں رائج الوقت نظام تعلیم پر کرزن

نے سخت تنقید کی اور بتایا کہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم سے اگرچہ اہل ہند کو یقیناً بہت فائدہ ہوا لیکن اس پورے تعلیمی نظام میں سیرت سازی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور زیادہ تر امتحانوں کا بھوت سر پر سوار رہا۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ ضرورت اس کی ہے کہ وسطانی اور ابتدائی تعلیم کو ملک میں عام کیا جائے تاکہ اہل ملک کو حقیقی فائدہ حاصل ہو۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہونی چاہئے[1]۔ اس کے علاوہ کرزن نے اس بات پر زور دیا کہ یونیورسٹیوں کی انتظامی جماعتوں یعنی سنڈیکیٹس اور سینیٹس کی اس طور پر تشکیل ہونی چاہئے کہ سیاست کا اثر ان میں راہ نہ پائے۔ اس کانفرنس میں جتنی تجویزیں پیش ہوئیں ان سب کا مسودہ خود کرزن نے تیار کیا تھا[2]۔ ان تجویزوں میں ملک کے تعلیمی انتظام میں بنیادی تبدیلی کی سفارشیں کی گئی تھیں۔ ان سفارشوں کے بموجب سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک ڈائرکٹر جنرل آف پبلک ایجوکیشن کا تقرر کیا گیا تاکہ وہ پورے ملک کے تعلیمی نظام پر نگرانی رکھ سکے۔ اسی سال یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ اعلیٰ تعلیم کے مسئلہ کے متعلق چھان بین کرکے حکومت کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیشن میں صرف دو ہندوستانی شریک کئے گئے۔ ایک سید حسین بلگرامی اور دوسرے جسٹس گرو داس بنرجی۔ کمیشن کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد امپیریل مجلس قانون ساز میں مسودہ بابت تنظیم جامعات (یونیورسٹیز بل) پیش ہوا جس کی مسٹر گوکھلے اور دوسرے ہندوستانیوں نے سخت مخالفت کی۔ لیکن سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ مسودہ قانون بنا دیا گیا۔ اس کی رو سے جامعات کو اندرونی نظم و نسق کے پورے اختیارات دئے گئے۔ رفقاء کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہوگی اور ان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔ نامزد شدہ ارکان کو منتخب شدہ ارکان کے مقابلے میں اکثریت حاصل

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 350.

[2] Ronaldshay, The life of Lord Curzon, Vol. II, p. 191.

ہو گی۔ اسکولوں کو تسلیم کرنے اور ان کے الحاق کے متعلق حکومت کو فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں گے۔ صرف وہ طلبہ جو ملحقہ کالجوں میں تعلیم ختم کرچکے ہیں جامعہ میں شرکت کے مجاز ہوں گے۔ تمام ملحقہ کالجوں کا سرکاری طور پر معائنہ ہوا کرے گا۔ خانگی کالجوں کے قایم کرنے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری قرار دی گئی۔ مجلس رفقاء (سینٹ) معمولاً اسکی مجاز ہوگی کہ یونیورسٹی کے انتظام کے ضمن میں قاعدے اور ضابطے بنائے لیکن حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان قاعدوں میں تبدیلی یا ترمیم کرسکے۔

قانون جامعات (یونیورسٹیز ایکٹ) کے منظور ہونے پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ سریندرا ناتھ بنرجی نے بنگال میں اس قانون کی مخالفت میں خاص حصہ لیا۔ اور انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اس ضمن میں سخت تشویش کا اظہار کیا۔ خاص طور پر اس وجہ سے بے چینی پیدا ہوئی کہ یہ قانون ان تعلیمی اداروں کی ترقی کو روکنے والا تھا جو نجی طور پر ملک کے مختلف حصوں میں قایم ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ اس کا مقصد یونیورسٹیوں کی انتظامی جماعتوں کو سرکاری اثر میں لانا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی حد بندی سے گورنمنٹ یہ چاہتی تھی کہ غیر قانع طلبہ کی تعداد میں کمی ہو جو عام طور سے سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ قانون کی تعلیم پر بھی بعض قیدیں عاید کی گئیں جن کا یہ مطلب لیا گیا کہ چونکہ وکیلوں کا طبقہ آزاد منش ہوتا ہے اس لئے اس طبقہ کی تعداد میں اضافہ انگریزی حکومت کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ اس طبقہ کے لوگ یونیورسٹی کی عاملانہ جماعتوں میں منتخب ہو کر حکومت پر تنقید کرتے تھے جو کرزن کو ناپسند تھا۔ اور چونکہ خاص طور پر کلکتہ یونیورسٹی پر آزاد منش طبقہ کا اثر بڑھتا جاتا تھا اس واسطے کرزن نے اس یونیورسٹی پر اور ضمنی طور پر دوسری یونیورسٹیوں پر حکومت کے قابو اور اختیارات کو مضبوط کرنے کی تدبیریں اختیار کیں۔ لیکن ان تدبیروں سے اہل ہند کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔

تقسیم بنگال

قانون جامعات کی وجہ سے جو عام بے چینی پیدا

ہوگئی تھی اس کی لہریں ابھی دبی بھی نہ تھیں کہ حکومت نے تقسیم بنگال کے انتظام سے رہا سہا بھروسا بھی کھو دیا۔ سرکاری حلقوں میں عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ بنگال کے وسیع صوبے کو ایک لفٹنٹ گورنر کے تحت رکھنے سے انتظامی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ چنانچہ سر اینڈ روز فریزر لفٹنٹ گورنر بنگال کی تجویز تھی کہ ڈھاکہ، میمن سنگھ اور چٹا گانگ کو آسام کے ساتھ ملا دیا جائے تو لفٹنٹ گورنر بنگال کا کام بڑی حد تک ہلکا ہو جائے گا۔ یہ محض ایک انتظامی تجویز تھی۔ کرزن نے اس تجویز کو جو رنگ دیا وہ سیاسی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جو تعلیم اور ثروت میں بنگالی ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں ایک نیا صوبہ بنا دینا چاہئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ انتظامی مقصد بھی حاصل ہو جائیگا اور مسلمانوں کو علحدہ صوبہ بن جانے کی صورت میں ترقی کے زیادہ موقعے حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ بنگال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں انقلابی خیالات نشو و نما پا رہے تھے اس لئے شہنشاہی مقصدوں کے لئے ان کے اثر کے خلاف مسلمانوں کو استعمال کرنا ممکن ہو گا۔ کافی غور و فکر کے بعد ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگال کا علحدہ صوبہ قایم کر دیا گیا جس کا صدر مقام ڈھاکہ قرار پایا۔ یہ صوبہ ڈھاکہ، راج شاہی اور چٹا گانگ کی قسمتوں (ڈویژنز) اور آسام پر مشتمل تھا۔ آسام کے چیف کمشنر کے عہدہ کو تخفیف کر کے مشرقی بنگال کیلئے ایک لفٹنٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ نئے صوبہ میں ایک علحدہ مقننہ اور ایک بورڈ آف ریونیو بھی قایم کیا گیا[1]۔ اس پوری اسکیم کی تائید وزیر ہند سے حاصل کر کے اس کو فوراً نافذ کر دیا گیا۔

بنگال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے تقسیم بنگالہ کی سخت مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس اسکیم کو نافذ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنگالی بولنے والی قوم کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے تاکہ اس کی یک جہتی اور اتحاد ہمیشہ

---

[1] Ronaldshay, Ibid., p. 329.

کے لئے کمزور ہو جائے۔ اگرچہ ظاہر میں تقسیم بنگال کی اسکیم کو انتظامی رنگ میں پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک سیاسی چال ہے اہل بنگال کے فکر و عمل کو منتشر کرنے کی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی تقسیم بنگال کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ بنگال کے لیڈروں نے انگریزی حکومت سے انتقام لینے کے لئے برطانوی تجارتی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریک کو فروغ دینے کی جو کوشش شروع کیں انھیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی قبول عام حاصل ہوا۔ تقسیم بنگال کو قومی رنگ دینے کے لئے مسلمانوں کی تائید بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بنگال کے مسلمانوں نے سر سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ کی صدارت میں جو کانفرنس منعقد کی اس میں تقسیم بنگال کی تائید کی اور اس کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے ضروری بتلایا کہ بغیر اس انتظام کے ان کی پستی اور ادبار کو دور کرنا ممکن نہیں۔ بنگال کے مسلمانوں کی تائید حاصل کرنا کرزن کی سیاست کاری کی زبردست کامیابی تھی۔

لیکن تقسیم بنگال کے ضمن میں جو شورش پیدا ہوئی اس کے اثرات سارے ملک کی سیاست پر پڑنے لگے۔ بنگال میں دہشت انگیزی کی تحریک نے جنم لیا جس کا مقصد انگریز عہدہ داروں کو قتل کرنا تھا۔ پورے بنگال میں خفیہ انقلابی انجمنوں کا جال بچھ گیا۔ بہت سے نوجوانوں نے انگریزوں سے ملک آزاد کرانے کو مذہبی مقصد قرار دیا۔ اپنی مالی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے وہ دولتمند لوگوں کو لوٹنا اور قتل و غارت کرنا جائز سمجھتے تھے۔ اس خفیہ انقلابی تحریک کے اثرات مہاراشٹر اور پنجاب تک پہنچے جہاں اس قسم کی خفیہ انجمنیں وجود میں آئیں جو دہشت انگیزی کے ذریعہ ملک کو نجات دلانے کا خواب دیکھ رہی تھیں ان جماعتوں میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ شرکت کرتے تھے اور انھیں میں سب سے زیادہ جوش اور جذبہ پایا جاتا لیکن ملک کی باقی آبادی ان تحریکوں سے بے تعلق رہی۔

دیسی ریاستیں

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ریاستوں کی حیثیت برطانوی شہنشاہی نظام میں ایک لازمی جزو کی ہوگئی تھی الحاق کے بجائے ان پر نگرانی کا اصول مسلم ہو چکا تھا اور حکومت ہند کا پولٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے اندرونی نظم ونسق میں کبھی کبھی اپنی صوابدید کے موافق دخل دیتا رہتا تھا۔ رسل ورسائل کی ترقی تجارت کا فروغ اور برطانوی ہند میں شعور عامہ کی بیداری یہ سب اسباب ایسے تھے کہ جن سے ریاستیں عرصے تک غیر متاثر نہیں رہ سکتی تھیں۔ ریلوں اور تار برقی کی توسیع سے بالادست قوت سیاسی امور کے علاوہ ریاستوں کے معاشی معاملوں میں بھی دخیل ہوگئی۔ چونکہ والیان ریاست کو غدر کے بعد اس کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ ان کے علاقے برطانوی ہند میں ملحق کر لئے جائیں گے اس لئے انھوں نے بالادست قوت کے معاشی نفوذ کو خوشی سے گوارا کر لیا۔

کرزن کی عام حکمت عملی کا اقتضا یہ تھا کہ وہ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں بالادست قوت کی نگرانی کے اصول کو اور زیادہ کڑا کر دے اس کا خیال تھا کہ ریاستوں کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ حکومت ہند پرانے معاہدوں کا لحاظ کئے بغیر تمام ریاستوں کے ساتھ چاہے وہ معاہداتی ہوں یا غیر معاہداتی اپنی حکمت عملی کی یکسانی قایم کرے تاکہ ایک ریاست کے معاملوں میں جو عملدرآمد کیا گیا وہ دوسری ریاست کے لئے نظیر بن سکے[1]۔ کرزن کے نزدیک والیان ریاست کی حیثیت حکومت ہند کے ایجنٹوں کی تھی جن کے جملہ حقوق واختیارات کا ماخذ تاج تھا[2]۔ اسکے عہد حکومت میں ریاستوں پر برطانوی تفوق اور اقتدار کا نفوذ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ اسکے پیش نظر جو شہنشاہی مقاصد تھے انکی تکمیل کے لیے وہ ضروری سمجھتا تھا کہ ریاستوں پر حکومت ہند کی نگرانی میں اضافہ ہو۔ وہ اصول اور ضابطے جنکا اطلاق حکومت ہند

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 505.

[2] The British Crown and the Indian States, p. 91.

کا پولٹیکل ڈپارٹمنٹ بلالحاظ اس امر کے کہ کونسی ریاست معاہداتی مرتبہ رکھتی ہے اور کونسی غیر معاہداتی عرصے سے کر رہا تھا۔ ان ضوابط کو کرزن نے ایک مخصوص حکمت عملی کی حیثیت سے متعین کر دیا۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں اس نے گوالیار میں جو تقریر کی اس میں اس حکمت عملی کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے۔

"ہماری حکمت عملی کی وجہ سے دیسی رئیس کو ہندوستان کے شہنشاہی نظام میں ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ملک کے نظم ونسق کے ساتھ اس کا تعلق اس سے کم نہیں جو وائسرائے یا لفٹنٹ گورنر کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کو اپنا ساتھی اور شریک کار سمجھتا ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ شہنشاہی نظام میں اس کی حیثیت ملکۂ معظمہ کے ایک وفادار فرد کی ہو اور وہ خود اپنے لوگوں کے روبرو ایک چھچھورا اور غیر ذمہ دار جابر بن جائے۔ اس کو جو اختیارات دئے گئے ہیں انھیں اس کو معقول طریقے سے استعمال کرنا ہوگا اور یہ حق بجانب ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ان کا مستحق ہے۔ ضرور ہے کہ وہ اپنی رعایا، کا آقا بھی ہو اور خادم بھی۔[1]

جس طرح ڈلہوزی کے عہد میں دیسی ریاستوں کا برطانوی ہند میں الحاق اس بنا پر درست تصور کیا گیا تھا کہ ایسا کرنے سے وہاں کے لوگوں کو تعلیم اور ترقی کے بہتر مواقع حاصل ہوسکیں گے۔ اسی طرح کرزن نے ریاستوں کے نظم ونسق میں حکومت ہند کے تفوق اور اقتدار کو موثر بنانے کی کوشش کی تاکہ انتظامی کارکردگی میں اضافہ ہو اور وہ اس کی ماتحتی کے حلقہ سے جدا ہونے کی کبھی جرات نہ کرسکیں۔ وہ والیان ملک کو ملک کے نظم ونسق میں برابر کا رتبہ نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ وائسرائے کی ہدایتوں اور احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرتے

[1] Raleigh, Curzon in India, p. 217.

رہیں۔ چنانچہ رئیسوں سے خطاب کرتے وقت وہ ہمیشہ ان کے حقوق سے زیادہ ان کے فرائض پر زور دیا کرتا تھا۔ اگرچہ غدر کے بعد سے حکومت ہند دیسی ریاستوں کے معاملوں میں اپنے اختیارات کو برابر وسیع کرتی رہی اور ریاستوں کے معاہداتی حقوق اور والیان ریاست کے مرتبہ میں برابر کمی ہوتی رہی لیکن اس مداخلت کو حق بجانب ثابت کرنے اور مداخلت کو کھلم کھلا کرزن سے پہلے کسی وائسرائے نے سراہا نہ تھا۔ نواب بھاول پور کی گدی نشینی کے موقع پر اس نے جو تقریر کی اس سے اسکے شہنشاہی منصوبوں کی صراحت ہوتی ہے۔ اس نے کہا:-

"ہندوستان کا سیاسی نظام نہ جاگیری ہے اور نہ وفاقی یہ کسی دستور کی شکل بھی نہیں رکھتا۔ اس کا انحصار ہر حالت میں معاہدہ پر نہیں اور نہ کسی لیگ سے اس کو مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظام تاج اور ہندوستانی رئیسوں کے تعلقات کے ایسے سلسلہ کو ظاہر کرتا ہے جو مختلف اور جداگانہ تاریخی حالات میں نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ لیکن بتدریج امتداد زمانہ سے ان تعلقات میں یکسانی پیدا ہو گئی ہے۔ تاج کا اقتدار اعلیٰ بلا شرکت غیرے مسلم ہے۔ اس نے اپنے اختیارات پر خود بعض حد بندیاں عائد کر لی ہیں ..... تعلقات کی یہ کڑیاں جنھوں نے حکومت برطانیہ اور ہندوستانی ریاستوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے لوہے کی بیڑیاں نہیں ہیں جو طاقتور نے کمزور کو پہنائی ہیں اور نہ یہ ایسی مصنوعی بندشیں ہیں جو کسی غیر معمولی بار سے ٹوٹ جائیں بلکہ یہ وہ ریشمی تار ہیں جن سے باہمی فخر، احساس فرائض ذاتی قربانی اور احترام کی مضبوط ڈوری بنائی گئی ہے"[1]

کرزن کی اس حکمت عملی کو جس میں سرپرستانہ انداز پایا جاتا تھا والیان ملک پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر کو اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی حکومت نے اگر الحاق کی پالیسی ترک کر کے

---

[1] Raleigh. Curzon in India, p. 227.

بالا دستی کو منوانے کی پالیسی اختیار کی ہے تو یہی غنیمت ہے۔ ان کا وجود تو بسطح برقرار رہ سکے گا۔ لیکن کرزن نے برطانوی تفوق اور بالا دستی کو منوانے کا سوال محض نظری حیثیت سے نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے پیش نظر بعض عملی مسائل تھے۔ اس لئے صرف فوجی امور اور خارجی حکمت عملی کی نگرانی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ریاستوں کے اندرونی معاملوں میں بھی برطانوی مداخلت کو حق بجانب ٹھہرایا۔ جو والیان ریاست سیر و سیاحت کے لئے یورپ جایا کرتے تھے ان کی نقل و حرکت پر کرزن نے قیدیں لگادیں۔ آئندہ سے وہ بغیر حکومت ہند کی اجازت کے ریاست کے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ اس پر بعض والیان ریاست بہت چراغ پا ہوئے لیکن کچھ نہ کر سکے۔ اس لئے اس ضمن میں جو گشتی جاری کرائی اس میں صراحت کر دی گئی کہ والیان ریاست کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی رعایا کی خدمت کریں۔ اسی کے صلہ میں بالا دست قوت نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ سیر و تفریح میں اپنا وقت صرف نہ کریں بلکہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے سیر و تفریح کا چسکا لگنے کے بعد والئ ملک اپنی رعایا سے دور ہو جاتا ہے اور ریاست سے باہر رہ کر یہ ممکن نہیں کہ فرائض کی انجام دہی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا جا سکے۔ باہر جانے کے لئے اجازت حاصل کرنے کے ضمن میں حکومت ہند نے یہ واضح کر دیا کہ کسی رئیس کا بار بار اپنی ریاست سے باہر جانا فرائض عامہ کے منافی سمجھا جائے گا۔ اس وقت تک باہر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ حکومت ہند کو اطمینان نہ ہو جائے کہ ایسا کرنے سے والئ ملک اور رعایا دونوں کو کسی نہ کسی قسم کا فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک مرتبہ اجازت مل جانے کے بعد دوسری مرتبہ اس وقت تک اجازت نہیں ملے گی جب تک کہ کافی وقفہ نہ گزر گیا ہو۔[۱]

---

[۱] Ronaldshay, Ibid., p. 91.

اس میں شبہہ نہیں کہ کرزن نے والیان ریاست کی نقل و حرکت کے متعلق جو پابندیاں عاید کیں وہ غیر ضروری تھیں۔ ان سے لازمی طور پر والیان ریاست کے حلقے میں سخت بے چینی پیدا ہوئی اور ان قیدوں کو انھوں نے اپنے خلاف شان سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرزن میں باوجود علمی قابلیت کے تخیل کی بڑی کمی تھی۔ جس طرح اس نے اپنے طرز عمل سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اپنا مخالف بنا لیا اسی طرح والیان ریاست کے جذبات سے بے پروائی برت کر اس نے ان کی ہمدردی حاصل نہیں کی۔ کرزن کی دخل دہی کو وہ اپنے اعزاز و وقار کے منافی خیال کرتے تھے۔

کرزن کے پیش نظر یہ تھا کہ ریاستیں اپنے آپ کو برطانوی ہند سے الگ تھلگ نہ سمجھیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ حکومت ہند کی حکمت عملی کی یکسانی ان سبھوں کے معاملوں کی نگران رہے۔ اس ضمن میں وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ والیان ریاست کی ایک کونسل قایم کی جائے۔ کم و بیش اسی قسم کی تجویز لارڈ لٹن کے پیش نظر رہی تھی۔ کرزن محسوس کر رہا تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جو خیالات و جذبات پیدا ہو رہے ہیں وہ آخر انگریزی عملداری کے لئے مہلک ثابت ہوں گے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ والیان ریاست کو کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر کے خلاف اجتماعی صورت میں استعمال کر سکے[1]۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ریاستیں دفاعی معاملوں میں حکومت ہند کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ اس نے تجویز کی کہ ہر ریاست اپنی آبادی کے تناسب سے فوجی امداد دیا کرے۔ امپیریل سروس ٹروپس کی جدید تنظیم کے بموجب یہ فوجیں حکومت ہند کے تحت کر دی گئیں اور ان کے اخراجات کا بار ریاستوں کے خزانہ پر رہا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں دہلی میں کرزن نے نہایت شاندار دربار کیا جس میں ہندوستان کے تمام والیان ریاست نے شرکت کی۔ اس سے اسکا مقصد

[1] Lord Merley, Recollections; Vol. II, p. 176.

یہ تھا کہ برطانوی صوبوں اور ریاستوں میں ایک مشترکہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ شہنشاہیت کے اجزاء ہیں۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کا اعلان کیا جائے لیکن اصل میں وہ والیان ریاست کو اس موقع پر جتا دینا چاہتا تھا کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کے ماتحت ہیں اور ان کی حیثیت کل پرزوں سے زیادہ نہیں۔ بعض والیان ریاست کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس سے ان میں کرزن کے خلاف مخالفت کا جذبہ بڑھ گیا۔[1]

کرزن کے عہد حکومت میں ریاست اندور کے مہاراجہ کو بدانتظامی کی علت میں ہٹا کے اس کے کمسن لڑکے کو اس کی جگہ گدی نشین کیا گیا۔ لڑکے کی نابالغی کے زمانے تک ریاست کا انتظام ایک مجلس تولیت (کونسل آف ریجنسی) کے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مہاراجہ کشمیر کے اختیارات جو ۱۸۸۱ء میں چھین لئے گئے تھے واپس کئے گئے۔

ریاستوں سے متعلق ایک خاص اصلاح کرزن کے عہد حکومت میں عمل میں لائی گئی جس کا بہت اچھا اثر مترتب ہوا۔ کرزن کے زمانے تک یہ طریقہ رائج تھا کہ ریاستوں میں جو ریزیڈنٹ مقرر کئے جاتے تھے ان کی تنخواہ تو انگریزی حکومت ادا کرتی تھی لیکن ان کے اسٹاف کے دورے کے اخراجات متعلقہ ریاست کے ذمہ ہوتے تھے۔ لیکن اکثر اوقات ریزیڈنٹ اور اس کے اسٹاف کے سارے ذاتی اخراجات ریاست ہی کے خزانے سے ادا ہوا کرتے تھے۔ کرزن نے اس طریقے کو قطعی طور پر بند کر دیا۔ اور حکومت ہند کے جو حکام ریاستوں میں مقرر ہوتے تھے انھیں سختی سے منع کر دیا گیا کہ وہ کسی قسم کا خرچ بھی ریاست سے نہ لیں۔

برار کا دوامی پٹہ

۱۹۰۱ء میں نواب وقارالامرا کے انتقال پر مہاراجہ سرکشن پرشاد ریاست حیدرآباد کے مدارالمہام ہوئے۔ ابھی انھوں نے مدارالمہامی کا جائزہ لیا ہی تھا کہ برار کا مسئلہ درپیش ہوا۔

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 92.

نواب سر سالار جنگ کی مدار المہامی کے زمانے میں برار کی واپسی کا سوال اٹھایا گیا تھا لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں جب کہ وہ انگلستان تشریف لے گئے تھے تو انھیں اتنا یقین دلایا گیا تھا کہ جب ہز ہائینس نواب میر محبوب علیخاں ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینگے تو سرکار نظام کے ان معاملوں پر جو از روئے معاہدہ طے ہوئے ہیں نظر ثانی کی جائے گی۔ لیکن ۱۸۸۳ء میں نواب سر سالار جنگ کے انتقال کی وجہ سے برار کی واپسی کا مسئلہ کچھ عرصے تک پس پشت پڑا رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں امساک باران اور قحط کے باعث ریاست حیدرآباد کی مالی حالت خراب ہوگئی تھی اور دو کروڑ کے قریب قرض ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں سرکار نظام نے برار کی آمدنی کے متعلق حکومت ہند کو لکھا۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدے کے بعد سے سرکار نظام کو برار کے سپرد کئے ہوئے علاقوں میں سے جو آمدنی از روئے معاہدہ ملنی چاہئے تھی وہ نہیں ملی۔ سرکار نظام کے لکھنے پر کرزن کو اس کا موقع مل گیا کہ من مانے طور پر برار کے متعلق تصفیہ کرے۔ برار کے مسئلہ کا حل اس کے نزدیک یہ تھا کہ سرکار نظام کو برار کے علاقے سے ایک معین آمدنی حاصل ہو سکے۔

۱۹۰۲ء کے شروع میں کرزن خود حیدرآباد آیا تاکہ برار کے مسئلہ کے متعلق اعلیحضرت مرحوم نواب میر محبوب علیخاں سے بذریعہ معاہدہ یکسوئی کرلے۔ اعلیحضرت مرحوم اور امراء و اعیان سلطنت برار کے ضلعوں کو دوامی طور پر انگریزی حکومت کے سپرد کرنے کے خلاف تھے اس لئے کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کی رو سے برار کے ضلعے عارضی طور پر (بطور امانت (ٹرسٹ) حکومت کے سپرد کئے گئے تھے تاکہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی ہو سکے۔ لیکن لارڈ کرزن کا اصرار تھا کہ برار پر انگریزی حکومت کو دوامی پٹے کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے اعلیحضرت مرحوم نے پوری کوشش فرمائی کہ دوامی پٹے کی شرط نہ منظور کرائی جائے اور اضلاع برار سرکار نظام

کو واپس دے دئیے جائیں لیکن لارڈ کرزن نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں یور ہائی نس کو کسی غلط امید میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں بالکل صفائی سے کہتا ہوں کہ محض میری ہی نہیں بلکہ تمام وائسرائوں کی جو میرے بعد آئیں گے یہی حکمت عملی ہوگی اور انگلستان میں بھی حکومت کی یہی پالیسی رہے گی کہ برار کو کبھی واپس نہ کیا جائے" اعلیحضرت مرحوم نے خیال فرمایا کہ جب برار کی واپسی ممکن نہیں تو یہی بہتر ہے کہ موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کے بجائے اسے پٹے پر اٹھا دیا جائے اور اس کے عوض کچھ مستقل سالانہ رقم حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ اضلاع برار پر سرکار نظام کے شاہی حقوق برقرار رکھتے ہوئے انھیں حکومت ہند کو انتظامی ضرورت کے مدنظر پٹے پر دے دیا جائے جس کے عوض حکومت ہند سرکار نظام کو ۲۵ لاکھ روپیے سالانہ مستقل طور پر دیا کرے گی۔ حکومت ہند اضلاع مفوضہ میں اپنی صوابدید پر انتظامات عمل میں لائے گی۔ وہ اس کی بھی مجاز ہوگی کہ جو فوجیں حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے قایم ہیں ان کی تنظیم جس طور پر چاہے کرے۔ البتہ سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدے کی دفعہ (۲) میں ہز ہائینس کے مقبوضات کی حفاظت کا جو وعدہ حکومت برطانیہ نے کیا ہے اسے بخوبی پورا کیا جائے گا۔[1] اس معاہدہ کے بعد حکومت ہند نے حیدرآباد کنٹنجنٹ کو امپیریل آرمی میں ضم کر دیا اور یہ بھی ضروری نہیں قرار پایا کہ وہ ریاست حیدرآباد کی حدود ارضی میں رہے۔[2]

کچنر سے اختلاف

کرزن کے عہد تک کمانڈران چیف صرف فوج کی ٹریننگ اور تنظیم کا ذمہ دار تھا۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ کا ملٹری ممبر تمام فوجی نوعیت کے معاملوں میں وائسرائے کا مشیر ہوتا تھا۔ اس کو یہ حق حاصل تھا کہ کمانڈران چیف جو تجویزیں بھیجے ان پر تنقید کرے اور ان میں کاٹ چھانٹ کرے۔ کچنر کو جو لاک ہارٹ کی

---

[1] Aitchison, Treaties and engagements and Sanads, IX, p. 175.

[2] Fraser, India under Curzon and after, p. 226.

جگہ حال ہی میں کمانڈر ان چیف ہوا تھا یہ انتظام سخت ناپسند تھا۔ اس کی طبیعت آمرانہ واقع ہوتی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ وائسرائے کی کونسل کے ملٹری ممبر کو فوج سے متعلق کسی معاملے میں بھی اس پر فوقیت حاصل ہو۔ اس شخصی وجہ کے علاوہ اصولی طور پر بھی وہ حکومت ہند کے فوجی انتظام کی دوعملی کا مخالف تھا اور عملی طور پر اسے مضرت رسان سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے فوجی انتظام سے متعلق کارروائیوں میں خواہ مخواہ دیر ہوتی ہے۔ یہ بات کہ وائسرائے کو کمانڈر ان چیف کے علاوہ فوجی معاملات سے متعلق رائے کی ضرورت ہے اصولاً صحیح نہیں۔ کچنر نے اپنی یادداشت میں جو وائسرائے کے نام تھی یہ تمام خرابیاں واضح کیں۔ کرزن نے اس یادداشت کو سر ایڈمنڈ ایلس کے پاس بھیج دیا جو وائسرائے کی کونسل کا ملٹری ممبر تھا۔ اس نے کچنر کے اعتراضوں کا جواب دیا اور بتایا کہ ملٹری ممبر کے اختیارات کمانڈر ان چیف سے زیادہ نہیں ہیں بلکہ وہ صرف حکومت ہند کی نیابت کرتا ہے تاکہ فوجی اخراجات پر ایک طرح کی روک تھام رہے۔ کرزن بھی ملٹری ممبر کا ہم خیال تھا۔ کرزن کو اندیشہ تھا کہ اگر کچنر کی رائے پر عمل کیا گیا اور ملٹری ممبر کا عہدہ برخاست کر دیا گیا تو کمانڈر ان چیف کی آمریت قایم ہو جائے گی اور فوجی اخراجات پر جو حکومت ہند کے اخراجات کی سب سے بڑی مد ہے کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہے گی۔ اس انتظام کے بموجب مالی کفایت شعاری ممکن نہ ہوگی۔ غرضکہ پورا معاملہ وزیر ہند کے سامنے پیش ہوا جس نے اس پر سوچ بچار کے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کر دی۔ ذیلی کمیٹی نے سمجھوتے کی راہ اختیار کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ملٹری ممبر کو کمانڈر ان چیف کی کسی تجویز پر تنسیخی حق باقی نہ رہے اور وہ صرف گورنر جنرل کو عام پالیسی کے متعلق مشورہ دے اور خالص فوجی معاملوں میں صرف کمانڈر ان چیف سے مشورہ کیا جائے گا۔ ملٹری ممبر کے اختیارات صرف سپلائی تک محدود رہیں گے۔ لیکن کرزن نے اس کو کچنر کی فتح خیال کیا اور مستعفی ہو گیا۔

کچنر جنوبی افریقہ کی جنگ میں شہرت حاصل کر چکا تھا اور انگلستان کی پبلک میں اس کو خاص ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ پھر اس کے علاوہ ہوم گورنمنٹ چاہتی تھی کہ وسط ایشیاء میں روس کی اقدامی پالیسی کی وجہ سے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہندوستان کی فوجی تنظیم جدید اصول پر ایک ایسے شخص کی رہبری میں انجام کو پہنچے جو جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ اس کام کے لئے کچنر سے بہتر شخص ملنا ممکن نہ تھا۔ اب تک ہندوستان کی فوج کی تنظیم امن کے نقطۂ نظر سے کی گئی تھی نہ کہ جنگ کی ضرورتوں کے مدنظر۔ غرضکہ ان تمام امور کے مدنظر ہوم گورنمنٹ کچنر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی چاہے اس وجہ سے کرزن کو مستعفی ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ نئی تنظیم میں کمانڈر ان چیف کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے۔ برخلاف اس کے ملٹری ممبر کے اختیارات اتنے محدود ہو گئے کہ آخر ۱۹۰۹ء میں اس عہدہ کو ختم کر دیا گیا اور کمانڈراں چیف تمام فوجی امور کا ذمہ دار اور گورنر جنرل کا فوجی معاملوں میں مشیر قرار پایا۔

کرزن نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور قوت عمل سے حکومت ہند کے ہر شعبہ میں اپنی شخصیت کا اثر چھوڑا۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ حکومت کے کاروبار سے اس کو اسی طرح کا شوق تھا جیسے کسی کو لذت اور تفریح کے حصول میں ہوتا ہے۔ وہ ہر محکمہ کی کارکردگی کو اعلیٰ معیار پر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی سیرت کا بڑا عیب یہ تھا کہ جن لوگوں کی حکمرانی اس کے سپرد کی گئی تھی ان سے اس کو دلی ہمدردی نہیں تھی۔ اس لئے ہندوستانیوں کو سیاسی رعایتیں دینے کے بجائے اس کی کوشش کی کہ جو نظام حکومت رائج ہے اس کو بہتر اصول پر منظم کرے۔ جس طرح لارڈ ڈلہوزی کی غیر معمولی قوت عمل کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نظر آتی ہے اسی طرح کرزن کے عمل و اصلاح کی جلو میں سیاسی شورش کا طوفان دکھائی دیتا ہے۔ جس نے کچھ عرصے کیلئے تاریخ ہند کے مطلع کو گرد آلود کر دیا اور جس کی وجہ سے ایسے مسائل نے جنم لیا جن سے اب تک انگریزی حکومت عہدہ برا نہیں ہو سکی ہے۔

کرزن کے زمانۂ حکومت کے خاتمہ پر جدید ہند کی تاریخ کا ایک عہد ختم ہوتا ہے۔ کرزن کا عہد حکومت برطانوی دفتر شاہی کے انتہائی عروج و اقتدار کا زمانہ ہے۔ لیکن اب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ کرزن کے پیش نظر کلکتہ کے کارپوریشن کی جدید تنظیم، یونیورسٹی ایکٹ اور تقسیم بنگالہ سے چاہے دفتر شاہی کی کارکردگی میں اضافہ کرنا منظور ہو لیکن اس نے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے جذبات کو اپنی خود رائی سے سخت مجروح کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کی تحریک کو جو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی نشو و نما پانے کے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہی کرزن جس نے بہ حیثیت نائب وزیر ہند قانون مجلس ہند بابتہ ۱۸۹۲ء کی دار العوام میں پر زور تائید کی تھی جب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا اور سات سال تک اس ملک پر حکومت کی تو اس قانون کی اصلی روح کو اس نے اوروں سے زیادہ مٹانے کی کوشش کی۔ اس کی پالیسی کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو نظم و نسق میں شریک کرنا خود ان کے مفاد کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ ملکی انتظام کی کارگزاری کو بڑھانا۔ اس کو اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کو سیاسی اختیارات ملنے سے نظم و نسق کا وہ اعلیٰ معیار نہیں قایم رہ سکے گا جو ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور جس پر انگریزوں کو بجا طور پر ناز ہے۔ لیکن اس سے تخیل کی کمی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے یہ بات محسوس نہ کی کہ حکومت کی کارکردگی چاہے کتنی اچھی ہو لیکن جب تک لوگوں کو اس کا موقع نہ ملے کہ وہ خود اپنے ملک کے انتظام کو سر انجام دیں اسوقت تک انھیں اطمینان اور چین نہیں مل سکتا۔ کرزن کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں دہشت انگیزی کی تحریک کو زور پکڑنے کا موقع ملا جس کا خمیازہ اس کے جانشینوں کو بھگتنا پڑا۔

اکیسواں باب

منٹو مارلے اصلاحات اور سیاسی بے چینی

۱۹۰۵ء میں انگلستان میں سرہنری بینرمن کی لبرل وزارت کو اقتدار ملا اور لارڈ مارلے وزیر ہند مقرر ہوئے۔ وہ ہاؤس آف کامنز میں لارڈ کرزن کی پالیسی پر خوب نکتہ چینیاں کر چکے تھے۔ وہ لبرل جماعت کے سرگرم رکن اور مشہور صاحب فکر تھے۔ اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے ہندوستان کی سیاسی حالت کی تحقیقات شروع کرا دی اور کرزن کے مستعفی ہو لینے کے بعد قدامت پسند وزارت نے لارڈ منٹو کو ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے اس واسطے مقرر کیا کہ وہ سوجھ بوجھ کا شخص تھا اور اس سے پہلے کناڈا میں دستوری گورنر جنرل کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے چکا تھا۔ کرزن کے بعد ہندوستان میں ایسے شخص کو گورنر جنرل بنا کر بھیجنے کی ضرورت تھی جو انتظامی معاملوں میں ذرا آہستہ اور احتیاط سے قدم اٹھائے۔

لارڈ منٹو نے مارلے کے ایما، پر تبت کے معاملے میں اعتدال کے

اصول پر عمل کیا اور وادیٔ چمبی سے برطانوی فوجوں کے ہٹانے کا حکم دیدیا اور اس طرح اس نے حکومت ہند کو آئندہ کی بہت سی سیاسی الجھنوں سے بچا لیا۔ چین کے ساتھ جو جدید معاہدہ ہوا اس کی رو سے یہ بات طے پاگئی کہ تبت میں کوئی خارجی طاقت دخل نہ دے۔ اسی طرح ۱۹۰۷ء میں جو انیگلو رشن کنونشن ہوا اس کی رو سے حکومت ہند کو اطمینان حاصل ہوگیا کہ روس افغانستان کی طرف اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ روس اور برطانیہ نے ایران کے متعلق بھی اپنے تعلقات کا تصفیہ کرلیا۔ چنانچہ شمالی ایران میں روس کا اور جنوبی ایران میں انگریزوں کے حلقۂ اثر کا تعین ہوگیا جس کی وجہ سے بعد میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور ایران کی صیانت اور بقا کو دونوں طاقتوں نے تسلیم کرلیا خلیج فارس میں روس نے برطانوی مفاد کو مان لیا اور اپنے حقوق سے دستبردار ہوگیا جو سر ایڈورڈ گرے برطانوی وزیر خارجہ کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

لارڈ منٹو کے اپنے عہدہ کا جائزہ حاصل کرنے کے بعد ملک کی اندرونی حالت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ اس خرابی اور ابتری کے اسباب کچھ تو سطحی اور ظاہری تھے اور کچھ بنیادی۔ انقلاب کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں جن میں یہ خواہش ملی جلی تھی کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کا انتظام خود چلانا چاہیئے۔ آزادی کے خیالات مشرق میں صرف ہندوستان تک محدود نہ تھے۔ ایران اور چین میں دستوری حکومت قایم کرنے کی دوڑ دھوپ ہورہی تھی۔ جاپان نے ۱۹۰۶ء میں روس کی زبردست فوجوں کو جو شکست دی اس سے اہل مشرق کے حوصلے ذرا بڑھے۔ مغربی لبرل فلسفے کا اثر اہل ہند کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ ہندوستان کے سیاست کاروں میں ایک جماعت انتہا پسندوں کی تھی جو برطانوی حکومت کے ہر پہلو کی کھلم کھلا مذمت کرتی تھی اور دوسری اعتدال پسندوں کی جو اپنے اہل وطن کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر

آمادہ تھے بشرطیکہ اہل ہند کو مزید سیاسی رعایتیں دی جائیں۔ اول الذکر میں تلک بپن چندر پال، سریندرا ناتھ بزجی اور لالہ لاجپت رائے اور ثانی الذکر میں آر سی۔ دت، گوکھلے سر فیروز شاہ مہتا، سر ستیندر اسنہا کے نام قابل ذکر ہیں۔ حکومت کے خلاف شمال مغربی ہند میں بلوے شروع ہو گئے۔ حکومت نے بھی سختی کی پالیسی اختیار کی۔ متعدد لوگوں کو ۱۸۱۸ء کے رگولیشن کے تحت جلا وطن کر دیا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں کی شہروں میں ممانعت کر دی گئی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت کانگریس میں انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں سخت اختلافات رونما ہو گئے جن کے باعث ثانی الذکر نے اعلان شائع کر دیا کہ ان کے پیش نظر قانونی اور دستوری ذریعے سے ہندوستان کے لئے وہی مرتبہ حاصل کرنا ہے جو کناڈا اور دوسری قلمروؤں کو سلطنت برطانیہ میں حاصل ہے۔ ۱۹۰۸ء میں دہشت انگیزی کو سارے ملک میں ترقی ہوئی اور انگریز عہدہ داروں کو قتل کیا جانے لگا جس کی وجہ سے حکومت نے عدالتوں کو غیر معمولی اختیارات دیدیئے تاکہ صورت حالات پر قابو رکھنا ممکن ہو۔ لارڈ مارلے کے کہنے کے مطابق لارڈ منٹو نے اعتدال پسند ہندوستانی مدبرین کو اپنے ساتھ کر لیا اور ایک طرف تو دہشت پسندی کے مقابلے کے لئے ان کی اخلاقی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے انھیں یقین دلایا کہ وہ خود اور وزیر ہند سیاسی اصلاحیں عنقریب نافذ کریں گے جن سے ہندوستانیوں کے سیاسی مرتبہ میں اضافہ ہو گا۔

لارڈ منٹو نے ہندوستان کے صاحب رائے اشخاص سے نجی طور پر دستوری مسئلہ کے متعلق گفت و شنید شروع کر دی۔ اس نے اپنی کونسل کے چند ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس ضمن میں صوبجاتی حکومتوں سے بھی رائے طلب کی گئی۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں باقاعدہ سرکاری طور پر امپریل کونسل میں اس کا اعلان کیا گیا کہ "جلد ہندوستان میں سیاسی اصلاحات رائج کی جائیں گی تاکہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی حکومت میں شریک ہونے کا

موقع مل سکے۔ ایک اہم مسئلہ اس وقت لارڈ منٹو کے سامنے یہ تھا کہ اگر کونسلوں کی تشکیل میں انتخابی عنصر کو رواج دیا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے کے بعض نہایت اہم طبقے جو نسبتاً تعلیم میں پیچھے ہیں کہیں نیابت سے محروم نہ رہ جائیں جس کی وجہ سے سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی ہوگا۔ ادھر مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ نیابتی اداروں کی ترویج میں انھیں وہی موقعے ملنے چاہئیں جن کے وہ مستحق ہیں۔

مسلم لیگ کی بناء کچھ عرصے سے مسلمانوں میں اس بات کا احساس بڑھتا جاتا تھا کہ ملک میں نیابتی اداروں کے قائم ہونے سے ان کی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی سر سید احمد خاں نے نیابتی اداروں کے رواج دینے کی مخالفت کی۔ ۱۸۹۸ء میں ان کے انتقال کے بعد بھی مسلمانوں کا نقطۂ نظر وہی رہا جس کا تعین سر سید احمد خاں نے کیا تھا۔ وہ اس سیاست سے الگ رہے جس کا مقصد حکومت کی تنقید تھا لیکن بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں انھوں نے اپنی سیاسی تنظیم کو نہایت ضروری خیال کیا۔ تقسیم بنگال سے بھی وہ سیاسی طور پر متاثر ہوئے۔ لارڈ منٹو کے آنے پر مزید سیاسی اصلاحوں کی امید نے ان کو اپنی سیاسی تنظیم کی طرف متوجہ کیا۔ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء ہندوستانی مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد نے سر آغا خاں کی سربراہی میں لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق نیابت کا مطالبہ پیش کیا۔ اسی سال مسلم لیگ کی بناء پڑی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے اور ان کے قومی بقا کے لئے تدبیریں کی جائیں۔ مسلم لیگ نے بھی جداگانہ نیابت کے اصول کو اپنی حکمت عملی کا سنگ بنیاد قرار دیا اور بتلایا کہ مروجہ قاعدوں کی رو سے کسی مسلمان کا منتخب ہونا ممکن نہیں جب تک کہ اکثریت کی تائید نہ حاصل ہو۔ یہ بھی شکایت کی گئی کہ مسلمانوں کی تعداد سرکاری ملازمتوں اور انتخابی جماعتوں میں نسبتاً بہت کم ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے یہ بھی مطالبہ پیش کیا گیا کہ تمام صوبوں میں سرکاری ملازمتوں میں

مسلمانوں کے لئے حکومت کا ایک خاص تناسب مقرر کر دینا چاہئے۔ مخلوط انتخاب میں چونکہ یہ اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے حقیقی نمایندے منتخب نہیں ہو سکیں گے اس لئے تمام نیابتی اداروں میں حکومت کو مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کرنا چاہئے۔

اس وقت تک ہندوستان کے مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہے تھے لیکن اب انھوں نے محسوس کیا کہ سیاست کو نظر انداز کرنے میں خود نظر انداز ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لارڈ منٹو کی خدمت میں مسلمانوں کے وفد نے جو ایڈریس پیش کیا اس میں انگریزی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اس ملک میں جو سیاسی حیثیت اب تک رہی ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے سیاسی حقوق کا تعین ہونا چاہئے۔ چونکہ ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند کے نافذ ہونے کے بعد مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں میں ان کے فرقے کی نمایندگی ناکافی رہی ہے اس لئے انھیں حق ملنا چاہئے کہ وہ جداگانہ انتخاب کے ذریعے اپنے نمایندے کونسلوں میں بھیج سکیں۔ لارڈ منٹو نے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ لیکن وزیر ہند لارڈ مارلے شروع میں اس اصول کے خلاف تھا۔ بعد میں مسٹر امیر علی اور دوسرے صاحب فکر مسلمانوں نے لارڈ مارلے کی غلط فہمیاں دور کر دیں تو وہ اس اصول کا حامی ہو گیا۔ بہت کچھ چھان بین کے بعد ۱۹۰۹ء میں قانون مجالس ہند ۱۹۰۹ء جسے منٹو مارلے اسکیم بھی کہتے ہیں پارلیمنٹ میں منظور ہوا۔

اس قانون کی رو سے گورنر جنرل کی امپیریل کونسل کے زائد ارکان کی تعداد بجائے ۱۶ کے ۶۰ کر دی گئی اور گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کو شامل کر کے تعداد ۶۹ ہو گئی۔ ان میں سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل رہے گی۔ صوبوں کی کونسلوں میں بمبئی، مدراس، بنگال اور صوبہ شمال مغربی میں کونسلوں کے ارکان کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس ہو گی اور پنجاب اور برما میں زیادہ سے زیادہ تیس۔ صوبجاتی کونسلوں میں غیر سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل ہو گی۔ مجالس بلدیہ، مجالس ضلع، طبقہ زمینداران، ایوان ہائے تجارت

اور جامعات کو ارکان منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ مسلمانوں کی نیابت جداگانہ طریق انتخاب سے مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں میں ہوگی۔

مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں کے ارکان کو تجویزیں پیش کرنے کا حق ہوگا۔ میزانیہ ہر سال کونسلوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس پر بحث کرنے اور رائے دینے کی اجازت ہوگی۔ صدر کی اجازت سے ارکان کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق ہوگا۔ مرکزی مجلس کے ارکان کا انتخاب تین سال کے لئے ہوگا۔ لیکن سرکاری اراکین کی نامزدگی اس سے کم مدت کے لئے بھی ہو سکے گی۔ فوجی سیاسی اور صوبجاتی امور پر مرکزی مجلس وضع قانون میں بحث نہیں ہوگی۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اگر کسی مسئلہ پر بحث کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھے تو وہ پیش نہ ہو سکے گا۔ صدر مجلس کو اختیار ہوگا کہ کسی تجویز کو پیش ہونے سے اس بناء پر روک دے کہ ایسا کرنے سے مفاد عامہ کو نقصان پہنچے گا۔

۱۹۰۹ء کے قانون مجالس ہند (منٹو مارلے اسکیم) کے نافذ ہونے کے بعد منظورہ قواعد کے تحت مرکزی مقننہ کی ترتیب حسب ذیل تھی۔

گورنر جنرل۔

مجلس عاملہ کے سات ارکان

۲۹۔ سرکاری حکام جن میں سے ۲۸ نامزد شدہ ہوں گے جو صوبوں کی مقامی حکومتوں کی طرف سے بھیجے جائیں گے۔ نیز صوبہ دہلی کا چیف کمشنر یا پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بہ اعتبار عہدہ شرکت کا مجاز ہوگا۔

۳۲ غیر سرکاری ارکان جن میں سے پانچ نامزد شدہ ہوں گے اور ۲۷ منتخب شدہ۔ اس طرح کل تعداد ۶۹ ہوگی جن میں سے ۶۱ زائد ارکان ہوں گے۔

مرکزی مقننہ کے لئے حق رائے دہندگی مفصلہ ذیل کو حاصل تھا۔

(الف) صوبوں کی مجالس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان ۱۳ ارکان منتخب کریں گے۔

(ب) چھ صوبوں (یعنی بمبئی، مدراس، بنگال، یوپی، سی پی، اور بہار واڑیسہ) کے مسلمہ حیثیت کے زمینداروں کو اپنے صوبے سے سات زمیندار منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

(ج) مذکورہ چھ صوبوں کے مسلمہ حیثیت کے مسلمان پانچ ارکان منتخب کریں گے۔

(د) یورپین ایوان ہائے تجارت (بنگال وبمبئی) کی جانب سے دو رکن منتخب ہوں گے۔

(س) مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کے حقوق انتخاب میں فرق تھا۔ مرکزی مقننہ کے لئے دس ہزار سالانہ مال گزاری ادا کرنے والے حق انتخاب رکھتے تھے یا اعلیٰ خطاب یافتہ اشخاص۔ بنگال کے مسلمانوں کو بطور رعایت یہ حق تھا کہ ان کے آنریری مجسٹریٹ، آمدنی پر محصول ادا کرنے والے اور حکومت کے سب وظیفہ پانے والوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ آمدنی کے معیار سے دیکھا جاتا تو بہت کم مسلمان رائے دینے کے حق کے مستحق ہوتے۔

منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعہ جو انتخابی طریقہ رائج ہوا اس کے بموجب اصلی رائے دہندوں اور نمایندوں میں بہت دور کا تعلق تھا۔ اس کو براہ راست نیابتی طریق انتخاب کے بجائے بالواسطہ انتخاب کہنا درست ہوگا۔ اگرچہ صوبوں میں برائے نام غیر سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل تھی لیکن چونکہ ان غیر سرکاری ارکان میں نامزد شدہ ارکان بھی شامل ہوتے تھے اس واسطے سرکاری ارکان من مانے طور پر اکثر اوقات صوبجاتی مقننہ میں غلبہ حاصل کر لیتے تھے۔ اعتدال پسند ہندوؤں اور مسلمانوں کی مدد سے حکومت صوبجاتی مقننہ میں آسانی کے ساتھ توازن قایم رکھ سکتی تھی اور اپنے منشاء کے موافق معاملات طے کرا سکتی تھی۔ باوجود

انتخابی عنصر کی موجودگی کے مخصوص مفاد کی نمائندگی کرنے والے موجود تھے جو حکومت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے تھے اور جن کا فائدہ اسی میں تھا کہ ہمیشہ حکومت کی مرضی کے مطابق اپنی رائے دیں۔ غرضکہ بالواسطہ انتخاب کی وجہ سے نیابتی اصول محض جزوی طور پر رائج ہوا۔

واضح رہے کہ قانون مجالس ہند ۱۹۰۹ء کی رو سے پارلیمنٹ نے پہلی مرتبہ نیابتی اصول کو مجالس مقننہ کے لئے تسلیم کیا، چاہے وہ نیابت بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور صوبوں کی حکومتوں کی اہمیت اور حیثیت بہ نسبت پیشتر کے بلند ہوگئی۔ اب نظم و نسق کے اہم امور مجالس مقننہ میں بحث میں لائے جاسکتے تھے اور صوبوں کی حکومتیں اپنا میزانیہ علیحدہ تیار کرسکتی تھیں۔ ۱۹۰۹ء سے قبل صوبجاتی مسودہ ہائے میزانیہ مرکزی حکومت کی منظوری کے لئے پیش ہوا کرتے تھے اور اکثر اوقات ان میں ایسے تغیرات کئے جاتے تھے کہ وہ بالکل بدل جاتے تھے۔ لیکن اب ایسا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ اگر کوئی صوبہ کی حکومت ایسی اسکیم پیش کرے جس میں پانچ ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ ہوتا ہو تو وہ اسکیم مرکزی مقننہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کی جائے گی تاکہ وہ اس کے متعلق ضروری تنقیح اور جانچ پرتال کرکے اپنی سفارش پیش کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان میں آدھے منتخب شدہ ارکان کی شرکت لازمی قرار دی گئی۔

مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں جو تجویزیں کثرت رائے سے منظور ہونگی ان کی حیثیت حکومت کے لئے محض سفارشوں کی ہوگی۔ حکومت ان کے مطابق عمل کرنے کی پابند نہ ہوگی۔ صدر کو اختیار ہوگا کہ بلے وجہ بتلائے ہوئے جس تجویز کو چاہے مقننہ میں پیش ہونے سے روک دے۔ میزانیہ کی عام مدوں کے متعلق قطعی فیصلے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کرے گا۔ ارکان کی رائے کے مطابق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل میزانیہ میں تبدیلی کرسکتا ہے لیکن ارکان کو از خود یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ میزانیہ کے متعلق کوئی تجویزیں پیش کریں۔ میزانیہ کی منظوری کے لئے مقننہ میں رائے نہیں لی جائے گی۔

آمدنی کی بعض مدیں مثلاً اسٹامپ کروڑگیری اور دیسی والیان ملک کا خراج وغیرہ کے متعلق بحث نہیں کی جا سکے گی۔ اس طرح بعض خرچ کی مدیں مثلاً فوج بحریہ، قرضہ عامہ، دفاع، سرکاری ریلیں اور امور مذہبی کے متعلق بھی کسی قسم کی بحث کی اجازت نہ ہوگی۔ ان امور کے علاوہ مفاد عامہ یا نظم ونسق کے دوسرے مسائل معرض بحث میں لائے جا سکیں گے۔ سوالات کرنے کے لئے قاعدے مقرر ہوں گے جن کی پابندی لازمی ہوگی۔

اعتدال پسندوں نے منٹو مارلے اسکیم کو باوجود اس کی خامیوں کے قابل قبول خیال کیا اور مسٹر گوکھلے نے اپنی مدراس والی تقریر میں نافذ شدہ اصلاحات کے فائدوں کی طرف اہل ہند کو متوجہ کیا۔ حکومت نے سر ستیندر ناتھ سنہا کو (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) وائسرائے کی کونسل کی رکنیت پر فائز کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی کو اتنا بڑا اعزاز دیا گیا۔ لندن کی انڈیا کونسل میں کرشن گوبند گپتا اور سید حسین بلگرامی کو رکنیت پر فائز کیا گیا۔

حکومت صوبجاتی کونسلوں کے اختیارات میں کسی خاص قسم کا اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی تاکہ بعد میں وہ خود مختار ہو سکیں۔ ۱۹۰۹ء کے کمیشن بابتہ عدم مرکزیت (ڈی سنٹرل آئی زیشن کمیشن) کی سفارشوں سے بھی صوبجاتی کونسلوں کے حلقہ اختیار میں کوئی وسعت پیدا نہ ہوئی۔ ان کونسلوں کی اہمیت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محض تجربی اور تعلیمی ہے تاکہ ہندوستانیوں کو پارلیمانی طریق حکومت کے متعلق ابتدائی سبق حاصل ہو جائیں۔ اعتدال پسند مدبرین نے کونسلوں کو چلانے اور اس ضمن میں حکومت سے تعاون کرنے کی حمایت کی تھی لیکن کچھ عرصے بعد انھوں نے بھی محسوس کر لیا کہ وہ ان کے توسط سے ملکی نظم ونسق پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ مسٹر گوکھلے نے مرکزی مقننہ میں مختلف ملکی مسائل پر جو تقریریں کیں وہ خالص علمی اور خطیبانہ شان رکھتی تھیں اور پارلیمانی نقطۂ نظر سے ان کا معیار کافی بلند تھا لیکن ان کی آواز عملی حیثیت سے مطلق موثر نہ ہوئی۔ حکومت کو جو کرنا تھا وہ برابر کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسند مدبرین بھی ان اصلاحوں کی طرف

سے مایوس ہو گئے۔ انتہا پسندوں نے تو پہلے ہی سے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ان اصلاحوں سے حکومت ہند کو اس واسطے مایوسی ہوئی کہ تنقید کرنے والے بلا کسی تعمیری اصول کو پیش نظر رکھے ہوئے حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ اور چونکہ وہ خود حکومت کے کام میں عاطہ کے ساتھ شریک نہ تھے اس لئے ان کی رائے میں غیر ذمہ داری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اگرچہ گورنر جنرل کی کونسل میں ایک ہندوستانی کو رکن قانون بنایا گیا، وزیر ہند کی کونسل میں بھی دو ہندوستانیوں کو رکنیت پر لیا گیا اور گورنروں کی کونسلوں میں بھی ہندوستانی ارکان نے جگہ پائی لیکن حکومت کی عام حکمت عملی پر ان کی وجہ سے کوئی گہرا اثر نہیں پڑا خود لارڈ مارلے نے پارلیمنٹ میں مسودہ قانون پیش کرتے وقت صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اس قانون سے ہندوستان میں پارلیمانی طریق حکومت رائج کرنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ان کا منشاء اس سے یہی ہے کہ نراج کی قوتوں کو دبا کر ہندوستانیوں کے اعتدال پسند طبقے کو حکومت کے کاروبار میں مشاورتی حیثیت سے شریک کیا جائے۔ ایسی صورت میں ہندوستانیوں کو اس قانون سے اتنی زیادہ امیدیں ہی نہ قایم کرنی چاہئے تھیں جتنی کہ انھوں نے کیں تاکہ مایوسی نہ ہوتی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ ہارڈنگ نے جو لارڈ منٹو کی جگہ گورنر جنرل مقرر ہوا ہندوستانیوں کی دل جوئی کی تاکہ انتہا پسندوں کا اثر عوام میں زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کے ہندوستان تشریف لانے پر دہلی میں بڑی شان و شوکت سے دربار ہوا جس میں ملک کے والیان ریاست، بڑے بڑے امیروں اور سرکاری عہدہ داروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا گیا اور کلکتہ کی بجائے دہلی کو ہندوستان کا دار السلطنت قرار دیا گیا۔ بہار اور اڑیسہ کا نیا صوبہ بنایا گیا، آسام میں چیف کمشنری قایم کی گئی۔ ایک شاہی ماموریہ (کمیشن) لارڈ ایلنگٹن کی صدارت میں مقرر کیا گیا تاکہ اس امر پر غور کرے

کہ سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد اس قدر کم کیوں ہے اور اس کو بڑھانے کے لئے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں۔ اس کمیشن کے ارکان میں تین ہندوستانی سر عبدالرحیم، گوپال کرشن گوکھلے اور مہادیو بھسکر چوبال شریک تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ پہلی جنگ عظیم کی مصروفیت کے باعث ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ جنگ کے بعد جب ہندوستان کے عام سیاسی مسئلہ کی طرف پارلیمنٹ نے توجہ کی تو سیول سروس اور اعلیٰ ملازمتوں کے مسئلہ پر بھی سوچ بچار ہوا اور ان میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانے کی تجویزیں منظور ہوئیں۔

بائیسواں باب

نیابتی اور ذمہ دار حکومت کا آغاز

اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہندوستانیوں نے برطانوی حکومت کی کامیابی کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ جنگ کے چار سالوں میں بارہ لاکھ ہندوستانیوں نے حصہ لیا اور کروڑوں روپے کا سامان جنگی ضرورتوں کے لئے اس ملک سے فراہم کیا گیا۔ فرانس اور مشرق قریب کے محاذوں پر لاکھوں ہندوستانیوں نے برطانیہ عظمیٰ کی حمایت میں اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ ان کی سرفروشانہ خدمتوں کا خود برطانوی مدبروں نے اعتراف کیا۔ قدرتی طور پر ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ اور اصلاح پسند طبقے کی یہ خواہش تھی کہ برطانوی حکومت ان کے ہم وطنوں کی خدمتوں کا صلہ سیاسی اصلاحوں کی شکل میں دے تاکہ ہندوستانیوں کی سیاسی حیثیت برطانوی قلمروؤں (ڈومینینس) کے مثل ہو جائے۔ دوران جنگ میں ہندوستانیوں کی خدمتوں کا اعتراف کرنے کی غرض سے ۱۹۱۷ء میں جو شہنشاہی جنگی کونسل ہوئی

اس میں مہاراجہ بیکانیر، سر ستیندر ناتھ سنہا اور سر جیمس مسٹن حکومت ہند کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں جب لارڈ چمسفورڈ لارڈ ہارڈنگ کی جگہ گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر ہو کر آیا تو اس نے ہندوستانیوں میں بے اطمینانی کی کیفیت محسوس کی اتحادیوں نے اور خاص طور پر انگریزوں نے دوران جنگ میں بار بار اعلان کیا تھا کہ وہ دنیا بھر کی قوموں کو جمہوریت کے لئے آزاد کرانے کی غرض سے جرمنی اور اس کے ساتھیوں سے لڑ رہے ہیں ان اعلانوں کا یہ قدرتی اثر ہوا کہ ہندوستانیوں کے دل میں بھی سیاسی حقوق ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی دوران جنگ میں مسز اینی بسنٹ اور مسٹر تلک نے ہوم رول کی تحریک شروع کر دی اور ہندوستانیوں کے سیاسی مطالبوں کو صاف صاف پیش کیا تاکہ برطانوی حکام کو شک اور شبہہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں میں ایک میثاق ہوا جسے میثاق لکھنؤ کہتے ہیں اور اس ضمن میں ایک متفقہ اسکیم منظور ہوئی جسے تمام ہندوستانیوں کے مطالبہ کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ کانگریس لیگ اسکیم کہلاتی ہے۔ اس اسکیم میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں $\frac{4}{5}$ تعداد ارکان وسیع رائے دہی کے اصول پر منتخب شدہ ہونی چاہئے۔ اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر صوبے کی مقننہ میں نشستیں محفوظ رکھی جائیں گی پنجاب میں ۵۰ فی صدی، یو پی میں ۳۰ فی صدی، بنگال میں ۴۰ فی صدی وغیرہ۔ اگر کسی اقلیت کے $\frac{3}{4}$ منتخب شدہ ارکان کسی تجویز کی اپنے مفاد کے لحاظ سے مخالفت کریں تو اس تجویز کو پیش نہیں کیا جا سکے گا۔ صوبہ کی کونسلوں کے صدر منتخب شدہ ہوں گے۔ صوبہ کی کونسلیں اپنی ذمہ داری پر قرض لینے اور محصولوں میں تغیر و تبدل کرنے کی مجاز ہوں گی۔ میزانیہ کونسل کی رائے سے منظور ہوا کرے گا اور کونسل کی تمام تجویزوں کی تعمیل عاملہ کے لئے ضروری اور لازمی ہو گی۔ صوبہ کی عاملہ کے نصف ارکان ہندوستانی

ہونے چاہئیں۔ مرکزی کونسل کے ارکان کا انتخاب صوبہ کی کونسلیں کریں گی اور اس میں وہ مسائل پیش ہوا کریں گے جن کا تعلق تمام ہندوستان سے ہوگا۔ گورنر جنرل کی عاملہ میں بھی نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہئیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے مندرجہ بالا تجویزیں ہندوستانیوں کے متفقہ مطالبہ کے طور پر شائع کیں۔ انکی اسکیم کا انگلستان میں بہت اچھا اثر ہوا اور برطانوی ارباب اقتدار ہندوستان کے مسئلے کی طرف زیادہ توجہ ظاہر کرنے لگے۔ اب تک سیاسی معاملوں میں صرف کانگریس اپنی آواز بلند کرتی تھی لیکن اب مسلم لیگ بھی اس کے ساتھ ہوگئی۔

ایک اور قابل ذکر اسکیم "انیس کی یادداشت" کے نام سے مشہور ہے جسے مرکزی مقننہ کے ۱۹ غیر سرکاری ارکان نے اکتوبر ۱۹۱۶ء میں وائسرائے کے پاس پیش کیا تھا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں اکثریت منتخب شدہ ارکان کی ہو اور رائے دہی کے حق کو اتنا وسیع کیا جائے کہ عوام براہ راست شرکت کرسکیں۔ اقلیتوں کے حقوق محفوظ کئے جائیں۔ مجالس مقننہ کو ہر قسم کے قوانین اور میزانیہ منظور کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ وزیر ہند کی کونسل ختم کردی جائے۔ اور خود وزیر ہند کی حیثیت وزیر نوآبادیات کی طرح ہونی چاہئے۔ صوبہ کی حکومتوں کو خود اختیاری کے تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

اس ضمن میں انگلستان کے ارباب فکر میں انجمن راؤنڈ ٹیبل کی جماعت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس انجمن کے بانی مسٹر کرٹس تھے جو ٹرانسوال میں سرکاری عہدے پر رہ چکے تھے۔ انھیں شہنشاہی مسائل اور ان کے علمی مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس جماعت کے ایک رکن مسٹر ڈیوک نے مسئلہ ہند کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں بتدریج ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ دوعمل (ڈیارکی) کے اصول کو تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح حکومت کا ایک حصہ برطانوی انتخاب کرنیوالوں کے سامنے ذمہ دار ہوگا اور دوسرا حصہ ہندوستانی انتخاب کرنیوالوں کے سامنے۔ ڈیوک نے ایک یادداشت مرتب کی جس میں مجالس مقننہ میں رائے دہی کے حق کی توسیع کے متعلق مفصل بحث کی گئی تھی۔ یہ یادداشت مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے پاس

غور کیلئے بھیجی گئی۔ مسٹر کرٹس خود ہندوستان آئے۔ یہاں کے سیاسی لیڈروں سے ملے اور اپنی تصنیف "دوعملی" میں ہندوستان کے دستوری مسئلے کا حل پیش کیا۔ اس کتاب میں ہندوستان کی دستوری ترقی کا مقصد قلمروی مرتبہ (ڈومینین اسٹیٹس) قرار دیا گیا۔ دوعملی میں یہ اصول مدنظر تھا کہ بعض محکمے ایسے ہیں جنکے انتظام کو اہل ہند کے سپرد نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ ایسا کرنے سے انتظامی برہمی پیدا ہونیکا اندیشہ تھا بعض دوسرے محکموں کا انتظام پوری طرح سے ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

کانگریس لیگ اسکیم نے جو لکھنؤ میں منظور ہوئی انگلستان کے مدبروں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحیں نافذ کرنے کے متعلق جلد کوئی قدم اٹھائیں۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ "ہز مجسٹی ملک معظم کی حکومت کی حکمت عملی جس سے حکومت ہند پورے طور پر متفق ہے یہ ہے کہ نظم و نسق کے شعبے میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھائی جائے اور خود مختاری کے اواروں کی تدریج سے ترقی ہو تاکہ ہندوستان میں آہستہ آہستہ ذمہ دار حکومت قایم ہو جائے جسکی برطانوی شہنشاہی کے لازمی جزو کی سی حیثیت ہو گی۔۔۔۔ برطانوی حکومت اور حکومت ہند جن پر ہندوستانی قوموں کی خوشحالی اور ترقی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے ترقی کے معیار کا تعین کریں گی۔ ان دونوں حکومتوں کی اس بات میں رہنمائی اس عملی تعاون سے ہو گی جو انکی جانب سے ہوگا جنکو خدمت کے نئے موقعے دئے جائیں گے اور جس حد تک انکے احساس ذمہ داری پر بھروسا کیا جا سکے گا۔"

اس اعلان کے بعد مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے تاکہ مقامی حالات کا خود مشاہدہ کریں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے ملکر اس ملک کی سیاسی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائیں۔ مسٹر مانٹیگو نے جولائی ۱۹۱۸ء میں اپنی رپورٹ بابتہ اصلاحات جسے مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ بھی کہتے ہیں شائع کی۔ اس رپورٹ میں یہ بات اصولاً تسلیم کی گئی کہ مرکزی حکومت ہند میں زیادہ تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ صرف یہ ممکن ہے کہ جمہور کے نمایندوں کو اس کی کارگزاری پر تنقید کرنیکا حق دیا جائے جو پہلے حاصل نہیں تھا رپورٹ میں اس امر کی تصریح کی گئی کہ چونکہ ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری حکومت ہند پر ہے

اسلئے اسکو ناتجربہ کار اور غیر ماہر ہاتھوں میں دینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ جب تک اندرونی و بیرونی حفاظت کیلئے ہندوستان برطانیہ عظمیٰ کی برّی اور بحری فوجوں کا منت پذیر ہے اسوقت تک اس ملک کو جو خود مختاری کے حقوق حاصل ہوں گے وہ لازمی طور پر محدود ہونگے۔ مسٹر مانٹیگو لکھتے ہیں کہ اس بات کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پارلیمنٹ کبھی اسکے لئے آمادہ ہوگی کہ برطانوی فوجیں ایسی حکمت عملی کی تائید کے لئے استعمال کیجائیں جسکے تعین پر خود اسکو کوئی حق نگرانی حاصل نہیں یا جسے وہ ناپسند کرتی ہے۔ ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ دراصل ایک شہنشاہی مسئلہ ہے اور اسواسطے حکومت ہند کیلئے لازم ہے کہ اس کے پاس ہمیشہ اتنی قوت اور ایسے وسیلے رہیں جنکی بدولت وہ اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکے۔

مسٹر مانٹیگو نے صوبے کی حکومتوں میں اہل ہند کو عاملانہ اختیارات میں شریک کرنے کی سفارش کی لیکن ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے مکمل صوبجاتی آزادی کے اصول کو نہیں تسلیم کیا اور صوبجاتی مقننہ کو مالیاتی اور وضع قانون کے پورے اختیارات دینا قبل از وقت بتلایا۔ گورنر کی مجلس عاملہ میں انگریز ارکان کے ساتھ ہندوستانی ارکان بھی ہونگے جو مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہونگے اور ان کے تحت چند انتظامی امور ہونگے۔ گورنر کی کوشش ہونی چاہئے کہ جہاں تک ہوسکے عاملہ کے تمام فیصلے متفقہ ہوا کریں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ ایک صیغے کی کارروائی دوسرے صیغے پر اثر ڈالتی ہو۔ مسلمانوں کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کی سفارش کی گئی۔ یہ امر صاف طور پر تسلیم کیا گیا کہ وہ صوبجاتی حکومتوں میں ذمہ دار حکومت کی جانب پہلا قدم اٹھانا چاہئے صوبے کی حکومتوں کو کچھ نہ کچھ ذمہ داری فوراً دینی چاہئے اور ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ جب حالات اس کی اجازت دیں تو اس وقت انھیں پوری آزادی دی جاسکتی ہے اسلئے لازم ہے کہ صوبجاتی حکومتوں کو نظم و نسق کے قوانین بنالئے اور اپنے مالیاتی معاملوں میں حکومت ہند سے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو جس حد تک کہ حکومت ہند کی ذمہ داریوں کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہ ہوتی ہو۔

مسٹر مانٹیگو نے جو سنہ ۱۹۱۹ء میں قانون حکومت ہند کا مسودہ دارالعوام

کے سامنے پیش کیا۔ اس کی دوسری خواندگی کے بعد مسودہ پارلیمنٹ کی ایک
مجلس منتخبہ کے سامنے غور کے لئے بھیجا گیا جس میں سات دارالعوام کے او
سات دارالامرا کے ارکان شریک تھے اور لارڈ سلبورن اس کے صدر تھے
مجلس منتخبہ نے سرکاری اور غیر سرکاری شہادتیں قلمبند کیں۔ ہندوستانیوں میں
جنھوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کے خیالات مجلس منتخبہ کے سامنے پیش کئے
ان میں سری نواس شاستری، وی۔ جے پٹیل، بال گنگا دھر تلک، سر آغا خاں
سر تیج بہادر سپرو، مسٹر ایم۔ اے جناح اور مسز اینی بسنٹ بھی شامل تھیں کمیٹی
نے ان سب شہادتوں کے مطابق مسودۂ قانون حکومت ہند کی تنقیح کی اور
بالآخر اپنی رپورٹ نومبر سنہ ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی۔ مجلس منتخبہ نے
حکومت کی مجوزہ اصلاحوں کی عام طور پر تائید کی اور یہ اصول تسلیم کیا کہ ہندوستانی
کے لئے ذمہ دار حکومت قائم کرنے میں اب کچھ دیر نہ ہونی چاہیئے۔ قانون
حکومت ہند بحث و مباحثہ کے بعد پارلیمنٹ میں ۲۳ ڈسمبر سنہ ۱۹۱۹ء منظور
ہوا اور شاہی جریدہ اعلامیہ میں اس کی منظوری کا اعلان کیا گیا۔

اس قانون کی رو سے مرکزی مقننہ دو ایوان پر مشتمل قرار دی گئی۔
کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی۔ کونسل آف اسٹیٹ میں ساٹھ ارکان
ہوں گے جن میں سے ایک ثلث سرکاری ہوں گے باقی براہ راست منتخب
ہوں گے۔ صدر کا تقرر گورنر جنرل کرے گا۔ ارکان پانچ سال کے لئے منتخب
ہوں گے لیجسلیٹو اسمبلی کم از کم ۱۴۴ ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس کے ارکان
تین سال کے لئے چنے جائیں گے۔ صدر کا انتخاب ارکان میں سے ہوگا۔
گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے ارکان دونوں ایوانوں کے سرکاری نامزد شدہ
ارکان ہوں گے۔ کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی دونوں میں رکنیت کے لئے
کم از کم پچیس سال کی شرط لازمی ہوگی اور ہر وہ شخص جو رائے دینے کا حق رکھتا ہے
اس کو حق رکنیت بھی حاصل ہوگا۔ انتخاب کے حلقوں میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم
رکھی گئی نشستوں کا تعین سنہ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کے مطابق عمل میں آیا۔
مرکزی مقننہ کو وضع قوانین کے وسیع اختیارات حاصل ہوں گے۔ وہ

ہندوستان میں تاج برطانیہ کی رعایا اور ملازمین اور ہندوستانیوں کیلئے جہاں کہیں وہ ہوں بشرطیکہ انھوں نے اپنی قومیت نہ بدلی ہو وضع قوانین کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اس حق پر بعض قیدیں عاید کی گئی ہیں۔ مثلاً اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے کسی منظورہ قانون کو جس کا اطلاق برطانوی ہند پر ہوتا ہو منسوخ کر سکے یا اس میں کوئی ترمیم کر سکے یا کوئی ایسا قانون منظور کرے جس سے پارلیمنٹ کے اقتدار کو کسی طرح صدمہ پہنچتا ہو یا برطانیہ کے غیر تحریری دستور اور آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ ذیلی امور کے متعلق مرکزی مقننہ کو اس وقت تک قانون بنانے کی اجازت نہ ہوگی جب تک کہ گورنر جنرل سے ان کے متعلق اجازت نہ لے لی گئی ہو۔

(الف) قرضۂ عامہ۔ ہندوستان کی مالیات سے متعلق کوئی مسئلہ۔

(ب) ہندوستان میں برطانوی رعایا کے مذہب یا مذہبی رسمیں اور عبادتیں وغیرہ۔

(ج) ہز مجسٹی ملک معظم کی بری، بحری یا فضائی فوجوں میں نظم وضبط قایم رکھنے کے متعلق کوئی مسئلہ۔

(د) حکومت ہند کے تعلقات خارجی دولتوں یا والیان ریاست کے ساتھ یا ان صوبجاتی امور سے متعلق وضع قانون کرنا جو کھلم کھلا مرکزی مقننہ کی حدود سے خارج ہیں یا کسی صوبجاتی مقننہ کے منظور کردہ قانون کی تنسیخ یا ترمیم کرنا یا گورنر جنرل کے نافذ کردہ خصوصی احکام (آرڈیننس) کی تنسیخ یا ترمیم۔[۱]

گورنر جنرل اس کا مجاز ہوگا کہ کسی ایسے مسودہ قانون کو جو مرکزی مقننہ میں پیش کیا جانے والا ہو پیش ہونے سے روک دے اس لئے کہ ایسا کرنے سے برطانوی ہند کے امن و امان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل رکن مالیات کے توسط سے مقننہ میں میزانیہ پیش کرائے گا مخصوص امور کے علاوہ جیسے دفاع، قرضہ عامہ کا سود، کلیسائی اخراجات وغیرہ مقننہ کا فیصلہ میزانیہ کی مدوں کے متعلق قطعی ہوگا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی رو سے مرکزی مقننہ کے دونوں ایوانوں میں منتخب شدہ عنصر کو

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کیتھ کی کتاب A Constitutional History of India. (از صفحہ ۲۴۷ تا ۲۷۰)

اکثریت حاصل ہوئی اور اس کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔
گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے تحت مرکزی حکومت کے تمام محکموں کے مفاد کی دیکھ بھال رکھی گئی۔ اگر دو صوبوں میں کسی مسئلہ پر جھگڑا ہو اور وہ اسے آپس میں طے نہ کر سکیں تو اس کا تصفیہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کرے گا۔ حکومت کے ملکی اور فوجی انتظاموں کی عام دیکھ بھال اور نگرانی کے اختیارات بھی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو حاصل ہوں گے۔ کسی فوری ضرورت کے وقت وہ وقتی احکام نافذ کر سکے گا۔ اس قسم کے وقتی احکام کو چھ ماہ تک وہی قانونی حیثیت حاصل ہوگی جو مرکزی مقننہ کے کسی منظورہ قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ گورنر جنرل کو حق نامنظوری (ویٹو) اور حق تصدیق (سرٹی فی کیشن) حاصل ہوگا۔ حق نامنظوری سے یہ مراد ہے کہ ضرورت کے وقت کسی مسودہ قانون کو جب کہ وہ مقننہ میں منظور ہو چکا ہو رد کر دیا جائے اس لئے کہ گورنر جنرل کے خیال میں اس قانون کے نافذ کرنے سے، برطانوی ہند کے مفاد کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حق تصدیق سے یہ مراد ہے کہ گورنر جنرل کسی فوری اور ضروری معاملے کے متعلق مقننہ کی منظوری کے بغیر اپنی ذمہ داری پر کسی مسودہ قانون کو نافذ کر دے اس لئے کہ ایسا کرنا اس کی رائے میں برطانوی ہند کے مفاد کی حفاظت کیلئے ضروری ہے اور اس کے فرائض کی انجام دہی بے اس کے ممکن نہ ہوگی۔
گورنر جنرل کی مجلس عاملہ چھ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ اگرچہ قانون دستور میں اس کا کوئی تعین نہیں کیا گیا کہ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے ارکان میں ہندوستانیوں کی تعداد کیا ہوگی لیکن پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ کی سفارش یہ تھی کہ چھ میں سے تین ہندوستانی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ آئندہ اس سفارش پر عمل کیا گیا۔ قانون دستور میں صرف اتنی صراحت کی گئی تھی کہ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ میں کم سے کم تین رکن ضرور ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں تاج کی خدمت میں دس سال گزار چکے ہوں اور ہندوستان کے انتظامی معاملوں کا تجربہ رکھتے ہوں۔ ان چھ ارکان پر نو انتظامی محکمے تقسیم کر دئے گئے۔ عام طور سے ارکان مجلس عاملہ کے معتمد اپنے محکموں کے متعلق گورنر جنرل کو باخبر رکھیں گے۔ معتمدوں کی حیثیت

صرف یہ نہ ہو گی کہ وہ متعلقہ رکن کو مشورہ دیں بلکہ ان کی رائیں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے سامنے پیش ہوں گی۔ حالانکہ برطانوی کابینہ میں معتمد کی حیثیت مشیر سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن حکومت ہند کے معتمدوں کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ رکھی گئی۔ خود گورنر جنرل ان کا تقرر کیا کرے گا۔

مرکزی حکومت کی دستوری نوعیت کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ اگرچہ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء کی رو سے لیجسلیٹو اسمبلی میں منتخب شدہ ارکان کی اکثریت سے جمہوری عنصر کو قوت دی گئی لیکن اس کے حقیقی اختیارات محدود رکھے گئے۔ مرکزی حکومت کی تشکیل میں ذمہ داری کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی اصلی ذمہ داری پارلیمنٹ کے روبرو تھی نہ کہ لیجسلیٹو اسمبلی اور ہندوستانی عوام کے روبرو۔ لیجسلیٹو اسمبلی میں منتخب شدہ عنصر کو جو اکثریت دی گئی تھی اس کا منشا صرف یہ تھا کہ دستور ہند کی جدید عمارت کے دونوں حصے یعنی مرکزی اور صوبجاتی حکومتیں بالکل غیر متناسب نہ ہو جائیں۔ صوبجاتی حکومتوں میں جو تجربہ کیا گیا اگر اسی قسم کا تجربہ مرکزی حکومت میں بھی کیا جاتا تو ان امور کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا جن پر شہنشاہی مفاد مبنی ہے۔ اس واسطے عمومی مقننہ اور غیر ذمہ دار عاملہ کی ان مل بے جوڑ تجویزیں مرکزی حکومت کی تشکیل میں روا رکھی گئیں۔ ایوان بالا قائم کر کے اس بات کی کوشش کی گئی کہ اگر ایوان زیریں کا عمومی عنصر زیادہ زور پکڑے تو اس کے خلاف ایوان بالا کو استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ اگر لیجسلیٹو اسمبلی حکومت کی کسی تجویز کو رد کرے تو توقع تھی کہ کونسل آف اسٹیٹ اس کو منظور کر لے گی۔ اس قانون دستور کی رو سے مرکزی مقننہ کی ظاہری ہیئت میں تو کچھ تبدیل ضرور کی گئی لیکن اس کے ساتھ مرکزی عاملہ کا بنیادی اصول جوں کا توں رکھا گیا۔ چونکہ قانونی طور پر مرکزی عاملہ مرکزی مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں اسلئے ظاہر ہے کہ مقننہ نہ اسے برخاست کر سکتی تھی اور نہ اپنی بات منوانے پر اس کو مجبور کر سکتی تھی۔

صوبجاتی حکومت

قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء کے بموجب صوبجاتی

حکومتوں کی عاملہ اور مقننہ دونوں میں نہایت دوررس تبدیلیاں کی گئیں۔ اس قانون کے بنانے میں یہ رجحان نمایاں طور پر پایا جاتا ہے کہ مرکز سے لے کر بعض اختیارات صوبوں کو منتقل کئے جائیں اور منتخب شدہ عنصر کو حقیقی اختیار میں ایک حد تک شریک کیا جائے۔ اس سے قبل ۱۹۰۷ء کے مامور یہ شاہی بابتہ لامرکزیت (ڈی سنٹریل آئی زلیشن کمیشن) نے بھی یہی سفارش کی تھی۔ پھر لارڈ ہارڈنگ نے بہ حیثیت وائسرائے ہند اگست ۱۹۱۱ء کے مراسلہ میں جو "مراسلہ دربار تاجپوشی" کے نام سے موسوم ہے صوبوں کے اختیارات میں تدریجی اضافہ کی سفارش کی تھی اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کچھ عرصے تک ضروری ہے کہ مرکز سے صوبوں کو اختیارات کی تحویل کا رجحان کارفرما رہے تاکہ آئندہ ہندوستان خودمختار صوبوں کا مجموعہ بن جائے اور حکومت ہند کی ان پر صرف نگرانی رہے اور جہاں تک ہو سکے صوبجاتی امور میں کم سے کم دخل دہی روا رکھے۔ مرکز سے صوبوں کو اختیارات کی تحویل کے ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ ذمہ دار حکومت کا تجربہ بجائے مرکز کے صوبوں میں کیا جائے اور چنے ہوئے ارکان کو صوبجاتی نظم ونسق کے ایک حصے میں اس کا پورا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی آواز موثر بنا سکیں لیکن ایک دم سے وسیع انتظامی اختیارات دینا نامناسب ہوگا اس لئے دوعملی (ڈیارکی) کے طرز حکومت کو صوبوں میں رائج کیا گیا تاکہ انتظامی خرابی بھی پیدا نہ ہو اور ملک کے دروبست میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شرکت کا موقع ملے اور خودمختاری کے اداروں کو فروغ ہو۔

دوعملی کے اصول کے تحت صوبوں کے نظم ونسق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک کو مفوضہ امور (ٹرانسفرڈ سبجکٹس) اور دوسرے کو محفوظ امور (ریزروڈ سبجکٹس) کہتے ہیں۔ مفوضہ امور وہ ہیں جو ہندوستانی وزیروں کے تحت ہوں گے جو پارلیمانی اصول کے مطابق صوبہ کی مجلس مقننہ کے سامنے ان کی بابت جوابدہ ہوں گے۔ جیسے مقامی حکومت اختیاری، تعلیمات، حفظان صحت، تعمیرات، صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ۔ محفوظ امور سے نظم ونسق کے وہ شعبے مراد ہیں جن کے متعلق گورنر وزیر ہند کے سامنے جوابدہ

ہوگا جیسے انتظام مالگزاری، آبپاشی، عدالت، پولیس وغیرہ۔

محفوظہ امور کا انتظام گورنر بہ اجلاس کونسل کرے گا اور مفوضہ امور گورنر کو وزرا کے ساتھ سپرد ہوں گے۔ حکومت کے ان دو مختلف حصوں میں گورنر کی شخصیت ایک اتصالی کڑی کی طرح رہے گی۔ اس دو عملی کے انتظام کی بدولت صوبے کے نظم ونسق کا ایک حصہ گورنر کے توسط سے برطانوی انتخاب کنندوں کے سامنے جواب دہ قرار پایا اور دوسرا حصہ صوبجاتی انتخاب کنندوں کے سامنے۔ گورنر کو اس کا پابند نہیں کیا گیا کہ وہ وزیروں اور عاملہ کے دوسرے ارکان کا مشترکہ اجلاس کرے۔ کابینی طریق عمل ہندوستان میں رائج کرنے کی اس قانون میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وزیروں کی ذمہ داری مقننہ کے سامنے انفرادی حیثیت سے ہوگی۔ گورنر کے شاہی ہدایت نامہ میں یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ عاملہ کے ارکان اور وزیر آپس میں مشورے کی عادت بڑھانے کی کوشش کریں گے تاکہ سرکاری مشیروں کے مشورے سے وزیر مستفید ہوسکیں اور عاملہ کے ارکان کو وزیروں کے توسط سے رائے عامہ کی نسبت واقفیت حاصل ہو۔ لیکن اس کا مقصد مشترک کابینی ذمہ داری کو پیدا کرنا نہیں ہے اس واسطے کہ دو عملی کے مطابق حکومت کے دونوں حصوں کا انتظام ایک دوسرے سے علاحدہ رکھا گیا ہے۔ پارلیمانی مجلس منتخبہ نے گورنر کی عاملہ کے ارکان اور وزیروں سے امید کی ہے کہ وہ تقریر یا اظہار رائے کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں گے۔ ارکان مجلس عاملہ کے لئے یہ بات لازمی نہ ہوگی کہ وہ وزیروں کی ان تجویزوں کی تائید کریں جنھیں وہ پسند نہیں کرتے اور اسی طرح وزیروں کے لئے بھی یہ ضروری نہ ہوگا کہ ارکان عاملہ کی ان تجویزوں کی تائید کریں جنھیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر ارکان عاملہ اور وزیر ایک دوسرے کی تجویزوں سے متفق ہوں تو ایسی صورت میں انھیں اختیار ہوگا کہ وہ اس کے متعلق تقریر یا اظہار رائے کرسکیں۔

صوبہ کا میزانیہ مرتب کرنے کی پوری ذمہ داری گورنر کی مجلس عاملہ پر ہوگی۔ مجلس عاملہ کا ایک رکن محکمہ مالیات کا صدر رہوگا۔ میزانیہ مرتب کرتے وقت سب اسے

پہلے ان رقموں کی نشان وہی ضروری ہو گی جو حکومت ہند کو واجب الادا ہو نگی۔ اس کے بعد محفوظہ امور کے رقمی مطالبے پورے کئے جائیں گے اور سب سے آخر میں مفوضہ امور کے اخراجات کی پابجائی ہو گی۔ اگر مفوضہ امور کے لئے کافی رقم نہ بچے تو وزیروں کو اختیار ہو گا کہ اس کے لئے مقننہ میں مزید محصول لگانے کی تحریک کریں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یہ تحریک پیش کی جائے محکمہ مالیات اس کے متعلق ضروری تنقیح کرے گا اور مفوضہ امور کے متعلق آمدنی اور خرچ کی جانچ کرنے کے بعد اس کی سفارش کرے گا کہ آیا نئے محصول کی تحریک پیش کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ دراصل مفوضہ امور اور محفوظہ امور کے درمیان صوبجاتی آمدنی کی تقسیم ایسا دشوار مسئلہ تھا جس کا اطمینان بخش حل قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء میں تلاش کرنا عبث ہے۔ گورنر کو اختیار ہو گا کہ وہ صوبے کی آمدنی کو محفوظہ امور اور مفوضہ امور کی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنی صوابدید پر تقسیم کر دے اور یہ تقسیم کا اصول اس وقت تک نافذ رہے گا جب تک کہ مقننہ کا جدید انتخاب عمل میں نہ آجائے۔ عملی طور پر چونکہ محفوظہ امور کے مطالبوں کو ترجیح حاصل ہو گی اس لئے وزیروں کے لئے ناممکن ہو گا کہ وہ قومیت کی تعمیر کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

قانون حکومت سنہ ۱۹۱۹ء کے تحت صوبجاتی مقننہ کو منٹو مارلے اصلاحوں کے مقابلے میں کافی وسعت دی گئی اور نسبتاً ان کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔ انتخاب براہ راست ہونے لگا اور حق رائے دہی کی توسیع عمل میں آئی۔ مسلمانوں، سکھوں، دیسی عیسائیوں اور اینگلو انڈینس کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا گیا۔ مدراس میں غیر برہمنوں اور بمبئی میں مرہٹوں کے لئے بھی نشستیں محفوظ کی گئیں۔ زمینداروں، تاجروں، کارخانوں کے مالکوں اور ریلان ٹرز کے لئے الگ نشستیں رکھی گئیں تاکہ مختلف مفادوں کی نمایندگی ہو سکے۔ اسی اختلاف مفاد کے اصول کے تحت شہری اور دیہی انتخابات کے حلقوں کا اضافہ ہوا۔ جن لوگوں کو حق رائے دہی حاصل ہوا وہ کل ملک کے بیس سال سے اوپر مردوں کی آبادی کے ۹ فی صد تھے۔

صوبجاتی حکومتوں میں دوعملی کا جو طریق حکومت نافذ کیا گیا اس پر یہ نکتہ چینی ہوتی ہے کہ نظم ونسق ایک وحدت بالکل ہوتا ہے جسے اسطرح ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ صوبہ کے نظم ونسق کا ایک حصہ تو صوبے کے رائے دینے والوں کے سامنے جوابدہ ہو اور دوسرے حصے کا تعلق برطانوی پارلیمنٹ سے قایم رہے جس کی نمایندگی وزیر ہند کے ذمہ ہوگی۔ مفوضہ امور کے متعلق تمام تجویزیں گورنر کے رحم وکرم پر منحصر ہوں گی۔ وہ اپنی صوابدید پر صوبہ کی آمدنی یا بجٹ کو مختلف محکموں کیلئے خاص کر سکے گا۔ ایسی صورت میں وزیر اپنے محکموں کے لئے اسی وقت ضروری رقمیں حاصل کر سکیں گے جبکہ ان کے تعلقات گورنر اور مجلس عاملہ کے ارکان سے نہایت خوشگوار ہوں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تجویزیں آگے نہ بڑھ سکیں گی۔

وزیر ہند بہ اجلاس کونسل

لارڈ کریو کی صدارت میں وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کے اختیارات کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے جون ۱۹۱۹ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ وزیر ہند کی کونسل کو ختم کر دینا چاہئے۔ لیکن پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ نے اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کیا اور اس کے اثرات کو مضرت رساں بتلایا۔ چنانچہ قانون دستور میں کونسل کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی تشکیل میں بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کونسل کے ارکان کی زیادہ سے زیادہ تعداد بجائے ۱۴ کے ۱۲ کر دی گئی اور کم سے کم ۸۔ ان میں سے نصف ارکان کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان میں ملازمت کے سلسلہ میں کم سے کم دس سال رہ چکے ہوں۔ رکنیت کی مدت بجائے سات سال کے پانچ سال کر دی گئی۔ بارہ سو پونڈ سالانہ ہر رکن کے لئے مشاہرہ مقرر کیا گیا لیکن ان ارکان کے لئے جن کا وطن ہندوستان ہو چھ سو پونڈ سالانہ بطور مزید الاونس دئے جائیں گے تاکہ وہ انگلستان میں خوش حالی سے زندگی بسر کر سکیں۔ اگرچہ دستور میں صراحت کے ساتھ وزیر ہند کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جن معاملوں کو چاہے اپنی صوابدید پر کونسل میں پیش کرے اور جنھیں چاہے نہ پیش کرے اور انکے

متعلق اپنی ذمہ داری پر براہ راست حکومت ہند کو احکام بھیج دے لیکن کونسل کی حیثیت یقینی طور پر وزیر ہند کے تحت قرار دی گئی۔ اور اس کی اہمیت بہ نسبت پیشتر کے کم ہوگئی۔ وزیر ہند اور اس کے دفتر کے اخراجات کی منظوری پارلیمنٹ میں ہوا کرے گی اور جیسا کہ اب تک قاعدہ چلا آتا تھا حکومت ہند کو ان اخراجات سے زیر بار نہیں کیا جائے گا۔ وزیر ہند کے نائب اور کونسل کے ارکان کی تنخواہیں بھی پارلیمنٹ کی منظورہ رقم سے دی جائیں گی۔

وزیر ہند کو ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے نظم ونسق میں دخل دینے کا دستوری حق حاصل ہوگا اور ہندوستان میں امن وامان اور عمدہ انتظام قایم کرنے کے لئے وہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ وزیر ہند کی دخل دہی صرف انتہائی صورتوں میں ہوگی ورنہ جہاں تک ہو سکے گا مقامی حکومتوں کو اپنے نظم ونسق کے معاملوں میں خود مختار چھوڑ دیا جائے گا۔ وزیر ہند کا یہ کام ہو گا کہ حکومت کی اعلیٰ حکمت عملی کا تعین کرے جس کا نفاذ حکومت ہند اور صوبے کی حکومتیں اپنے اپنے عمل کے حلقوں میں کریں گی۔ محصولاتی درآمد کے متعلق اگر حکومت ہند اور لیجسلیٹیو اسمبلی متفق ہوں تو دستوری حیثیت سے وزیر ہند کو دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ قانون دستور میں اس کی صراحت موجود ہے کہ وزیر ہند ان مالیاتی انتظاموں کی حفاظت کرے گا جو شہنشاہی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہیں یا جن کے متعلق ملک معظم کی حکومت کوئی معاہدہ کر چکی ہے۔ اسی طرح صوبوں کے نظم ونسق میں اگر مفوضہ امور کے متعلق حکومت اور مقننہ متفق ہوں تو وزیر ہند دخل اندازی کا مجاز نہ ہوگا۔

وزیر ہند کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کے منظور کئے ہوئے مسودات قوانین کو رد کر دے یا بعض مسودوں کو پیش ہونے سے روک دے۔ وزیر ہند کا تعلق ہندوستانی نظم ونسق کے سیاسی پہلو سے رہیگا اس کے فرائض گماشتگی ایک ہائی کمشنر کے سپرد کر دئے جائیں گے جس کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ وہ حکومت ہند کے لئے انگلستان میں ضروری اشیا خریدے

اور ہندوستانی تاجروں کے مفاد کی دیکھ بھال کرے۔ جو ہندوستانی طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان جائیں ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوگا۔ ہائی کمشنر اور اس کے عملے کے کل اخراجات کا بار حکومت ہند کے مالیہ پر ہوگا۔ ہائی کمشنر حکومت ہند کی ہدایتوں کے بموجب مصدقہ گماشتہ کے تمام فرائض انگلستان میں انجام دے گا۔ اس کا وہی مرتبہ تسلیم کیا جائے گا جو برطانوی قلمروؤں کے قنصلوں کا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت حکومت ہند کے سرکاری نمایندے کی ہوگی اور اس کے ذریعہ سے حکومت ہند انگلستان کے تمام تجارتی معاملوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گی۔

ایوان والیان ریاست

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں اس امر پر بھی غور کیا گیا تھا کہ برطانوی ہند کی سیاسی تبدیلیوں کا دیسی ریاستوں پر کیا اثر ہوگا۔ اس کے ساتھ والیان ریاست کو اس کا اطمینان دلانے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ برطانوی ہند کے دستوری تغیرات سے ان کے حقوق، رعایتیں اور معاہدے متاثر نہیں ہوں گے۔ اس امر کی بھی سرسری طور پر تنقیح کی گئی کہ حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات کی نوعیت مختلف زمانوں میں بدلتی رہی ہے۔ برطانوی سیادت اور بالادستی کا اصول مسلمہ حیثیت رکھتا ہے جس میں شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں ہے حکومت ہند نے اپنی مصلحتوں کے موافق دیسی ریاستوں کے ساتھ کبھی مداخلت کبھی عدم مداخلت اور کبھی اتحاد و تعاون کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ دیسی ریاستوں کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت ہند کے ذمہ ہے جو امور خارجی میں ان کی نمایندگی کرنے کی بھی مجاز ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں والیان ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مشترکہ مدافعت میں حکومت ہند کے ساتھ شرکت کریں۔

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے بعد حکومت ہند کی یہ کوشش رہی کہ والیان ریاست آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست تعلقات نہ پیدا کریں لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آخر سے حکومت ہند کی یہ خواہش ہے کہ والیان ریاست اپنے وسیلوں کی تنظیم کریں اور باقاعدہ تشکیل

میں حکومت ہند کے معاون اور شریک کار ہیں چنانچہ سب سے پہلے لارڈ لٹن نے "ہندوستانی پریوی کونسل" قایم کرنے کی تجویز پیش کی جس میں والیان ریاست کو شریک کرنے کا خیال تھا۔ اس ضمن میں بعض والیان ریاست کو "مشیر ملکہ معظمہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس کے بعد لارڈ کرزن نے "مجلس والیان ریاست" کے قایم کرنے کی تجویز کی لیکن چونکہ والیان ریاست اس کی عام حکومت عملی کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے اس لئے یہ تجویز بھی یونہی رہی۔ لارڈ منٹو کی حکومت نے سیاسی اصلاحوں کے متعلق وزیر ہند کو جو سفارشیں بھیجی تھیں ان میں بھی والیان ریاست کی ایک "شہنشاہی مشورتی مجلس" کے قیام کی تحریک کی تھی اور یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس تجویز کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ حکومت ہند والیان ریاست کے اندرونی معاملوں میں دخل دینا چاہتی ہے بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت قایم کی جائے جو ان مشترک مسائل پر غور کر سکے جن کا تعلق برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں سے ہے۔ لارڈ منٹو نے سب سے پہلے والیان ریاست سے باقاعدہ مشورہ کرنے کے طریقے کو رائج کیا جس کو اس کے جانشین لارڈ ہارڈنگ کے عہد حکومت میں اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے لارڈ ہارڈنگ کو والیان ریاست سے مشورے کرنے کا موقع ملا اس واسطے کہ اس وقت پورے ہندوستان کے وسیلوں کو دشمن کے خلاف بروئے کار لانے کی ضرورت تھی۔ لارڈ ہارڈنگ نے والیان ریاست کو اس کا بھی موقع دیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے اپنے مشترک مفاد کی حفاظت کے لئے مشورہ کریں لارڈ چمسفورڈ کے عہد میں یہ قاعدہ بن گیا کہ والیانِ ریاست یا ان کے نمایندے ہر سال ایک کانفرنس کریں اور ان مسائل پر غور کیا جائے جن کا تعلق والیانِ ریاست سے مجموعی حیثیت سے ہو۔ ان کانفرنسوں میں وہ مسائل بھی بحث میں آئے جن کا تعلق برطانوی ہند اور ریاستوں سے تھا۔ مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چمسفورڈ نے نئی سیاسی اصلاحوں کے سلسلے میں تمام ہندوستان کا دورہ کیا تو اس موقع پر والیان ریاست نے بھی ایک وفد کے ذریعہ اپنے مطالبے پیش کئے۔ اس وفد نے خاص طور سے چار باتوں پر زور دیا (۱) کل

ہندی حکمت عملی کی تشکیل میں والیان ریاست کو موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی آواز موثر بنا سکیں۔ (۲) ایک ایسی غیر جانبدار عدالت قایم ہونی چاہیئے جہاں اختلافی مسائل پیش کئے جا سکیں جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے درمیان پیدا ہوں کیونکہ ایسے معاملوں میں حکومت ہند فریق بھی ہوتی ہے اور جج بھی۔ (۳) حکومت ہند کا محکمہ سیاسیات بعض اوقات معاہدوں کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کا والیان ریاست کے پاس کوئی علاج نہیں ہے (۱) ایک ایسی مشورتی جماعت قایم ہونی چاہیئے جہاں والیان ریاست اپنے مشترک مفاد کے متعلق آپس میں مشورہ کر سکیں اور جس کے ذریعہ سے کل ہندی امور کے متعلق وہ اپنی رائے حکومت ہند تک پہنچا سکیں۔

مانٹگو چیمسفورڈ رپورٹ میں اس امر کی سفارش کی گئی تھی کہ والیان ریاست کو ایک ایسی مشورتی جماعت قایم کرنے کا موقع دینا چاہیئے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مشترک مفاد کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ اس سفارش کے بموجب شاہی اعلان کے ذریعہ ایوان والیان ریاست (چمبر آف پرنسس) قایم کیا گیا۔ اس کے ارکان کی تعداد ۱۲۰ مقرر کی گئی جن میں سے ۱۰۸ والیان ریاست خود ہونگے اور ۱۲ والیان ریاست کے نمایندے۔ شاہی اعلان میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس ایوان کے قیام سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو والیان ریاست براہ راست حکومت ہند کے ساتھ اپنے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں وہ آیندہ ایسا نہ کر سکیں گے بلکہ معمول کے موافق اس پرانے طریق عمل میں کوئی فرق نہ پیدا ہونا چاہئے جو اب تک جاری ہے۔ ایوان والیان ریاست کی حیثیت محض مشورتی ہوگی نہ کہ عاملانہ۔ ایوان اس کا مجاز نہ ہوگا کہ وہ کسی ریاست کے اندرونی انتظامی معاملوں یا والی ریاست کی شخصیت پر بحث کر سکے۔ ایوان کا اجلاس سال میں ایک دفعہ حکومت ہند کے صدر مقام میں ہوا کرے گا جس کی صدارت وائسرائے ہند کرے گا۔ اجلاس ہونے سے پہلے ایجنڈا وائسرائے کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔ ایوان اپنا ایک چانسلر منتخب کرے گا جو وائسرے کی غیر موجودگی میں صدارت کے فرائض ادا کرے گا۔ ایوان

کی ایک مجلس قائمہ ہوگی جو چانسلر کے علاوہ پانچ ارکان پر مشتمل ہوگی اس مجلس کی صدارت بھی چانسلر کے ذمہ ہوگی۔ مجلس قائمہ کے رکنوں کا انتخاب ایوان والیان ریاست کے ارکان میں سے سالانہ ہوا کریگا
مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے باہمی اتحاد عمل کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے رپورٹ کے مرتب کرنیوالوں کی پیش بینی اور تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق انکے سامنے کس قدر واضح اور مکمل تصویر تھی جسکے خدوخال اسوقت کچھ دھندلے سے تھے لیکن تھوڑے دنوں میں وہ پوری طرح اجاگر ہونیوالے تھے۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہندوستان کے مستقبل کا خیال کرتے وقت ہماری نظروں کے سامنے ایک ایسی سیاسی تشکیل آجاتی ہے جس کے خارجی خدوخال "وفاق" سے ملتے جلتے ہیں۔ صوبے آخر خود مختار اکائیاں بن جائیں گے جنھیں مرکزی حکومت اکٹھا رکھے گی اور ان امور کا انتظام کرے گی جو ان سب صوبوں کے لئے مشترک ہوں گے۔ لیکن جو امور برطانوی صوبوں میں مشترک ہیں ان کا بڑی حد تک ریاستوں کے ساتھ بھی تعلق ہوگا۔ مثلاً دفاع، جنگی، مروجہ زر کا مبادلہ، نمک، ریلوئے، ٹپہ اور تار۔ حکومت ہند ان امور کی طرف توجہ کرے گی اور ریاستیں اپنی اندرونی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے جو انھیں عزیز ہے مرکزی حکومت کے ساتھ گہرے رابطے پیدا کرلیں گی اگر وہ ایسا کرنا پسند کریں۔ اگرچہ ہمیں اس میں پس وپیش نہیں کہ اس قسم کے مستقبل کی اس وقت پیشین گوئی کریں لیکن ہماری یہ خواہش ہرگز نہ سمجھی جائے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں خواہ مخواہ جلد بازی سے کام لیا جائے۔ دراصل ہندوستان میں ایسی قوتیں اور موثرات اپنا کام کررہے ہیں جنھیں مصنوعی محرکات کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اسی کی ضرورت ہے اور ہم اس وقت صرف یہی کر بھی سکتے ہیں کہ مستقبل کی ترقی کی راہ کو صاف کردیں۔

تیئیسواں باب

سنہ ۱۹۱۹ء کا قانون اصلاحات اور ملک میں عام سیاسی بےچینی

سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون اصلاحات کے نافذ ہونے سے پہلے ہندوستانی مدبر دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک انڈین نیشنل کانگریس کی جماعت تھی جو ان اصلاحوں کو ناکافی اور غیر اطمینان بخش کہتی تھی اور دوسری جماعت اعتدال پسند مدبروں کی تھی جنھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے نیشنل لبرل فیڈریشن کے نام سے اپنی جداگانہ تنظیم کر لی تھی۔ موخر الذکر جماعت اصلاحوں کو قبول کرنے اور ان کے ذریعہ سے اپنے وطن والوں کو فائدہ پہنچانے کے اصول کی قائل تھی اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار تھی۔ اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ جدید دستور کے ذریعہ وہ وزیر ہند اور پارلیمنٹ کے سامنے بہتر طریقے سے اپنے مطالبے پیش کر سکیں گے۔ چنانچہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں اس جماعت کے افراد کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا اس واسطے کہ کانگریس نے جدید دستور کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کر لی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں بھی دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح عام انتشار کی کیفیت رونما تھی۔ ایک کروڑ نفوس کے لگ بھگ انفلوئنزا کی نذر ہوگئے۔ سیاسی بے چینی انقلابی رنگ اختیار کرنے لگی اور ۱۹۱۸ء کے آخری زمانے میں پنجاب اور مغربی ہندوستان میں شورش کے آثار پیدا ہونے لگے۔ حکومت ہند نے مسٹر رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے مطبع (پریس) اور تقریر کرنے اور جلسے کرنے کی آزادی پر قیدیں لگائیں اور سیاسی ملزموں کے فیصلے بغیر جیوری کے ججوں کو کرنے کا اختیار دے دیا۔ حکومت ہند نے ان سفارشوں پر عمل کرنے کے لئے قانون کے کئی مسودے منظور کئے جنھیں رولٹ ایکٹس کہتے ہیں۔ ان کے خلاف ملک کے ایک گوشے سے لیکر دوسرے گوشے تک احتجاج کی صدا بلند کی گئی اور ان قوانین کو منسوخ کرنے پر زور دیا گیا۔ پنجاب میں اضطراب انگیز عنصر کا اثر بڑھنے لگا۔ حکومت نے مارشل لا کا نفاذ کر دیا، اور سیاسی جلسوں اور جلوسوں کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ ان احکام کی خلاف ورزی میں امرتسر کے جلیانوالا باغ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا گیا جس کو منتشر کرنے کے لئے جنرل ڈائر نے اپنی فوج کو گولیاں چلانے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر ۳۷۹ آدمیوں کی جانیں ضائع گئیں اور ۱۲۰۰ سخت زخمی ہوئے۔ اس واقعہ سے سارے ہندوستان میں انگریزی عملداری کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ اس واقعہ کو پنجاب کی حکومت نے پسندیدہ نظر سے دیکھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں بعض سرکاری عہدہ داروں نے وہاں کے باشندوں کو ذلیل کرنے کے لئے احکام نافذ کئے مثلاً یہ کہ ہر انگریز کو سلام کرنا ضروری ہے۔ کسی معمولی سی قاعدے کی خلاف ورزی پر کوڑے مارنے کی سزا دی جانے لگی۔[1]

[1] Report of the Hunter Committee, 1920

ان معاملوں کے متعلق پارلیمنٹ میں ہندوستان کے بعض ہمدرد انگریزوں کے توجہ دلانے پر پارلیمنٹ کی طرف سے ہنٹر کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں جنرل ڈائیر کی غلطی کو تسلیم کیا۔ وزیر ہند اور آرمی کونسل نے بھی جنرل ڈائر کی اس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ ہنٹر کمیٹی نے تسلیم کیا کہ پنجاب میں پہلے سے کوئی ایسی باقاعدہ سازش نہ تھی جس کا مقصد انگریزی راج کو قوت سے ختم کر دینا ہو۔[1]

تیسری جنگ افغانستان

ہندوستان کی سیاسی حالت کو پیچیدہ کرنے میں ۱۹۱۹ء کی افغانستان کی تیسری جنگ کا بھی اثر پڑا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد ان کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لئے کچھ کشمکش رہی جس میں سب سے چھوٹا لڑکا امیر امان اللہ خاں کامیاب ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران میں افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ اپنی دوستی کو برقرار رکھا۔ اب جب کہ ہندوستان میں سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی تو افغانستانی حکومت نے خیال کیا کہ برطانوی حلقۂ اثر سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہونے کا یہ بہترین موقع ہے۔ چنانچہ افغانی فوجوں نے ہندوستان کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ امیر حبیب اللہ خاں کی انگریزوں سے دوستی کو افغانستان کا انتہا پسند طبقہ کمزوری سمجھتا تھا۔ امیر امان اللہ خاں اسی طبقہ کی مدد سے حکمران بنا تھا اور اس کو ہندوستان کی بے چینی کے متعلق جو مبالغہ آمیز خبریں مل رہی تھیں ان کے اثر میں آکر اس جنگ کا آغاز کیا گیا۔ وادی ٹوچی میں انگریزوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور افغانی فوجوں کی مدد کے لئے محسودی اور وزیری قبائل بھی آمادہ ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کے ہوائی جہازوں سے

---

[1] Report of the Hunter Committee, 1920 -

سرحدی مقاموں اور جلال آباد اور کابل میں بڑی تباہی پھیلی۔ انگریزی فوجوں نے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ افغانوں نے صلح کی درخواست کی۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں صلح نامہ ہو گیا۔ حکومت ہند اندرونی خلفشار میں ایسی مبتلا تھی کہ وہ بھی معاملوں کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ صلح نامہ کے بموجب افغانستان کو انگریزی حلقہ اثر سے آزاد کر دیا گیا اور حکومت افغانستان کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ خارجی دولتوں سے براہ راست اپنے سیاسی تعلقات قائم کرے اور دوسرے ملکوں میں قنصل خانے قایم کرے۔ افغانی حکومت کے پیش نظر اس جنگ سے یہی مقصد تھا جو اس نے حاصل کر لیا۔ حکومت ہند جو امدادی زر دیا کرتی تھی وہ بند کر دیا گیا۔ لیکن افغانستان سے صلح ہو جانے کے بعد بھی قبائلی علاقے میں برابر بے چینی بڑھتی گئی اور انگریزوں کے خلاف مذہبی جوش میں کئی سال تک کمی نہیں آئی۔

خلافت اور ترک موالات

اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں خلافت کے مسئلہ کی وجہ سے انگریزی حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ خلافت کی تحریک مولٰنا شوکت علی اور مولٰنا محمد علی کی رہبری میں شروع ہوئی تاکہ حکومت برطانیہ پر زور ڈالا جائے کہ وہ مقامات مقدسہ پر یورپی قوموں کا قبضہ نہ ہونے دے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد سخت انتشار کی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مسٹر مانٹیگو اور لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے لڑائی کے زمانے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا پورا احترام کریں گے اور ان کے مطالبوں کو تا امکان پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن صلح نامہ سیورے کی رو سے جو ترکوں اور اتحادیوں میں ہوا ترکی کے حصے بخرے کر دئے گئے اور خلیفتہ المسلمین کی حیثیت قسطنطنیہ میں ایک قیدی کی سی رہ گئی۔ اس صلح نامہ کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کی صدا بلند کی اور انھوں نے اپنے مقصدوں کو حاصل کرنے کے لئے گاندھی جی کی ترک موالات (نان کوآپریشن) کی تحریک میں شرکت کی جو انگریزی حکومت

کے خلاف شروع ہو چکی تھی۔ گاندھی جی نے مسلمان قائدوں کے ساتھ ملکر ترک موالات کی تحریک کے اصول مرتب کئے اور کلکتہ کانگریس (سنہ ۱۹۲۰ء) میں حکومت سے عملی تعاون ترک کرنے کا قطعی فیصلہ کیا گیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت کی ملازمت ترک کردیں۔ طلبہ اسکولوں کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ عدالتوں کا مقاطعہ کیا جائے آخر سیول نافرمانی کے ذریعہ حکومت کو ٹیکس دینے بند کردئے جائیں اور اس طرح نظم و نسق کو مفلوج کردیا جائے۔ ان اصول پر عمل کرنے سے ملک کو سوراج حاصل ہو جائے گا جو تحریک کا اصلی مقصد ہے۔ اس تحریک سے ملک کے طول و عرض میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ شروع میں حکومت ہند نے اس تحریک کو روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن جب اس کی زد برطانوی شہنشاہی مفاد پر براہ راست پڑنے لگی تو اس میں حصہ لینے والوں کے خلاف کارروائی شروع کی گئی۔ لارڈ ریڈنگ نے جو سنہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ چمسفورڈ کے جانے کے بعد گورنر جنرل ہو کر آیا تھا ترک موالات کی تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور حالات پر قابو پا لیا۔

یہ تھے سیاسی حالات جب کہ قانون دستور کو نافذ کیا گیا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں اس قانون کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے انتخابوں میں شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ اس لئے اعتدال پسند جماعت کے افراد کو جدید اصلاحوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ صوبوں میں وزیروں کے انتخاب میں گورنروں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اعلیٰ عہدوں کے لئے قابل لوگوں کی کمی نہ تھی لیکن اعتدال پسند جماعت کے وزیروں نے بھی بہت جلد محسوس کرلیا کہ وہ اپنے اختیارات کو اس وقت تک نہیں استعمال کر سکتے جب تک کہ صوبجاتی مالیات کے انتظام میں انھیں عمل دخل حاصل نہ ہو۔ بدقسمتی سے جنگ کے بعد کی کساد بازاری کی وجہ سے مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کی مالی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ لارڈ مسٹن کی صدارت میں مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کے مالی تعلقات کو متعین کرنے کی غرض

سے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی سفارشوں کے مطابق جو تصفیہ ہوا وہ اکثر صوبوں کو ناپسند تھا۔ فصلوں کی خرابی، تجارتی کساد بازاری اور سیاسی تحریک کی روک تھام کے لئے مزید اخراجات کے سبب سے صوبوں کی مالی حالت کمزور ہوگئی۔ ایک طرف تو وزیر اپنے قومی تعمیر کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے دوسرے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے تحت جو سیول سروس کے اعلیٰ حکام ہیں ان پر ان کا اثر محدود ہے۔ اس لئے کہ ان حکام کی براہ راست گورنر تک رسائی تھی۔ اس سے اعتدال پسند طبقے میں بھی جو اب تک حکومت کے ساتھ عملی تعاون کر رہا تھا ایک طرح کی بددلی پھیل گئی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی اور صوبوں کی مقننہ کے آئندہ انتخابوں میں کانگریس کے نمایندے شرکت کریں اور مجالس مقننہ میں شریک ہو کر حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈالیں تاکہ دستوری حکومت کا چلنا ناممکن ہو جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی نے حصہ لیا۔ اس زمانے میں برطانوی سیاست میں لیبر پارٹی کو اقتدار نصیب ہوگیا تھا جس سے ہندوستانی وطن پرستوں کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن اپنی پارٹی کی اندرونی حالت اور عملی دشواریوں کے باعث لیبر وزارت ہندوستان کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ سوراج پارٹی نے بنگال اور صوبہ متوسط میں دوعملی کے نظام حکومت کو ناممکن بنا دیا اور گورنروں کو مجبور کیا کہ وہ صوبے کی حکومت کی ذمہ داری کو خود انجام دیں۔

سوراج پارٹی نے فروری سنہ ۱۹۲۴ء میں مرکزی مقننہ میں یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کرائی:-

"لیجسلیٹو اسمبلی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ وہ موجودہ قانون حکومت ہند پر پارلیمنٹ سے نظر ثانی کرنے کی درخواست کرے تاکہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت قایم ہو اور جلد سے جلد ایک نمایندہ گول میز کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ اقلیتوں کے مفاد اور حقوق کا پورا

لحاظ اور حفاظت کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے اساسی دستور بنایا جائے اور موجودہ مرکزی مقننہ کو برخاست کرکے یہ دستور اساسی نئی منتخب شدہ مقننہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔ اس کے بعد برطانوی پارلیمنٹ اس اسکیم کو قانونی تشکل دے۔"

لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے سنہ ۱۹۲۳ء میں سر اے مڈی مین کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ نافذہ اصلاحوں کے متعلق تحقیق کرکے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کے چھ ارکان میں دو ہندوستانی شریک کئے گئے تھے اور صرف اس امر کی تحقیق اس کے ذمہ تھی کہ دوعملی کے نافذ کرنے سے جو دشواریاں پیدا ہوئی ہیں انھیں کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کمیٹی نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ دوعملی کے طرز حکومت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مڈی مین کمیٹی نے کثرت رائے سے سفارش کی کہ گورنر کی عاملہ اور وزیروں میں تمام اہم امور کے متعلق باہمی مشورہ ہونا چاہئے اور گورنر کو چاہئے کہ مفوضہ امور کے متعلق وہ اپنے وزیروں کی رائے سے اختلاف نہ کرے سوائے ایسی حالت کے کہ اقلیت یا خاص طبقوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ اگر کوئی وزیر کسی وجہ سے مستعفی ہونا چاہتا ہے تو جس طرح انگلستان میں ہوتا ہے یہاں بھی وہ مقننہ کے سامنے اپنے مستعفی ہونے کے وجوہ پیش کرے گا۔ ارکان عاملہ اور وزیروں کی مشترک حیثیت کابینہ کی طرح ہونی چاہئے جہاں وہ اپنے محکموں کے اہم معاملے تصفیہ کے لئے پیش کیا کریں۔ چونکہ معتمدوں کی براہ راست گورنر تک رسائی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ گورنر کے سامنے اپنے محکمے کا کوئی معاملہ پیش کریں وزیر متعلقہ کو اس کی نسبت مطلع کردیں اور خاص کر ایسے امور کی وزیر کو ضرور اطلاع دی جائے جن کے متعلق معتمد اور وزیر کی رائے میں اختلاف ہو۔

لارڈ ریڈنگ نے جب سنہ ۱۹۲۶ء میں اپنے عہدہ کا جائزہ لارڈ ارون کو دیا تو ملک میں پھر بے چینی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء میں مذکور تھا کہ اس قانون کے نافذ ہونے کے دس سال بعد تحقیقات

کی جائے گی کہ موجودہ قانون میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ کہ ذمہ دار حکومت کے اصول کی کس حد تک توسیع عمل میں آنی چاہئے یا جو اختیارات دئے گئے ہیں انھیں اور محدود کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے سنہ ۱۹۲۷ء میں لارڈ ارون کی حکومت کی سفارش پر ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کی تحقیقات کے لئے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ یہ کمیشن سات انگریز ارکان پر مشتمل تھا۔ چونکہ کسی ہندوستانی کو اس میں شریک نہیں کیا گیا تھا اس لئے اعتدال پسند طبقے نے بھی کانگریس کے ساتھ ہو کر اس کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو اس کا بائیکاٹ کیا گیا اور ہر جگہ اس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ ہندوستانی رائے عامہ کو موافق کرنے کے لئے صدر کمیشن کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مرکزی مقننہ کے منتخب شدہ ارکان میں سے چھ ارکان کو اپنے ساتھ شریک کرے جو برطانوی کمیشن کے ساتھ شہادتیں قلمبند کر کے اپنی رپورٹ الگ پیش کریں۔

اس دوران میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی ایک تقریر میں اس دعوے کا کہ پارلیمنٹ کو ہندوستان کے متعلق دستور بنانے کا اختیار نہیں ہے یہ جواب طنزاً دیا کہ ہندوستانی خود کوئی ایسا دستور کیوں نہیں تیار کرتے جسے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس پر کانگریس نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کو دعوت دی اور پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی اساسی دستور بنانے کیلئے مقرر کی گئی جس میں مختلف سیاسی جماعتوں کے ممتاز ارکان شریک تھے۔ اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی جو نہرو رپورٹ کہلاتی ہے۔ اس رپورٹ میں ہندوستان میں قلمروی طرز کی ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی پرزور سفارش کی گئی۔ ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ مشترک انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لینا چاہئے اور مسلمانوں کیلئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں نشستوں کا تعین کر دیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے عام طور پر ان سفارشوں کی مخالفت کی۔ ریاستوں کے متعلق نہرو رپورٹ میں سر ولزلی اسکاٹ کے خیالات

سے اختلاف کیا گیا جو موصوف نے والیان ریاست کے وکیل کی حیثیت سے پیش کئے تھے۔ وہ خیالات یہ ہیں:-

(۱) تاج اور دیسی ریاستوں کے درمیان بنیادی رشتہ باہمی رضامندی پر مبنی ہے اور برطانیہ نے اسے صاف طور پر تسلیم کیا ہے۔

(۲) تاج اور دیسی ریاستوں کے معاہدے تاج اور والیان ریاست کے درمیان ہوئے ہیں نہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ساتھ۔

(۳) والیان ریاست نے معاہدہ کرتے وقت برطانوی تاج اور پارلیمنٹ پر بھروسا کیا تھا اس لئے تاج ان معاہدوں کی ذمہ داری کو کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ تاج نے بالادست قوت کی حیثیت سے تمام ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔

نہرو کمیٹی نے اس اصول پر اعتراض کیا کہ دیسی ریاستوں کا تعلق براہ راست تاج سے ہے۔ اس کے نزدیک اب تک دیسی ریاستوں کے متعلق تمام معاہدوں کا نفاذ اور ان فرائض کی ادائی جو ان معاہدوں کی رو سے عاید ہوتی ہے وزیر ہند کی نام نہاد نگرانی میں حکومت ہند کرتی رہی ہے۔ بعض اختیارات اس ضمن میں کثرت استعمال اور رسم و رواج کی بناء پر حکومت ہند کو حاصل ہو گئے ہیں جو تحریری معاہدوں کی حدوں سے باہر ہیں۔ کوئی والی ریاست حکومت ہند کو نظر انداز کر کے کسی معاملہ کو تاج یا ملک معظم کی حکومت کے پاس براہ راست نہیں پیش کر سکتا۔ اب تک والیان ریاست کا تعلق حکومت ہند سے رہا ہے اور انھوں نے اس کے احکام، فیصلوں اور دخل دہی کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور کبھی تاج کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں قایم رکھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے والیان ریاست کے ساتھ ہمیشہ حکومت ہند نے معاملے طے کئے ہیں۔ پھر کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے کہ آئندہ بھی حکومت ہند ہی اگر اسے قلمروی مرتبہ حاصل ہو جائے، ان کے ساتھ معاملہ نہ کر سکے۔ نہرو رپورٹ میں والیان ریاست کو یقین دلایا گیا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں پارلیمنٹ کے سامنے
پیش کی۔ رپورٹ کی پہلی جلد میں ہندوستان کے نسلی، معاشرتی اور سیاسی
حالات پر عام تبصرہ ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان
کے حالات انگلستان سے بالکل جداگانہ ہیں اس لئے یہاں برطانوی اداروں
کی پوری نقل نہیں ہو سکتی۔ رپورٹ کی دوسری جلد میں کمیشن کی سفارشیں درج
ہیں۔ ریاستوں کا مسئلہ کمیشن کی حد بندی سے باہر تھا اس لیئے اس کی
تحقیقات ایک علحدہ کمیٹی کے لئے چھوڑ دی گئی اور سائمن کمیشن نے صرف
برطانوی ہند کے متعلق اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیں۔ مرکزی
حکومت کے متعلق کمیشن کی رائے تھی کہ یہاں دوعملی قایم کرنا مفید نہیں بلکہ خطرناک
ہوگا۔ جن امور کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے وہ زیادہ تر شہنشاہی حیثیت
رکھتے ہیں اس لئے مرکزی نظم ونسق میں وحدت اور مرکزی عاملہ کا مقننہ
تجربہ سے آزاد رہنا نہایت ضروری ہے۔ دوعملی سے اختیارات تقسیم ہو جائیں گے
اور حکمت عملی کی یکسانی نہیں قایم رہ سکتی جیسا کہ صوبجاتی حکومتوں کے گزشتہ
سے ثابت ہوتا ہے خاص کر گورنر جنرل کو اس انتظام کی بدولت بڑی دشواری
پیش آئے گی۔ اگر اس میں اور اس کے شرکائے کار میں اختلافات پیدا ہوں تو
مشترکہ ذمہ داری کو ضرر پہنچے گا۔ دوعملی کے طرز حکومت میں اس کا قوی
امکان رہے گا کہ وزیر عاملہ کے دوسرے ارکان کی حکمت عملی کو ناپسند
کریں لیکن اس کی اندرونی وحدت میں کوئی خلل نہیں پڑنا چاہیئے۔ ہندوستان
کے سیاسی ارتقا کا بظاہر یہ اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل کے اختیارات
بجائے کم ہونے کے زیادہ کرنے ہوں گے۔ خاصکر ہز مجسٹی ملک معظم کے نمایندے
کی حیثیت سے اس کو آئندہ بہت سے ایسے فرائض ادا کرنے ہوں گے جو
آج کل بہ حیثیت گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل انجام دئے جاتے ہیں مثلاً ریاستوں
کے ساتھ آئندہ جو حکومت ہند کے تعلقات کی نوعیت پیدا ہونے والی ہے
وہ یقیناً اس کی مقتضی ہوگی کہ گورنر جنرل بہ حیثیت وائسرائے محض رسمی طور پر
نہیں بلکہ واقعی اور عملی طور پر حکومت کے اعلیٰ حاکم کی حیثیت سے حصہ لے۔

آئندہ دستوری تشکیل میں گورنر جنرل کی مجلس عاملہ مقننہ کے سامنے اسطرح سے ذمہ دار نہیں ہوسکتی جیسے برطانوی کابینہ دارالعوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ مقننہ کا اثر گورنر جنرل کی عاملہ پر برابر بڑھتا جائے گا دراصل انگلستان اور ہندوستان کے حالات اس قدر مختلف ہیں کہ برطانوی سیاسی روایات کو جوں کا توں ہندوستان میں رائج نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ صوبوں میں خود اختیاری کے اصول کا تجربہ نہ ہو جائے۔ ان میں وحدانی (یونی ٹری) طرز کی حکومتیں نہ قایم ہو جائیں اور نظم و نسق کی ایک خاص شکل نہ نکل آئے اس وقت تک مرکزی حکومت میں کسی بنیادی تبدیلی پر بحث نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں کہ مقننہ کی اکثریت کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ عاملہ کو ہر معاملے میں اپنے فیصلے کا پابند بنائے۔ سائمن رپورٹ میں اس کی سفارش کی گئی ہے کہ مرکزی مقننہ میں منتخب شدہ عنصر کی اکثریت اور اس کے موجودہ اختیارات برقرار رکھے جائیں لیکن بجائے بلا واسطہ انتخاب کے بالواسطہ طریق انتخاب رائج کیا جائے تاکہ مرکزی مقننہ صوبوں کی صحیح نمایندگی کرسکے۔

مرکزی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری دفاع کی ہے۔ برطانوی فوجوں کی مدد کے بغیر حکومت ہند ہندوستان کی بیرونی حملہ آوروں سے مدافعت نہیں کرسکے گی۔ برطانوی فوجوں کو امپیریل گورنمنٹ اپنی ذمہ داری پر ہندوستان بھیجتی ہے اس لئے انھیں ہندوستانی مقننہ کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ ان فوجوں کو فوراً ہندوستانی افسروں کے تحت بھی نہیں کیا جاسکتا اس واسطے کہ ابھی ان میں مہارت کی کمی ہے۔ فوج کی افسری کے لئے تجربہ اور خاص روایات درکار ہیں جو رفتہ رفتہ ہی پیدا ہوسکتی ہیں۔ ہندوستان کی افواج کا مقصد ہندوستان کی مدافعت ہے۔ لیکن ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ برطانوی شہنشاہی کے دوسرے حصوں کو ہندوستان کی مدد کرنا پڑے یا ہندوستانی فوجیں برطانوی شہنشاہی کے دوسرے حصے میں جغرافی قربت کے باعث بھیجی جاسکتی ہیں۔ ان وجود کی بنا پر ہندوستان کی فوجوں کو تاج کے نمایندے (وائسرائے) کے براہ راست

تحت ہونا چاہئے۔

صوبوں کی حکومت کے متعلق سائمن کمیشن کی سفارش یہ تھی کہ دوعملی کی وجہ سے نظم ونسق میں جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان کے تجربہ کی بناء پر ان کا خاتمہ کرنا بہتر ہوگا۔ صوبوں کے نظم ونسق میں محفوظ امور اور مفوضہ امور کا کوئی فرق باقی نہیں رکھنا چاہئے۔ اور وحدانی طرز کی حکومت قایم کی جائے۔ وزیروں اور عاملہ کی مشترکہ ذمہ داری کے اصول کو رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تمام محکمے منتخب شدہ وزیروں کے تحت ہوں گے۔ اس ضمن میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے کہ پولیس اور مالگزاری کے محکمے بھی منتخب شدہ وزیروں کے سپرد کرنا مناسب ہوگا کہ بے اس کے وزیروں کی ذمہ داری برائے نام ہوگی۔ نظم ونسق میں اگر سخت خرابی پیدا ہو رہی ہو تو گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کر سکے گا۔ یہ اختیارات گورنر کو حاصل ہونے چاہئیں نہ گورنر بہ اجلاس کونسل کو۔ گورنر کو وضع قوانین اور مالیاتی اختیارات حاصل ہونا ضروری ہے جو خاص حالات کے تحت بذریعہ تصدیق (سرٹی فکیشن) استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

سائمن کمیشن نے حق رائے دہی کی توسیع اور جداگانہ نیابت کے اصول کو تسلیم کیا ہے اس واسطے کہ اقلیتیں اس پر مصر ہیں۔ جب تک اقلیتوں کو اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک اس اصول کو یونہی رہنے دینا چاہئے۔ اس کے سوا رپورٹ میں صوبوں اور مرکز کے تعلقات، حکومت ہند اور ہوم گورنمنٹ کے تعلقات سول سروس، مالیات ہند اور برما کی علحدگی کے متعلق سفارشیں پیش کی گئی ہیں۔

وائسرائے ہند لارڈ اردن نے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء مرکزی ہفتہ میں اس کا اعلان کیا کہ ہندوستانی اور برطانوی نمایندوں کی جلد ایک گول میز کانفرنس کی جائے گی جس میں باہمی مشورے سے ہندوستان کے لئے دستور تجویز کیا جائے گا۔ لارڈ اردن نے اس موقع پر کہا کہ ملک معظم کی حکومت کی جانب سے مجھے اس کی اجازت دی گئی ہے کہ صاف طور سے واضح کردوں کہ ۱۹۱۷ء والے اعلان میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کی فطری انتہا قلمروی مرتبہ کی حکومت ہے۔ اس زمانے میں وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے مکڈانلڈ نے برطانوی

دولت مشترکہ کے مزدوروں کی کانفرنس میں کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ چند مہینوں کے اندر نہ کہ چند سال کے اندر ہماری دولت مشترکہ میں ایک نئی قلمرو کا اضافہ ہونے والا ہے۔ یہ قلمرو ان لوگوں کی ہے جو نسلی اعتبار سے ہم سے جدا ہیں۔ یہ نئی قلمرو ہماری دولت مشترکہ میں مساویانہ حیثیت سے اپنی خودداری کو قایم رکھ سکے گی۔ میری مراد اس نئی قلمرو سے ہندوستان ہے۔"

ان بیانوں سے ہندوستان کے اعتدال پسند مدبروں کو یقین ہوگیا کہ گول میز کانفرنس میں اس پر بحث کی جائے گی کہ ہندوستان کو قلمرو کی مرتبہ کی حکومت دینی چاہیے۔ لارڈ ارون نے گاندھی جی سے بھی ملاقات کی اور انھیں بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ کانگریس اس صورت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی جب کہ پکا وعدہ کیا جائے کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کو قلمرو کی مرتبہ کی حکومت دینے کے متعلق دستور تجویز کیا جائے گا۔ لیکن وائسرائے نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کے جواب میں لاہور کانگریس (۱۹۲۹ء) میں ہندوستان کا سیاسی مقصد مکمل آزادی قرار دیا گیا اور سوراج پارٹی کے ارکان مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے ملک میں سیول نافرمانی کی ابتدا کرنے کی تجویز منظور کی تاکہ حکومت سے اپنے مطالبے منوائے جائیں۔ ملک میں سول نافرمانی کی وجہ سے بدامنی پیدا ہوگئی اور دہشت انگیزی کے بھی مظاہرے ہونے لگے۔ گاندھی جی اور دوسرے سربرآوردہ کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعض مقاموں پر مارشل لا نافذ کیا گیا اور حکومت نے حالات پر پوری طرح قابو پالیا۔

گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی۔ اس وقت انگلستان میں لیبر پارٹی اقتدار پر تھی جس سے ہندوستانیوں کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے اعتدال پسند

لیڈر، مسلمانوں کے نمایندے اور ریاستوں نے شرکت کی والیانِ ریاست میں سے بعض نے متحدہ ہند کے نصب العین کو قبول کر لیا اس شرط سے ان کے اختیارات کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت قایم کرنے کی عام طور پر تائید کی گئی جس میں برطانوی صوبے اور ریاستیں شریک ہوں گی۔ یہ بھی بہ اتفاق تسلیم کیا گیا کہ دفاع اور امور خارجہ کا تعلق گورنر جنرل سے رہے گا۔ تحفظات کے متعلق بہت بحث رہی۔ یہ تحفظات تین قسم کے تھے۔

(۱) وہ جو وفاقی حکومت کے اندرونی استحکام اور بیرونی حفاظت کے لئے ضروری ہوں گے۔

(۲) مالیاتی تحفظات کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ حکومت ہند کے فوجی اخراجات کا اس وقت تک تیقن نہیں ہو سکتا جب تک کہ محصولات لگانے اور صرفِ زر کے متعلق حکومت ہند کو پورے اختیارات حاصل نہ ہوں اور قرضہ لینے کی سہولتیں بہم دست نہ ہوں جن کے لئے وزیر ہند حکومت ہند کی آمدنی کو ضمانت کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔ وہ رقمیں جو برطانوی تعلق کی وجہ سے حکومت ہند کے مالیہ پر گزشتہ زمانے سے واجب الادا ہیں ان کی ادائی کے متعلق کوئی شبہہ نہیں ہونا چاہئے ورنہ ہندوستان کی ساکھ کو بڑا بھاری نقصان ہوگا۔ اس کے علاوہ برطانوی صنعت، انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس کے حقوق کی پوری طرح سے حفاظت ضروری ہے۔

(۳) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ گورنر جنرل اور گورنروں کے ذمہ ہوگا۔ اس ضمن میں گورنر جنرل اور گورنروں کو خاص اختیارات ملنے چاہئیں تاکہ حکومت کی مشین میں کہیں رخنہ نہ پڑے اور ملک میں امن و امان رہے۔

پہلی گول میز کانفرنس میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان سے بعض عام اصول طے ہوئے لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک ہندوستان کی سب سے اہم سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس ان عام اصول کو تسلیم نہ کرے اس وقت تک انھیں عملی جامہ پہنانے میں حکومت ہند کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چنانچہ جب پہلی گول میز کانفرنس سے ہندوستانی نمایندے
واپس ہوئے تو وائسرائے نے گاندھی جی سے جو جیل میں تھے اس سلسلے میں
بات چیت کا خیال ظاہر کیا۔ گاندھی جی کو رہا کردیا گیا اور تقریباً دو ہفتے کی
بات چیت کے بعد اروِن گاندھی سمجھوتہ ہوا جس کا متن حکومت ہند نے
۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو عام اطلاع کے لئے شائع کردیا۔ اس سمجھوتہ میں طے ہوا
کہ سول نافرمانی کی تحریک کو بند کردیا جائے اور تمام سیاسی قیدی چھوڑ دئے
جائیں۔ پہلی گول میز کانفرنس میں جو مسائل طے ہوئے ہیں ان پر مزید غور کیا
جائے گا۔ تاکہ کانگریس کے نمایندے ان کے متعلق اپنی رائے دے سکیں
حکومت ان خصوصی احکام کو واپس لے گی جو سول نافرمانی کے سلسلے میں
نافذ کئے گئے تھے اور سول نافرمانی کی تحریک کے تحت جو مقدمے دائر ہونگے
وہ اٹھا لئے جائیں گے اس شرط سے ان کا تعلق ایسے جرموں سے نہ ہو جن
میں تشدد برتا گیا ہے یا تشدد کی ترغیب دی گئی ہے۔ وہ منقولہ املاک جو
سول نافرمانی کے سلسلہ میں خصوصی احکام یا قانون فوجداری کے تحت ضبط کرلی
گئی ہے واپس کردی جائیں گی۔

غرض کہ اس سمجھوتہ سے کانگریس کے لئے دوسری گول میز کانفرنس
کی شرکت کا راستہ صاف ہوگیا۔ گاندھی جی نے کانفرنس میں کانگریس کے واحد نمایندے
کی حیثیت سے شرکت کی اور وہاں یہ دعویٰ پیش کیا کہ کانگریس تمام ملک کی
نمایندہ جماعت ہے۔ اس دعوے کو اقلیتوں کے نمایندوں نے ماننے سے
انکار کیا۔ گاندھی جی نے اپنی تقریروں میں مکمل آزادی اور قلمروی مرتبہ
کی حکومت کو ہم معنی الفاظ بتایا اور کہا کہ تحفظات کو کانگریس اس صورت
میں قبول کے قابل سمجھے گی جب کہ وہ صراحت کے ساتھ ہندوستان کے
مفاد کے لئے ہوں۔ انھوں نے مرکز اور صوبوں میں مکمل ذمہ دار حکومت
کا مطالبہ پیش کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس میں انتخاب کے طریقے اور نشستوں
کے تعین پر مسلمانوں اور پست اقوام کے نمایندوں نے کانگریس کے نقطۂ نظر
سے اختلاف کیا۔ جب ہندوستانی نمایندے اس بارہ میں کوئی سمجھوتہ

نہ کرسکے تو ان میں سے بعض نے وزیر اعظم سے تحریری درخواست کی کہ وہ اس باب میں تصفیہ کرے جسے سب تسلیم کریں گے۔ اس فرقہ وارانہ تصفیہ میں جداگانہ فرقہ واری نیابت کے اصول کو تسلیم کیا گیا اور پست اقوام کے لئے خاص طور پر الگ نشستیں جداگانہ انتخاب کے اصول کے مطابق مقرر کی گئیں اس تصفیہ کے ساتھ وزیر اعظم نے اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ اگر مختلف فریق آپس میں کوئی سمجھوتہ کریں تو اس تصفیہ میں ترمیم کی جاسکے گی۔ گاندھی جی کو اس بات پر سخت اعتراض ہوا کہ پست اقوام کو جداگانہ حق انتخاب دیکر ہندو جاتی سے انھیں الگ کر لینے کی تجویز کی گئی ہے۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہندو جاتی دو حصوں میں بٹ جائے گی جنھیں پھر آپس میں ملانا ناممکن ہوگا۔ گاندھی جی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ فاقہ کر کے اپنی جان دے دیں گے اگر پست اقوام کے متعلق وزیر اعظم کا تصفیہ نہ بدلا گیا۔ پنڈت مدن موہن مالوی، مسٹر جیکر اور سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے ہندو لیڈروں کے بیچ میں پڑنے سے پست اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر اور گاندھی جی کے درمیان ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک سمجھوتہ ہوگیا جسے میثاق پونا کہتے ہیں جس کی رو سے پست اقوام کو ہندو جاتی سے جدا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی نشستیں محفوظ کر دی گئیں۔ اس سمجھوتہ کے بموجب پست اقوام کی ہر نشست کے لئے پہلے پست اقوام والے اپنے میں سے چار اشخاص منتخب کریں گے۔ پھر ان میں سے ایک شخص ہندوؤں کے عام انتخاب کے حلقے سے منتخب ہوگا جس کو ہندو اور پست اقوام والے دونوں رائے دیں گے۔ اس طرح ظاہر ہے وہی شخص منتخب ہو سکے گا۔ جو ہندوؤں میں بھی مقبول ہوگا۔ وزیر اعظم کے فرقہ واری تصفیہ میں اس سمجھوتے سے جو تبدیلی ہوئی اسے پارلیمنٹ اور حکومت ہند نے مان لیا۔ اس سمجھوتے سے یہ ہوا کہ پست اقوام کے ارکان عام انتخابی حلقہ کی ہر نشست کے لئے اپنے کو پیش کر سکتے تھے اور ان کی نشستیں بھی محفوظ ہوگئیں۔

چوبیسواں باب

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد

تیسری گول میز کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں ہوا۔ اس کانفرنس میں لیبر پارٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے ارکان شریک نہیں ہوئے۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں تینوں گول میز کانفرنسوں کے مشوروں کے مطابق سرکاری طور پر وہائٹ پیپر شائع ہوا اور پارلیمانی مجلس منتخبہ مقرر کی گئی تاکہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ کی پوری چھان بین کر کے اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے۔ پارلیمانی مجلس منتخبہ میں پارلیمنٹ کی سب پارٹیوں کے نمایندے شریک کئے گئے تھے۔ لیکن قدامت پسند عنصر کو زیادہ قوت حاصل تھی۔ اسی مجلس کی سفارشوں کے بعد مسودہ قانون ہند ۱۹۳۵ء مرتب اور پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں اس کی صراحت کر دی گئی کہ ہندوستان میں تاج اور پارلیمنٹ کا اقتدار اعلیٰ مسلم ہوگا۔ دستور جدید کی کسی دفعہ سے یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہند یا اس کے کسی حصے پر پارلیمنٹ

کے اختیار وضع قوانین کے متعلق کوئی اثر پڑے یہ کہ کسی صوبجاتی مقننہ کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ کوئی ایسا قانون وضع کریں جس سے تاج، شاہی خاندان یا بادشاہ کی جانشینی کس طرح بھی متاثر ہوتی ہو۔ اس قانون میں کل ہندی وفاق (فیڈریشن) کی تشکیل جو پیش کی گئی ہے اس کی بدولت حکومت ہند کو نئی قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اب تک حکومت ہند ایک وحدانی (یونی ٹری) حکومت تھی اور صوبجاتی حکومتوں کو جو اختیارات حاصل تھے وہ ماخوذ تھے نہ کہ اصلی۔ صوبوں کو مفوضہ امور کے متعلق جو اختیارات حاصل تھے وہ محدود نوعیت رکھتے تھے۔ اس نئے دستور کی رو سے صوبوں کی حکومتیں اپنے اختیارات بجائے مرکزی حکومت ہند کے تاج اور پارلیمنٹ سے حاصل کریں گی اور جس طرح ان کے اختیارات کی حد بندی ہوگی اسی طرح مرکزی حکومت ہند کے اختیارات کی حد بندی کی جائے گی۔ قانون دستور کے بموجب صوبوں کو وفاق میں شریک ہونا پڑے گا اور وہ دیسی ریاستیں جو چاہیں اپنی مرضی سے وفاق میں مشترک اغراض اور مفاد کے لئے شرکت کریں۔

وفاق کے تین اجزا ہوں گے (۱) گورنروں والے صوبے (۲) چیف کمشنروں والے علاقے اور (۳) ریاستیں۔ ان تینوں اجزاء کے ساتھ وفاقی حکومت کے تعلق کی نوعیت مختلف ہوگی۔ گورنروں والے صوبوں کے لئے وفاقی حکومت کے اختیارات محدود ہوں گے لیکن چیف کمشنروں والے علاقوں کے لئے وفاقی حکومت کے اختیارات کی وسعت زیادہ ہوگی۔ صوبوں اور چیف کمشنریوں کے لئے وفاق میں شرکت لازمی ہوگی۔ وفاقی حکومت کو دیسی ریاستوں کے انتظام میں بعض امور پر جو اختیار حاصل ہوگا اس سے وہ تعلقات مطلق متاثر نہ ہونگے جو دیسی ریاستوں اور تاج کے درمیان اگلے زمانہ سے چلے آتے ہیں۔ اگر کوئی ریاست وفاق میں شریک نہیں ہوگی تو بھی اس کے وہ حقوق اور ذمہ داریاں غیر متاثر رہیں گی جو تاج اور کسی ریاست کے درمیان پہلے سے موجود ہیں۔ ریاستوں کو اختیار ہوگا کہ وفاق میں شریک ہوں یا نہوں۔ ان کے ساتھ وفاقی حکومت کے

تعلق کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہوگی جو صوبوں کے ساتھ ہے اس لئے کہ ان کے اختیارات اصلی ہیں نہ کہ ماخوذ۔ وفاقی حکومت صرف ان امور سے متعلق ان کے معاملوں میں دخل دے سکے گی جن کی صراحت شرکت کی دستاویز میں کردی گئی ہوگی۔

گورنر جنرل ہندوستان میں تاج برطانیہ کا نمایندہ ہوگا۔ وفاقی حکومت کا عاملانہ اقتدار اس کی ذات کے لئے خاص ہوگا۔ اس کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کی صراحت قانون دستور میں موجود ہے اور ان کے علاوہ اس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہوں گے جو براہ راست تاج سے اس کو سپرد کئے جائیں۔ بادشاہ کے دستخط سے اس کو ایک ہدایت نامہ دیا جائے گا جس میں ان اختیارات کی نوعیت، ان کے استعمال اور اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کے متعلق توضیح ہوگی۔ والسرائے کی حیثیت سے اس کو ان ریاستوں پر جو وفاق میں شریک نہیں ہوئی ہیں بالادستی کے اختیارات حاصل ہوں گے۔ وفاق میں شرکت کرنے والی ریاستوں کے ان انتظامی امور میں جو دستاویز شرکت کے ذریعہ وفاقی حکومت سے متعلق نہیں کئے گئے ہیں وائسرائے بالادست قوت کے نمایندے کی حیثیت سے اسی طرح مداخلت کرسکے گا جس طرح کہ وہ اگلے زمانے سے کرتا رہا ہے۔ چونکہ بالادستی کے اختیارات کا پورا مدار ان روایتوں پر مبنی ہے جو دیسی ریاستوں اور حکومت ہند کے درمیان اگلے زمانہ میں پیدا ہوئیں اس لئے ان کی وضاحت قانون دستور کی حدود سے باہر رہے گی۔

گورنر جنرل اپنے فرائض اپنی عاملہ (ایکزیکیوٹو کونسل) کے مشورہ سے انجام دے گا لیکن بعض خاص ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لئے وہ اپنی مجلس عاملہ کی رائے کے خلاف اپنی صوابدید پر عمل کرسکے گا۔ جب وہ ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو وہ وزیر ہند سے مشورہ کرے گا یا اگر وہ خیال کرے کہ وہ شاہی "ہدایت نامہ" کے مطابق عمل کر رہا ہے تو اسے وزیر ہند سے مشورہ کرنے کی حاجت نہ ہوگی۔ اس شاہی "ہدایت نامہ" میں گورنر جنرل

کی خاص ذمہ داریوں کے ابواب جن کی بابت وہ تمامتر اپنی صوابدید پر عمل کرنے کا مجاز ہوگا مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستان کے کسی حصے میں امن عامہ کا قیام
(۲) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ
(۳) وفاقی حکومت کی مالیات کا استحکام اور اس کی ساکھ کا تحفظ
(۴) پبلک سروس (سول سروس، پولیس سروس وغیرہ) کے افراد اور ان کے وارثوں کے حقوق کا تحفظ جو قانون دستور کی رو سے محفوظ کئے گئے ہیں اور ان کے جایز مفاد کی نگرانی۔
(۵) ان کارروائیوں کی روک تھام جن سے برطانوی مال کی درآمد کے خلاف امتیازات یا تعزیر مقصود ہو۔
(۶) دیسی ریاستوں کے حقوق اور والیان ریاست کے اعزاز اور مراتب کا تحفظ۔

وفاقی حکومت کے وہ محکمے جن کے متعلق گورنر جنرل اپنی صوابدید سے فیصلہ کرے گا اور جن کی ذمہ داری اسپر عاید ہو گی مندرجہ ذیل ہیں۔

دفاع، امور خارجہ، مالیات، امور کلیسا اور قبائلی مسائل۔

ان کو مرکزی حکومت کے محفوظ امور سمجھنا چاہئے جن کے متعلق گورنر جنرل خود اپنے مشیر مقرر کرے گا جن کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہو گی اور وہ گورنر جنرل کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہو گا کہ ان محکموں کے اخراجات جن کی ذمہ داری قانون دستور نے اس پر عاید کی ہے خود منظور کرے۔ وہ اس باب میں مقننہ کا دست نگر نہ ہو گا۔ ان محکموں کے متعلق مقننہ میں بحث اور تنقید ہو سکے گی لیکن گورنر جنرل پر مقننہ کی رائے کی پابندی عاید نہ ہو گی۔

گورنر جنرل اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے خصوصی احکام جاری کرنے کا مجاز ہو گا۔ یہ خصوصی احکام مقننہ کا جلسہ ہونے کے چھ ہفتے بعد تک نافذ رہیں گے اور اگر اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے مقننہ کے دونوں ایوانوں نے مل کر ان کے خلاف قرارداد منظور کر لی تو ان خصوصی احکام کو منسوخ

کرنا ہو گا۔ گورنر جنرل کے خصوصی احکام جب تک نافذ رہیں گے اس وقت تک وہ وہی حکم رکھیں گے جو مقننہ کے منظور کئے ہوئے قوانین کو حاصل ہے۔ یہ خصوصی احکام نہ تو قوانین پارلیمنٹ اور نہ ہائیکورٹوں کے اختیارات کے منافی ہونے چاہئیں۔ گورنر جنرل جب چاہے ان احکام کو واپس لے سکتا ہے اور تاج کو اختیار ہے کہ ان کے نفاذ کو روک دے۔ گورنر جنرل اپنی خاص ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے بھی خصوصی احکام جاری کر سکتا ہے جو ۶ ماہ تک نافذ رہیں گے اور اگر وہ ضرورت سمجھے تو ۶ ماہ کے لئے ان کی مزید توسیع عمل میں آئے گی۔ اگر ۶ ماہ کے بعد پھر ان کی توسیع کی ضرورت ہو تو ان کی منظوری پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے حاصل کی جائے گی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے اور وفاقی حکومت کے ان محکموں سے ان کا اس قدر گہرا تعلق ہے جو دستور کی رو سے محفوظ نہیں ہیں کہ وہ اپنے صوابدید کے موافق مقننہ کی رائے کو جب چاہے نظر انداز کر سکتا ہے۔

گورنر جنرل اس کا بھی مجاز ہو گا کہ خاص حالات میں اپنی ذمہ داری پر قوانین وضع کرے اور ان کی بابت مقننہ کو پیغام سے مطلع کرے۔ اس قسم کا قانون پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری کے لئے پیش کرنا لازمی ہو گا۔ گورنر جنرل کے بنائے ہوئے قوانین وہی حکم رکھیں گے جو وفاقی مقننہ کے منظور کئے ہوئے قوانین۔ اگر دستور کی مشین ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو گورنر جنرل بذریعہ اعلان وفاقی حکومت کے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لے گا سوائے وفاقی عدالت کے اختیارات کے۔ اس اعلان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظوری لینا ضروری ہو گا۔ اعلان کے ذریعہ گورنر جنرل تین سال تک حکومت ہند کو چلا سکتا ہے جس کے بعد پارلیمنٹ

---

[1] قانون دستور ۱۹۳۵ء کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کیتھ کی کتاب A Constitutional History of India. (از ص ۲۷۴ تا ۳۰۳)

نئے انتظامات عمل میں لائے گی۔

گورنر جنرل وفاقی مقننہ کے ارکان میں سے زیادہ سے زیادہ دس وزیر نامزد کرے گا جنکے ذمہ وہ وفاقی حکومت کے مختلف محکمے کرے گا۔ وزیر گورنر جنرل کو مشورہ اور امداد دینگے وہ اسوقت تک اپنے عہدوں پر رہیں گے جب تک کہ گورنر جنرل کی مرضی ہوگی۔ وزیران امور سے متعلق گورنر جنرل کو مشورہ دینے کے مجاز نہ ہوں گے جن کی نسبت گورنر جنرل کو قانون دستور کی رو سے اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دستور میں گورنر جنرل اور اس کے وزیروں کے اختیارات کا جو تعین کیا گیا ہے اس کے بموجب مرکزی وفاقی حکومت میں اس طرح کی دو عملی وجود میں آئے گی جیسی کہ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی رو سے صوبوں کے انتظام میں ظاہر ہوئی تھی۔ گورنر جنرل ان امور محفوظہ کے متعلق اپنے مشیر خود مقرر کرے گا جو اس کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور جو مجلس وزراء کے رکن نہیں ہوں گے۔ لیکن وزیر اور مشیر جب چاہیں آپس میں مشورہ کر سکیں گے۔ مشیر اس وقت بھی اپنی خدمتوں پر رہیں گے جب کہ وزیر مستعفی ہو جائیں گے۔ وفاقی حکومت کے میزانیہ کی سب سے بڑی مد اخراجات (یعنی دفاع کی مد) وزیروں کے اختیار سے باہر ہوگی جس کے باعث ان کے اختیارات محدود اور غیر حقیقی ہو جائینگے۔

وفاقی مقننہ

وفاقی مقننہ تین اجزاء پر مشتمل ہوگی (۱) تاج جس کی نیابت گورنر جنرل کرے گا (۲) کونسل آف اسٹیٹ اور (۳) فیڈرل اسمبلی۔

گورنر جنرل اپنی صوابدید پر وقتاً فوقتاً کونسل آف اسٹیٹ اور فیڈرل اسمبلی کے جلسے منعقد کرنے کا اعلان کرے گا۔ وہ ان جلسوں کو بڑی مدت کے لئے ملتوی یا برخاست کرنے کا مجاز ہوگا۔ وزیر گورنر جنرل کے مشیر اور وکیل سرکاری دونوں ایوانوں میں تقریر کر سکیں گے۔ لیکن انھیں رائے دینے کا حق صرف اس ایوان میں حاصل ہوگا جس میں وہ نامزد ہوئے ہوں یا رکن ہوں۔ ہر ایوان اپنا صدر آپ منتخب کرے گا۔

کونسل آف اسٹیٹ ۱۵۶ برطانوی ہند کے نمایندوں اور ۱۰۴ دیسی ریاستوں

کے نمایندوں پر مشتمل ہوگی۔ وہ ایک مستقل جماعت ہوگی جس کے ارکان کی ۱/۳ تعداد ہر تیسرے سال منتخب ہوا کرے گی۔ فیڈرل اسمبلی ۲۵۰ برطانوی ہند کے اور ۱۲۵ ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوگی۔ صوبوں کی مقننہ فرقہ داری جداگانہ اصول کے مطابق نمایندے منتخب کرکے فیڈرل اسمبلی کے لئے بھیجے گی ہر فرقہ کے لوگ جنھیں دستور میں جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا ہے فیڈرل اسمبلی کے لئے اپنے نمایندے علحدہ منتخب کریں گے۔ ریاستوں کی آبادی کے تناسب سے ان کے نمایندوں کی تعداد فیڈرل اسمبلی کے لئے مقرر ہوگی۔ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے جو بلاواسطہ طریق انتخاب رائج کیا گیا تھا اس کو نظرانداز کرکے جدید دستور میں بالواسطہ طریقہ کو ترجیح دی گئی۔ یہ اس مصلحت سے کیا گیا کہ جدید انتخاب کے حلقے دستور کے بموجب اس قدر وسیع ہو جائیں گے کہ کسی امیدوار کے لئے سب رائے دینے والوں سے براہ راست تعلق قایم کرنا ناممکن ہوگا۔ لیکن عام طور پر دوسرے ملکوں کے جمہوری دستوروں میں اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی ایوان زیرین کے نمایندوں کو عام باشندے براہ راست منتخب کرتے ہیں اور ایوان بالا کے انتخاب میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایوان زیرین میں اگر بلاواسطہ نیابت ہو تو مرکزی حکومت کا عام شہریوں سے براہ راست تعلق قایم ہو جاتا ہے۔

ہر ایوان اپنے جلسوں کے لئے قاعدے بنا سکتا ہے۔ لیکن گورنر جنرل ایوان بالا کے صدر اور ایوان زیرین کے اسپیکر کے مشورے سے ایسے قاعدے اور ضابطے بنائے گا جو ان کارروائیوں پر حاوی ہوں گے جن کے متعلق اس کو خصوصی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے اور جنکا پورا انحصار اسکی صوابدید پر ہے اگر گورنر جنرل خیال کرے کہ مقننہ میں کسی خاص مسودہ قانون کے پیش ہونے سے اس کی کوئی خصوصی ذمہ داری متاثر ہوتی ہے تو وہ اپنے اختیار تمیزی سے اس کو پیش ہونے سے روک سکتا ہے۔ اگر کوئی مسودہ قانون ایک ایوان میں منظور ہو گیا ہو اور دوسرے ایوان میں رد کر دیا جائے یا دونوں ایوانوں میں اس کی ترمیموں کے متعلق اختلاف ہو تو گورنر جنرل دونوں ایوانوں کا مشترکہ جلسہ منعقد کرائے گا

اور کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے گا۔

دونوں ایوانوں کے ارکان کو ملکی نظم ونسق کے جملہ مسائل کے متعلق سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق حاصل ہوگا وہ اس بات کے مجاز ہوں گے کہ حکومت کی حکمت عملی پر بحث اور نکتہ چینی کریں۔ ان کی نکتہ چینی قانونی گرفت سے باہر تصور کی جائے گی۔ ارکان اس کے بھی مجاز ہوں گے کہ کسی اہم مسئلہ کے متعلق عاملہ کی توجہ کی غرض سے مقننہ کے اجلاس کو ملتوی کرانے کی تجویز پیش کریں۔ سالانہ میزانیہ گورنر جنرل کی جانب سے پہلے فیڈرل اسمبلی میں اور پھر کونسل آف اسٹیٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تمام مالی مطالبے گورنر جنرل کی سفارش کے بعد مقننہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میزانیہ کی بعض مدیں "وفاقی مصارف" پر مشتمل ہوں گی جن کی نسبت فیڈرل اسمبلی میں بحث ہو سکے گی لیکن ان کی منظوری کی ضرورت نہ ہوگی۔ میزانیہ کا تقریباً ۸۰ فیصد حصہ ایسے اجزاء پر مشتمل ہوگا جن کے لئے مقننہ کی منظوری کی حاجت نہ ہوگی۔ باقی مطالبے برائے منظوری صرف ۲۰ فیصدی رہ جاتے ہیں جن پر مقننہ کو اختیار رہے گا۔ مقننہ کو کسی مسودہ قانون کے ذریعہ محصول لگانے یا اس میں اضافہ کرنے، قرض لینے یا اس کی ضمانت دینے کا جس سے وفاق کی مالی ذمہ داری متاثر ہوتی ہو یا وفاقی آمدنی میں سے مصارف تجویز کرنے کا اختیار نہ ہوگا بلکہ ان کا انحصار گورنر جنرل کی سفارش پر ہوگا۔ بغیر اس کی سفارش کے کوئی ایسی تجویز جس کا مالیات سے تعلق ہو مقننہ میں منظور نہ ہو سکے گی۔

وفاقی عدالت مرکزی وفاقی حکومت کی ایک وفاقی عدالت بھی ہوگی جو چھ ججوں پر مشتمل ہوگی اس کے حدود سماعت تین نوعیت کے ہوں گے۔ (۱) ابتدائی اور جنرل (۲) مرافعہ (اپیل) اور مشورتی (اڈوائزری) ابتدائی جانب وفاقی عدالت کے حدود سماعت ان مقدموں پر حاوی ہونگے جو حکومت وفاقی صوبوں اور ان ریاستوں کے درمیان جو وفاق میں شریک ہیں اپنے حقوق کے تعین کے متعلق پیدا ہوں۔ اگر کسی ریاست کے متعلق وفاقی عدالت کو فیصلہ کرنا ہے تو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈر ان کونسل یا وفاقی

حکومت کی عاملہ یا مقننہ کے اختیارات کی حدیں معین کرتا ہوں گی جو دستاویز شرکت کی بدولت کسی ریاست کے متعلق مقرر رہوں کسی وفاقی قانون کے کسی ریاست میں نافذ کرنے کے متعلق یا کسی ایسے امر کے متعلق وفاقی عدالت توجیہ پیش کرنے کی مجاز ہوگی جس کی نسبت وفاقی مقننہ وضع قانون کا اختیار رکھتی ہے۔ وفاقی عدالت کسی ایسے مسئلہ پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز ہوگی جو حکومت ہند اور کسی ریاست کے درمیان ایسے معاہدہ سے پیدا ہوا ہو جو وفاق کے قیام کے بعد عمل میں آیا ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس معاہدہ میں اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ وفاقی عدالت کے حدود سماعت اس مسئلہ کے متعلق حاوی ہوں گے۔ لیکن اگر معاہدہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ فلاں فلاں مسائل وفاقی عدالت کی سماعت کے دائرے سے باہر ہیں تو وہ وفاقی عدالت کے سامنے پیش نہ ہوں گے۔

وفاقی عدالت میں برطانوی ہند کے ہائیکورٹوں سے مرافعے کیئے جائینگے۔ ہائیکورٹ کی ڈگری یا فیصلے کا مرافعہ اس وقت ممکن ہوگا جب کہ متعلقہ ہائیکورٹ اس امر کی توثیق کرے کہ زیر بحث مقدمہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈر ان کونسل کی توجیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کے مقدموں کا مرافعہ پریوی کونسل میں نہ ہوگا۔ لیکن مقدمہ اس نوعیت کا ہونا چاہیئے جس سے مفاد عامہ وابستہ ہو یا ذاتی معاملہ کی حیثیت سے اس میں ایسے پہلو نکلتے ہوں جو مفاد عامہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے سول مقدمے بھی وفاقی عدالت میں پیش ہوسکیں گے جو وفاقی مقننہ کے کسی منظورہ قانون کے بموجب وفاقی عدالت کی سماعت کے دائرے میں آجائیں۔ وفاقی مقننہ اپنے قانون کے ذریعہ یہ قاعدہ مقرر کرسکتی ہے کہ آئندہ سے سول مقدموں کا مرافعہ بجائے پریوی کونسل کے وفاقی عدالت میں ہوگا۔ اگر ایسی تجویز وفاقی مقننہ میں پیش کی جائے گی تو اسکے پہلے گورنر جنرل سے اس کی نسبت منظوری لینا لازمی ہوگا۔

دستور کی روسے وفاقی عدالت کو مشاورتی حیثیت بھی حاصل ہے۔ گورنر جنرل اپنی صوابدید پر کسی قانونی مسئلہ کو جو مفاد عامہ سے تعلق رکھتا ہو وفاقی عدالت

کو تحقیق کرنے کے لئے سپرد کر سکتا ہے جو اس کے متعلق اپنی رپورٹ اپنی رائے کے ساتھ پیش کرے گی۔

وفاقی عدالت کو اختیار ہوگا کہ اپنی کارروائیوں کے متعلق قاعدے اور ضابطے بنائے جن کی منظوری گورنر جنرل سے لینا ہوگی۔ وفاقی عدالت کے مصارف کا بار وفاقی حکومت کے مالیہ پر ہوگا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈر ان کونسل کی توجیہ کے متعلق وفاقی عدالت یا پریوی کونسل کے فیصلے قطعی ہوں گے جن کا برطانوی ہند اور ان ریاستوں میں جو وفاق میں شریک ہیں نفاذ ہوگا۔

صوبوں کی حکومتیں

قانون حکومت ہند ۳۵ء کی رو سے وفاقی حکومت کی طرح صوبوں کی حکومت کے جملہ اختیارات ملک معظم کی ذات میں مرکوز ہوں گے۔ وہ گورنر کو اپنے خاص دستخط سے اپنا نائب مقرر کرے گا۔ گورنر کے ذمہ گورنر جنرل کی طرح محفوظ امور کا انتظام نہ ہوگا۔ اس پر اپنے صوبے کے مالی استحکام اور ساکھ قایم کرنے کی ذمہ داری بھی نہیں ہوگی جس طرح گورنر جنرل پر وفاقی حکومت کے متعلق ہے۔ گورنر جنرل وفاقی مالیات کے تحفظ کے ضمن میں گورنر سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں خاص حکمت عملی اختیار کرے۔ گورنر وزیروں کو اپنی مرضی سے مقرر کرے گا اور انھیں برطرف کرنے کا مجاز ہوگا۔

صوبوں کا نظم ونسق تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے (۱) وہ امور جن کے انجام دینے میں گورنر اپنے وزیروں کے مشورہ کا پابند ہوگا (۲) وہ امور جن میں وہ اپنے وزیروں سے مشورہ لے گا لیکن اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے گا (۳) وہ امور جن میں وہ اپنے اختیار تمیزی سے کرے گا اور ان کے متعلق وزیروں سے مشورہ نہیں کرے گا۔ اس امر کا تعین گورنر کرے گا کہ کوئی خاص مسئلہ ان مذکورہ بالا تینوں شقوں میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نسبت اس کی رائے قطعی ہوگی اور اس پر مزید بحث اور تنقید نہ ہو سکے گی۔ ان امور کے متعلق جن میں گورنر اپنے اختیار تمیزی سے کام کرے گا اس کے لئے لازمی ہوگا کہ پہلے گورنر جنرل سے دریافت کرلے اور اس کی

ہدایت کے مطابق عمل کرے۔

صوبے کے عام نظم ونسق میں گورنر اپنے وزیروں کے مشورے کا پابند ہوگا لیکن جن مسائل میں گورنر کو خصوصی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے ان کے متعلق وہ تنہا اپنی مرضی اور رائے سے عمل کرے گا۔ ان میں اقلیتوں کے حقوق، سرکاری ملازموں اور ان کے وارثوں کے حقوق اور برطانوی تجارت کا تحفظ شامل ہیں۔ سی۔ پی اور برار کے گورنر کا فرض ہوگا کہ وہ اس امر کا خیال رکھے کہ اس کے صوبے کی آمدنی کا معقول حصہ برار پر خرچ کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس کا فرض ہوگا کہ ریاست حیدرآباد کے تجارتی اور معاشی مفاد کو بھی اپنے پیش نظر رکھے۔ صوبۂ سرحدی کا گورنر جب قبائلی معاملوں کے انجام دینے میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے گا تو اس کا فرض ہوگا کہ اس کا لحاظ رکھے کہ اس کا کوئی فعل ایسا نہ ہو جو اس ذمہ داری میں خلل پیدا کرے جو گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس پر عاید ہوتی ہے۔ گورنر کا فرض ہوگا کہ وہ صوبے کی آبادی کے مختلف فرقوں اور طبقوں میں اس کی ہمت افزائی کرے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق صوبے کی حکومت میں شریک ہوں اور اقلیتوں کی تعداد کا تناسب ملازمتوں میں قایم رہے۔ اگر صوبے میں نقص امن کا اندیشہ ہو یا کوئی سیاسی جماعت حکومت کو درہم برہم کرنے کے درپے ہو تو ایسی حالت میں گورنر امن عامہ کے قایم کرنے کے جملہ فرائض اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور اپنے اختیار تمیزی سے کام کر سکتا ہے۔ گورنر اپنے اختیار تمیزی سے ایسے قاعدے اور ضابطے بنا سکتا ہے جن کا منشاء یہ ہو کہ سیاسی جرموں کے متعلق خفیہ طور پر جو حکومت کو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ بغیر انسپکٹر جنرل پولیس یا پولیس کمشنر کی اجازت کے کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے پائیں۔ خفیہ کے محکمے کا تعلق وفاقی محکمہ خبر رسانی سے ہوگا اور وہ وزارت کے اختیار کے باہر ہوگا۔

گورنر جنرل کی طرح گورنر صوبے میں خصوصی احکام نافذ کرنے کا مجاز ہوگا۔ خصوصی احکام چھ ماہ کی مدت کے لئے ہوں گے لیکن ان کی توسیع مزید چھ ماہ

کے لئے ہو سکے گی۔ وہ اپنی خصوصی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے قانون بنا سکے گا جو گورنری قانون کہلائیں گے۔ لیکن اس کے نافذ کرنے کے لئے گورنر جنرل کی اجازت درکار ہوگی۔ اس کو مقننہ کے منعقد ملتوی اور برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ دستور کے تعطل کی حالت میں گورنر اعلان کے ذریعہ سے نظم ونسق کے تمام عاملانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔

صوبوں کی وزارت

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی دفعہ (۵۰) کے بموجب ہر صوبے میں ایک مجلس وزرا ہوگی جس کا فرض ہوگا کہ وہ گورنر کو مشورہ دیا کرے اور اس کے کاموں میں امداد دے سوائے ان امور کے جن میں گورنر اپنے اختیار تمیزی سے کام کرے گا۔ وزیروں کو گورنر مقرر کرے گا اور وہ اس وقت تک مجلس وزرا کی رکنیت پر رہیں گے جب تک کہ گورنر کی مرضی ہوگی۔ مجلس وزرا کی رکنیت حاصل کرتے وقت وہ اس بات کا حلف لیں گے کہ وہ کوئی سرکاری راز فاش نہیں کریں گے۔ وزیروں کی سفارش پر پارلیمانی معتمدین مقرر کئے جائیں گے جو ان کے فرائض کے ادا کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ اگرچہ قانون دستور میں اس امر کی صراحت موجود نہیں ہے کہ گورنر کس جماعت میں سے اپنے وزیر مقرر کرے گا لیکن "شاہی ہدایت نامہ" (انسٹرومنٹ آف انسٹرکشنز) میں اس کی توضیح کی گئی ہے کہ وہ اس سیاسی جماعت میں سے اپنے وزیر مقرر کرے گا جو مقننہ میں اکثریت رکھتی ہو۔ گورنر کا فرض ہوگا کہ وزارت میں اقلیتوں کی نمایندگی کا انتظام کرے۔ اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ آیا وزیر مشترک ذمہ داری کے اصول پر مشورہ دیں گے یا گورنر وزیروں سے علحدہ علحدہ مشورہ طلب کر سکے گا۔ وزیروں کو حق ہوگا کہ جب چاہیں مقننہ کو خطاب کریں۔ اگر وزیروں کو گورنر کی حکمت عملی سے اصولی اختلاف ہو تو ایسی صورت میں گورنر ان کا استعفا طلب کر سکتا ہے یا اگر وہ چاہے تو انھیں برطرف کر سکتا ہے۔ مقننہ کے برخاست کرنے اور جدید انتخاب کا حق جیسا کہ قلمروی وزیروں کو حاصل ہے ہندوستانی صوبوں کے وزیروں کو نہیں ہوگا بلکہ گورنروں کو حاصل ہوگا جو اپنے اختیار

سے اس حق کو استعمال کرسکیں گے۔
بے شبہہ صوبوں کے وزیروں کو جدید دستور کی رو سے بہ نسبت سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کے زیادہ انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے۔ جدید دستور کے بموجب دوعملی کا خاتمہ کردیا گیا اور چند اہم امور کے علاوہ صوبہ کا پورا نظم ونسق منتخب شدہ وزیروں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ صوبوں کی وزارت میزانیہ تیار کرے گی۔ اور اپنے اختیار کے اندر اس میں اپنی حکمت عملی کے مطابق رد وبدل کرسکے گی۔ پولیس کا محکمہ بھی عملی طور پر متعلقہ وزیر کے تحت آجائیگا محکمہ خفیہ کے سوا جسکا تعلق انسپکٹر جنرل آف پولیس کے توسط سے گورنر اور مرکزی محکمہ خفیہ سے قایم رہیگا۔ اگر وزارت نے ان مصارف کو اپنے میزانیہ میں نہیں داخل کیا جنکا تعلق گورنر کی خصوصی ذمہ داری سے ہے تو گورنر اپنے حکم سے ان مصارف کو میزانیہ میں داخل کرسکیگا۔ لیکن باوجود گورنر کے آخری اختیارات کے جو مالیات اور وضع قانون کے متعلق اسے حاصل ہیں وزیر اپنے اثر سے صوبوں کے نظم ونسق میں بہت کچھ تبدیلیاں کرسکیں گے۔

صوبوں کی مقننہ

دستور جدید کے بموجب ہر صوبے میں ایک لیجسلیٹو اسمبلی ہوگی لیکن چھ صوبوں (بمبئی، بنگال، مدراس، صوبجات متحدہ بہار اور آسام) میں اس کے ماسوا لیجسلیٹو کونسلیں بھی ہوں گی۔ لیجسلیٹو اسمبلی کی میعاد پانچ سال ہوگی۔ اس مدت کے بعد وہ برخاست کردی جائے گی اور نئے انتخابات عمل میں آئیں گے۔ صوبوں کی لیجسلیٹو کونسلیں مستقل حیثیت رکھیں گی۔ ہر تیسرے سال انکے ارکان کی ⅓ تعداد مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق علحدہ ہوجائیگی اور نئے ارکان ان کی جگہ منتخب ہونگے۔ لیجسلیٹو اسمبلی کیلئے رائے دہی کا حق پہلے کے مقابلہ میں وسیع کردیا گیا ہے۔ ہر صوبے کے حق رائے دہی کے قاعدے مختلف ہوں گے۔

صوبوں کی مقننہ ایسے قوانین وضع کرنے کی مجاز نہ ہوگی جن سے بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانیہ کی تجارت اور صنعتی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے علاوہ گورنر کی تنخواہ اور قرض کے مطالبے جو صوبہ کی آمدنی میں سے واجب الادا ہوں اس کے اختیار سے باہر ہوں گے۔

صوبہ کی حکومت کی ضرورتوں کی پابجائی کے لئے مقننہ کو صوبہ کی آمدنی

کی ضمانت پر ہندوستان میں قرض لینے کا اختیار ہوگا۔ بغیر وفاقی حکومت کی اجازت اور منظوری کے کوئی صوبجاتی حکومت ہندوستان کے باہر قرض نہیں لے سکے گی۔ عملی طور پر صوبوں کی حکومتیں وفاقی حکومت ہی سے قرض لیں گی جس کی منظوری گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن وفاقی حکومت کے علاوہ وہ بازار میں بھی چاہیں تو قرض لے سکیں گی۔

صوبجاتی اور مرکزی وفاقی امور کے علاوہ بعض امور ایسے بھی ہیں جنکے متعلق وفاقی اور صوبجاتی دونوں حکومتیں وضع قوانین کی مجاز ہوں گی۔ صوبہ کی حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے صوبے کی حد تک وفاقی قوانین میں تبدیل کر سکیں اس شرط سے کہ ان کے متعلق گورنر جنرل سے دریافت کر لیا گیا ہو۔ دستور میں گورنر جنرل پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے کہ اگر وفاقی حکومت کسی ایسے امر کے متعلق وضع قانون کرے جو صوبجاتی فہرست امور میں شامل ہے تو وہ صوبجاتی حکومت سے اس کی بابت مشورہ کرے۔

وزیر ہند اور ہائی کمشنر

وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کے اختیارات دستوری اعتبار سے برطانوی کابینہ کے تحت ہوں گے۔ گورنر جنرل کا تقرر وزیر اعظم کرے گا۔ دوسرے اعلیٰ عہدوں کے تقررات کے متعلق وزیر ہند وزیر اعظم سے مشورہ کرے گا۔ وزیر ہند کی مجلس کے ارکان کم سے کم ۳ اور زیادہ سے زیادہ ۶ ہوں گے۔ ان میں سے نصف ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں کم سے کم دس سال تک تاج کی خدمت پر مامور رہ چکے ہوں اور انھیں سرکاری خدمت سے علحدہ ہوئے دو سال سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔ ارکان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔ ایک مرتبہ رکنیت پر مقرر ہونے کے بعد دوبارہ اس خدمت پر تقرر نہ ہو سکے گا۔ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ اپنی مجلس کے ارکان سے مجموعی یا انفرادی طور پر مشورہ کرے یا اگر وہ چاہے تو مشورہ نہ کرے۔ اس کو ان کے مشورہ پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا بھی اختیار ہوگا وزیر ہند کا عملہ برٹش سول سروس سے تعلق رکھے گا اور اس کی تنخواہوں وغیرہ کے مصارف کا بار کچھ برطانوی خزانہ پر کچھ حکومت ہند کے خزانہ پر پڑے گا۔

انڈیا آفس پورے طور پر برطانوی حکومت کے تحت سمجھا جائے گا۔ ذیل کی خدمتوں پر وزیر ہند کی جانب سے تقرر عمل میں آئیں گے۔
انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس، انڈین پولیس سروس، کلیسائی عہدہ دار۔ وزیر ہند امپیریل سروس کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائے گا جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری کے بعد نافذ ہوں گے۔ ان خدمتوں میں اگر کوئی خدمت خالی ہو تو بغیر وزیر ہند کی منظوری کے تین ماہ سے زیادہ خالی نہیں رہ سکتی اور نہ اس پر کوئی تقرر ہو سکتا ہے جب تک کہ وزیر ہند کی جانب سے نہ ہو اور نہ کوئی دوسرا شخص جو کسی دوسری خدمت پر مامور ہو اس خدمت کے فرائض ادا کرنے کے لئے مقرر کیا جا سکتا ہے۔
اب تک ہائی کمشنر کا زیادہ تر غیر سیاسی معاملوں سے تعلق تھا اس لئے کہ سیاسی مسائل انڈیا آفس سے متعلق تھے۔ لیکن بین الاقوامی نوعیت کے اجتماعوں میں ہائی کمشنر حکومت ہند کی نمایندگی کرتا رہا ہے اور ۱۹۳۲ء کی اٹاوہ کانفرنس میں اس نے ہندوستانی وفد کی قیادت کے فرائض ادا کئے تھے۔ جدید دستور کی رو سے حکومت ہند کے بعض تجارتی معاہدوں کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے ہائی کمشنر کا تقرر کرے گا اور اس کی تنخواہ اور خدمت کی دوسری شرطوں کا تعین کرے گا۔ ہائی کمشنر حکومت وفاق کی جانب سے گورنر جنرل کی ہدایتوں کے مطابق انگلستان میں ہندوستانی تجارتی مفاد کی دیکھ بھال کریگا۔ وفاقی حکومت کے سوا، ہائی کمشنر صوبوں کی حکومتوں اور ریاستوں کی حکومتوں کے لئے بھی گورنر جنرل کی اجازت سے وہ تمام فرائض ادا کر سکے گا جو وہ وفاقی حکومت کے متعلق انجام دیتا ہے۔

پبلک سروس ہز مجسٹی بہ اجلاس کونسل کو اختیار ہو گا کہ وفاعی محکمہ کے تقررات کرے۔ وزیر ہند اپنی مجلس کے ارکان کے مشورے سے فوجی محکمہ کے اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائے گا اور ان کی خدمت کی شرطوں کا تعین کرے گا۔ وفاقی محکموں کی مختلف

عہدوں پر گورنر جنرل تقرر کرے گا جو سنٹرل سروس سے متعلق ہوں گی۔ ان میں ریلوے، ٹپہ، تار اور جنگی کے محکمے شامل ہوں گے۔ انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس اور انڈین پولیس سرویس کے تقررات وزیر ہند کی جانب سے عمل میں آئیں گے اور ان کے متعلق خدمت کی شرطوں کا تعین پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری سے ہوگا۔ صوبوں میں آبپاشی کے محکمے کے اعلیٰ عہدوں پر بھی وزیر ہند اپنی صوابدید سے تقررات کرے گا۔ متذکرہ بالا سروسوں میں اس وقت جو اشخاص شریک ہیں ان کے جملہ حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ اور اس کا بھی انتظام کیا جائے گا کہ آئندہ جو لوگ ان میں شریک ہوں وہ قدیم روایتوں کو برقرار رکھ سکیں۔ جو نئے تقررات ان خدمتوں پر آئندہ کئے جائیں گے ان کے متعلق اس امر کی ضمانت کی جائے گی کہ اگر کوئی خدمت تخفیف کردی جائے یا سیاسی وجوہ کی بنا پر کسی کو اپنی خدمت سے قبل از وقت سبکدوش ہونا پڑے تو ان لوگوں کو جو ان حالات سے متاثر ہونگے خاطر خواہ معاوضہ دیا جائے تاکہ ان کا کوئی مالی نقصان نہ ہو۔ کوئی شخص جو متذکرہ بالا خدمتوں میں سے کسی پر فائز ہو وہ اس وقت تک برطرف یا معزول نہیں کیا جاسکے گا جب تک کہ اس کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ وفاقی محکموں کی حد تک گورنر جنرل اور صوبجاتی محکموں کے متعلق گورنر قاعدے اور ضابطے نافذ کرے گا جن کا اطلاق مذکورہ سروسوں کے اشخاص پر ہوگا۔ پراونشل سروسز آل انڈیا سروس کے دوش بدوش صوبوں کے نظم ونسق کو چلائیں گی اور ان کے قابل اور سینیر ارکان کی مقررہ تعداد کو آل انڈیا سروسوں میں شریک کیا جاسکے گا تاکہ وہ ترقی کی انتہا تک پہنچ سکیں۔

گورنر جنرل ایک وفاقی پبلک سروس کمیشن مقرر کرے گا۔ کمیشن کے نصف ارکان ایسے اشخاص ہونے چاہئیں جو تقرر کے وقت کم سے کم تاج کی خدمت میں دو سال سے ہوں۔ گورنر جنرل کی اجازت سے وفاقی پبلک سروس کمیشن صوبوں کے لئے کام کرسکے گا۔ لیکن معمولاً صوبوں کے لئے علٰحدہ صوبجاتی پبلک سروس کمیشن ہونے چاہئیں جن کے ارکان کا تقرر گورنر کرے گا۔ آپس کے

سمجھوتے سے کئی صوبے مل کر اپنے لئے ایک مشترک کمیشن مقرر کر سکتے ہیں۔ وفاقی پبلک سروس کمیشن کا صدر آیندہ ہندوستان میں کسی سرکاری عہدہ پر مامور نہ ہو سکے گا۔ یہ شرط اس واسطے رکھی گئی ہے تاکہ وہ اپنے فرائض نہایت بے باکی اور غیر جانبداری سے ادا کرے اور چونکہ اُس طرح اسے اپنے متعلق کچھ امیدیں نہ ہوں گی اس لئے وہ بے رو و رعایت تمام تقررات کیا کرے گا۔ پبلک سروس کمیشن مختلف محکموں کے متعلق امیدواروں کے امتحان کا انتظام کرے گا اور گورنر جنرل کو مشورہ دے گا کہ تقررات کن اصول کے تحت ہونے چاہئیں۔ مختلف محکموں میں ترقی اور تبادلے کے قاعدے بھی کمیشن کے مشورے سے بنائے جائیں گے۔ بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے مقننہ میں کوئی ایسا مسودۂ قانون نہیں پیش کیا جا سکے گا جس سے پبلک سروس کمیشن کے فرائض میں تبدیلی ہوتی ہو۔

مرکزی وفاقی اور صوبوں کی حکومتوں کے متعلق قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کا نفاذ ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔ قانون میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ صوبوں کی حکومتوں میں اس کے نافذ ہو جانے کے بعد وفاقی مقننہ کے جملہ فرائض جہاں تک برطانوی ہند کا تعلق ہے موجودہ مرکزی مقننہ ادا کرے گی وفاقی عاملہ کے اختیارات گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو حاصل ہوں گے۔ لیکن گورنر جنرل اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس وقت تک وزیر ہند کے احکام کے پابند ہوں گے جب تک کہ وفاق قایم نہ ہو جائے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس کا مجاز نہ ہوگا کہ وہ حکومت ہند کی ضرورتوں کے لئے انگلستان میں قرض لے سکے۔ ہاں وزیر ہند پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد حکومت ہند کے لئے انگلستان میں جدید صوبجاتی حکومتوں کے قیام اور مرکزی وفاقی حکومت کے قیام سے پہلے قرض لینے کا مجاز ہوگا۔ وفاق قایم ہونے کے پیشتر وفاقی ریلوے کا بورڈ، وفاقی پبلک سروس کمیشن اور وفاقی عدالت کا قیام عمل میں آ سکے گا۔ ۳ جولائی ۱۹۳۶ء کے آرڈر ان کونسل میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جدید صوبجاتی حکومتوں

کے قیام کا جہاں تک تعلق ہے قانون دستور کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہو جائے گا۔ مرکزی حکومت میں اس کی وجہ سے جو تبدیلیاں عمل میں آئیں گی اور اس کی ذمہ داری کی نوعیت میں جو فرق پیدا ہوگا اس کے متعلق بھی اس درمیانی زمانے کے لئے جب تک کہ وفاق کا قیام عمل میں نہ آئے اس آرڈران کونسل میں ہدایت کر دی گئی ہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے جس حصے کا تعلق مرکزی وفاقی حکومت سے تھا نافذ نہیں کیا جا سکا اس واسطے کہ ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے بھی اس کو پسند نہیں کیا۔ لیکن ہر جماعت نے اس ناپسندیدگی کے مختلف اسباب بتلائے۔ کانگریس نے وفاقی اسکیم کو اس لئے نہیں پسند کیا کہ اس کی رو سے مرکزی وفاقی حکومت بالکل غیر ذمہ دار ہوگی اور اس کے نافذ ہونے سے اسی قسم کا طرز حکومت قایم ہوگا جس کا تجربہ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کے بعد صوبوں میں کیا گیا تھا۔ یعنی نظم ونسق سے بعض امور منتخب شدہ وزیروں کے تحت ہوں گے اور بیشتر اہم امور براہ راست گورنر جنرل سے متعلق رہیں گے جو وزیر ہند اور پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس طرح ایک قسم کی دوعملی (ڈیارکی) کا نظام مرکزی حکومت میں رائج ہو جائے گا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے مطابق گورنر جنرل کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات سونپ دئے گئے ہیں اور حکومت کا عاملانہ اقتدار پوری طرح اس کی ذات میں مرکوز ہوگا۔ اس کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کی صراحت قانون دستور میں موجود ہے اور ان کے علاوہ اس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہوں گے جو براہ راست تاج سے اس کو سپرد کئے گئے ہوں۔ بہ حیثیت وائسرائے اس کو والیان ریاست پر بالادستی کے اختیارات (پیراماؤنٹ سی) حاصل رہیں گے جو دستور کے سے کسی طرح متاثر نہ ہوں گے۔ گورنر جنرل اپنی خاص ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے جو پارلیمنٹ کی جانب سے اس کے سپرد کی گئی ہوں وفاقی نظم ونسق کے بیشتر اور نہایت اہم امور میں اپنے اختیار تمیزی کے مطابق عمل کرنے کا مجاز ہوگا۔ مالیات دفاع اور امور خارجی کے محکمے پوری طرح اس کے

سخت ہوں گے۔ ان امور کے انجام دینے کے لئے وہ خود اپنے مشیر مقرر کرے گا اور ان کے اخراجات کی منظوری دینے کا مجاز ہوگا۔ اس طرح وفاقی امور کے بہت زیادہ حصے کے متعلق مقننہ کی آواز بے اثر رہے گی۔ گورنر جنرل کے مخصوص ذمہ داریوں کا دائرہ اور ان کے متعلق اس کے اختیارات اس قدر وسیع رکھے گئے ہیں کہ وہ وفاقی حکومت کے تقریباً ہر شعبہ میں اپنے منشا کو من مانے طور پر موثر بنا سکتا ہے۔ وزیر اس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اس طرح مجوزہ وفاقی دستور کے مطابق حکومت کی جو تشکیل عمل میں آئے گی وہ قطعاً غیر ذمہ دار ہوگی۔ ان وجوہ کی بنا پر کانگریس نے وفاقی اسکیم کو عمل میں لانے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگ نے وفاقی اسکیم کو اس لئے ناقابل قبول بتایا کہ اس میں اقلیتوں کی نمایندگی کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔ ریاستوں کے نمایندوں کو ملاکر وفاقی مقننہ میں غیر مسلموں کی تعداد مناسب حد سے بڑھ جائے گی۔ اور چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ ایک عرصے تک ہندوستان اس قسم کے سیاسی شعور سے محروم رہے گا جس کی بدولت سیاسی اور معاشی محرکات انتظامی معاملوں میں فیصلہ کن ثابت ہوں اس لئے ضروری ہے کہ مذہبی اور تمدنی اقلیتوں کو انھیں اصول کی بناء پر اپنے بقا اور حفاظت کا اہتمام کرنا چاہیئے جو اس ملک میں عام طور پر برتے جاتے ہیں۔ مسلم لیگ نے یہ خطرہ بھی محسوس کیا کہ چونکہ مرکزی وفاقی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے اس لئے کہیں ان صوبوں کی خود مختاری بے اثر نہ ہو جائے جہاں ان کی اکثریت ہے اور جن کی حکومت میں وہ اپنی مرضی کو مناسب حدوں کے اندر موثر بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ کوئی دستور جو اس کی پوری ضمانت نہ کرے قابل قبول نہیں ہو سکتا اگرچہ اختیارات باقی (ریزیڈوری رائٹس) صوبوں کو حاصل ہوں گے لیکن وفاقی حکومت مختلف طریقوں سے دخل دینے اور اپنی مرضی موثر بنانے کے عذر تلاش کر سکتی ہے۔

غرضکہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے خاص وجوہ اور اسباب کی بنا دیر مرکزی وفاقی دستور کو عمل میں لانے اور اس ضمن میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن دستور کے اس حصہ پر جس کا تعلق صوبوں کے انتظام سے تھا دونوں جماعتوں کو اتنی شدت سے اعتراض نہ تھا اس لئے وہ نافذ ہو سکا۔ فیض پور کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس کو آئندہ صوبوں کے انتخاب میں باقاعدہ حصہ لینا چاہئے تاکہ جدید دستور کے بموجب مقننہ میں جاکر اور حکومت قایم کرکے جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں انھیں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ جنوری اور فروری ۱۹۳۷ء میں جو صوبوں کے انتخابات ہوئے ان میں کانگریس نے ۱۱ صوبوں میں سے ۶ میں (یو-پی، بہار، اوڑیسہ، سی-پی، مدراس اور بمبئی) میں اکثریت حاصل کرلی۔ صوبہ سرحدی میں صرف چند کی کمی پوری ہو جانے سے کانگریس کی اکثریت ہو جاتی تھی چنانچہ چند مہینے بعد دوسری سیاسی جماعتوں کے ارکان کی شرکت سے اس صوبہ میں بھی کانگریس کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ بنگال، آسام، پنجاب اور سندھ میں غیر کانگریسی وزارتیں قایم ہوئیں

صوبوں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دہلی منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبوں میں عہدے قبول کر لینے چاہئیں۔ اس اجلاس میں قطعی فیصلہ کرنا اس واسطے ضروری تھا کہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے اس حصہ کا نفاذ جو صوبوں کی حکومتوں کے متعلق تھا طے شدہ امر تھا۔ مارچ ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتہ میں حسب دستور گورنروں نے کانگریس پارٹی کے لیڈروں کو وزارتیں قایم کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کی قرارداد کے بموجب گورنروں کے خصوصی اختیارات کے متعلق اطمینان حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن گورنروں نے اس کا یہ جواب دیا کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے گورنر اپنے خصوصی اختیارات کے متعلق مطلوبہ وعدہ نہیں کر سکتے کہ وہ انھیں استعمال نہ کریں گے۔ دستور جدید اور ہدایتوں کی دستاویزوں کے بموجب خصوصی اختیارات کے استعمال اور اقلیتوں کے

مفاد کے تحفظ کی بابت ان پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر گورنر خود بھی ان اختیارات سے دست بردار ہونا چاہئیں تو وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ گورنروں کو خاص ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جن میں اقلیتوں کے جائیز حقوق کا تحفظ بھی شامل ہے۔ جب تک اس قسم کی ذمہ داریاں ان پر عاید ہیں ان کو مختلف موقعوں پر اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرنا پڑیگا۔ اگر گورنر اس قسم کا وعدہ کریں جیسا کہ کانگریس نے طلب کیا ہے تو وہ اپنی صوابدید پر عمل کرنے کے مجاز نہیں رہیں گے۔ اِس چھ صوبوں کی کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ چونکہ گورنر انھیں اطمینان دلانے سے انکار کرتے ہیں اس لئے وہ وزارتیں قبول کرنے سے معذور ہیں۔ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے ۸ ر اپریل کو پارلیمنٹ میں جو بیان دیا اس میں صراحت کردی کہ اگر کانگریس صوبوں میں وزارتیں قایم کرنے کو تیار نہیں ہے تو اقلیتوں کی وزارتیں قایم کردی جائیں گی۔ چنانچہ کانگریسی لیڈروں کے انکار پر گورنروں نے اقلیتوں کی عارضی وزارتیں قایم کریں۔ بہت دنوں تک یہ قانونی بحث جاری رہی کہ آیا گورنر اس کے مجاز ہیں یا نہیں کہ اس قسم کی عارضی وزارتیں قایم کریں۔ حکومت کے حامیوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگلستان کی گزشتہ صدی کی تاریخ میں عارضی وزارتوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ چونکہ کانگریس نے باوجود اکثریت رکھنے کے وزارتیں قایم کرنے سے انکار کردیا ہے اس لئے ان صوبوں کے گورنروں کے پاس اب کوئی چارہ کار اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ وہ ملک معظم کی حکومت کو چلانے کے لئے اقلیتوں کی عارضی وزارتوں کی تشکیل کریں۔ اس قسم کے غیر معمولی حالات میں گورنروں کو اپنے وزیروں کے انتخاب میں کافی آزادی حاصل ہونی چاہئے تاکہ حکومت کی مشین کو چلایا جاسکے۔ اس کے برخلاف کانگریس کے حامیوں نے یہ ثابت کیا کہ موجودہ عارضی وزارتیں ناجائز اور خلاف قانون ہیں۔ کانگریس کے قانون و دستور کے ماہروں کا یہ دعوی تھا کہ گورنر دستور جدید کی دفعوں سے تجاوز کئے بغیر مجوزہ وعدے کرسکتے ہیں لیکن اقلیتوں کے نمایندوں میں سے

عارضی وزارت قایم کرنا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ اس واسطے کہ گورنر کی ہدایتی دستاویز کی دفعہ (۸) میں اس کی صراحت کردی گئی ہے کہ وزارت کی تشکیل گورنر اس شخص کے مشورے سے کرے گا جو مقننہ میں اکثریت رکھنے والی جماعت کا لیڈر ہو۔ قانون دستور جب پارلیمنٹ میں زیر بحث تھا اس وقت صوبجاتی آزادی کی جو تصویر دکھائی گئی تھی وہ موجودہ حقیقت سے بالکل مختلف تھی۔ قیام امن و اماں کی ذمہ داری جو گورنر کے سپرد کی گئی ہے وہ اس قدر وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ وہ وضع قوانین کے حق پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس طرح گورنر کی حیثیت بجائے دستوری صدر عاملہ کے حقیقی صدر عاملہ کی ہو جاتی ہے جو پارلیمنٹ کے منشاء کے خلاف ہے۔

غرضکہ اس دوران میں کانگریس اور حکومت کے سیاسی تعلق میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کے ارباب حل و عقد نے اپنے لب و لہجہ کو بدلنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ لارڈ زیٹلینڈ وزیر ہند نے اپنی تقریر میں اور لارڈ لن لتھگو وائسرائے ہند نے اپنے طولانی بیان میں صاف طور پر کہا کہ منتخب شدہ وزیروں کی آزادی عمل میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ بھی کہا کہ انڈین سیول سروس کے ارکان جیسا کہ گزشتہ تین مہینے کے تجربے سے ثابت ہو گیا ہے نئے دستور کے تحت اسی طرح اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں جس طرح وہ صوبوں کی پرانی حکومت کے اصول کار کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ اگر کوئی گورنر اپنے وزیروں کے مشورے پر عمل نہیں کرے گا تو وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا کرے گا۔ ایسی صورت میں وزیر اس کے مجاز ہوں گے کہ وہ بذریعہ اعلان اس کا اظہار کر دیں کہ فلاں معاملہ میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور یہ کہ انھوں نے گورنر کو اس کے خلاف عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ معمولاً گورنر تمام معاملوں میں جن میں اقلیتوں اور انڈین سیول سروس کے معاملے بھی شامل ہیں وزیروں کے مشورے کے مطابق عمل کرے گا۔ اپنی خصوصی ذمہ داریوں کے علاوہ نظم و نسق کے کسی اور معاملے میں گورنر وزیروں کے مشورے

کے بغیر عمل نہیں کرے گا۔ وزیروں کی ذمہ داری اپنی مقننہ کے روبرو رہے گی نہ کے پارلیمنٹ کے سامنے۔

وائسرائے کے اس بیان میں سمجھوتے اور صلح کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا اسکا کانگریسی حلقوں میں اچھا اثر ہوا۔ چنانچہ ۷، جولائی ۱۹۳۷ء کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کے بموجب یہ طے پایا کہ کانگریس اپنے تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے ان اختیارات کو استعمال کرے جو دستور کی رو سے صوبوں کی حکومتوں کو حاصل ہوئے ہیں تاکہ عوام کی حالت کو بہتر بنایا جاسکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ کانگریس نے جدید دستور کو قابل اطمینان قرار دے کر قبول کر لیا ہے۔

کانگریس کی طرح مسلم لیگ نے بھی مرکزی وفاقی دستور کو غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے صوبوں کے انتخابات کی مہم میں پورا حصہ لیا اس لئے کہ اس کو خوف تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کی سیاسی حیثیت متاثر ہوگی۔ فیض پور کانگریس میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ کانگریس کو چاہئے کہ مسلم عوام میں اپنا اثر بڑھائے۔ اس کو مسلم لیگ نے اپنے لئے مہلک تصور کیا اور اس کے خلاف سخت ردعمل رونما ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ملک کے ہر گوشہ سے نمایندوں نے شرکت کی اور نہایت اہم اور دور رس تجویزیں منظور کیں۔ سب سے زیادہ اہم تجویز یہ تھی کہ مسلم لیگ کا اصلی مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی قرار دیا جائے۔ جہاں تک نصب العین اور مسلک کا تعلق ہے مسلم لیگ کانگریس کے بہت قریب آگئی لیکن عملی طور پر ان دونوں سیاسی اداروں کی دوری اور کشیدگی برابر بڑھتی رہی۔ مسلم لیگ کا اثر ملک کے ہر گوشہ کے مسلمانوں پر پڑا اور مسلم عوام کے ساتھ اس کا ربط وضبط پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ قوی ہو گیا۔ انتخابات کے بعد لیگ نے کانگریس سے مخلوط وزارتیں قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا لیکن اس ضمن میں کوئی مفاہمت کی صورت نہ نکل سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشیدگی میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ کانگریسی صوبوں کے انتظام کے متعلق

لیگ نے یہ اعتراض کیا کہ وہاں مسلمانوں کے حقوق کی دیکھ بھال نہیں کی جارہی ہے اور اسی قسم کا اعتراض کانگریس کی طرف سے ان صوبوں کے انتظام پر کیا گیا جہاں مسلم لیگ کی وزارتیں قایم تھیں۔ مسلم لیگ نے اپنی تمام شکایتوں کو جو کانگریسی حکومت کے خلاف تھیں ایک رپورٹ میں مرتب کیا جسے پیرپور رپورٹ کہتے ہیں۔ اس دوران میں مسٹر جناح صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس مسٹر سوباش چندر بوس اور گاندھی جی سے کئی مرتبہ مصالحت کی گفتگو ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ اس کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت سمجھا جائے جسے کانگریس ماننے کو تیار نہ تھی اس واسطے کہ قوم پرست مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کانگریس میں شریک تھی۔ اب تک مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ بہ حیثیت ایک اقلیت کے کر رہی تھی لیکن مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے یہ اعلان کردیا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور انھیں حق خود ارادیت حاصل ہے۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک علیحدہ مملکت قایم کرنے کا تصور دن بدن نشو و نما پاتا گیا۔ ان صوبوں میں سندھ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، مغربی منطقہ میں اور بنگال اور آسام مشرقی منطقہ میں شامل ہیں۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے پر وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو نے کانگریس اور مسلم لیگ اور دوسری اقلیتوں کے لیڈروں کو مشورے کے لئے طلب کیا۔ اس وقت پھر کانگریس اور مسلم لیگ کی مصالحت کا سوال اٹھا۔ وائسرائے کی دعوت پر گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مسٹر جناح میں مصالحت کے متعلق بات چیت ہوئی لیکن اصلی بات مبہم رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مقاصد جنگ کو وضاحت سے بیان کرے تاکہ معلوم ہو کہ جنگ کے بعد ہندوستانیوں کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی۔ آیا ہندوستان اسی طرح محکوم رہیگا جیطرح اب ہے۔ کیا ہندوستانیوں کو جنگ کے ختم ہونے پر آزادی حاصل ہوگی یا نہیں

وائسرائے اور وزیر ہند نے اس ضمن میں یہ تو تسلیم کر لیا کہ قلمرو ی مرتبہ کی حکومت ہندوستان کا سیاسی نصب العین ہے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ جنگ کے ختم پر اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ کانگریس نے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر آٹھوں صوبوں کی وزارتوں کو استعفا دینے کا حکم دے دیا۔ ان وزارتوں کے مستعفی ہونے پر سوائے آسام کے جہاں متبادل وزارت قایم ہو گئی باقی سات صوبوں میں گورنروں نے قانون حکومت ہند کی دفعہ (۹۳) کے تحت صوبوں کے انتظام اور وضع قانون کے جملہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تاکہ صوبوں کا انتظام چلایا جا سکے۔ یہ تعطل کی حالت دوران جنگ میں قایم رہی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹافرڈ کرپس ملک معظم کی حکومت کی جانب سے ہندوستان آئے اور انھوں نے تعطل کو توڑنے کے لئے ایک سیاسی پیشکش پیش کیا۔ اس میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وعدہ کیا گیا کہ جنگ ختم ہونے پر ایک دستور ساز مجلس کو ہندوستان کا دستور بنانے کا کام سپرد کیا جائے گا اور ہندوستان میں ایک آزاد یونین قایم ہوگا جس میں ریاستیں بھی صوبوں کے ساتھ شریک ہوں گی۔ اگر ہندوستان چاہے تو سلطنت برطانیہ سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق کر سکتا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ ان تمام امور پر حاوی ہوگا جن کے ذریعہ ہندوستانیوں کو مکمل ذمہ داری سپرد کی جا سکے۔ ہندوستان کو اس کا حق بھی حاصل ہو جائے گا کہ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قایم کر سکے۔ لیکن دوران جنگ کے لئے کرپس نے جو تجویز پیش کی اس کے بموجب جنگ کا انتظام حکومت ہند کے موجودہ محکموں ہی کے سپرد رہے گا کیونکہ دستوری تبدیلیوں سے اس میں برہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اقلیت کے مسئلہ پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور کرپس کا پیشکش رد کر دیا گیا۔ کانگریس کو اندیشہ تھا کہ کرپس کی تجویزوں کی رو سے صوبوں کو یونین سے الگ ہونے کا حق ہو جاتا ہے اور مسلم لیگ کو خدشہ

تھا کہ تجویزوں میں اتنی حد بندیاں ہیں کہ صوبے یونین سے الگ نہیں ہو سکیں گے اور ان کی خود ارادیت مرکزی اثرات کی وجہ سے بہت کمزور ہو جائے گی۔ غرضکہ تعطل کی حالت ان تجویزوں کے بعد بھی برقرار رہی۔

ریاستیں اور وفاق برطانوی بالا دست قوت (پیرا ماؤنٹ پاور) نے مخصوص معاہدوں کے تحت ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمے لی۔ برطانوی بالا دست قوت کا اثر مختلف ریاستوں میں مختلف نوعیت رکھتا ہے جو ان روایتوں کے تابع ہے جو پچھلے ڈیڑھ سو سال میں حکومت ہند اور ان کے درمیان قایم ہو گئی ہیں۔ رسم و رواج کی بناء پر حکومت ہند نے ریاستوں کے متعلق بعض خاص اختیارات حاصل کر لئے ہیں جو تحریری معاہدوں کی حدوں سے باہر ہیں لیکن رسم کے لحاظ سے موثر ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء تک ریاستوں کا تعلق حکومت ہند سے رہا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ حکومت ہند کی تشکیل مختلف زمانوں میں بدلتی رہی لیکن باوجود ان تبدیلیوں کے حکومت ہند کے احکام، فیصلوں اور مداخلت کو بالا دست قوت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ گول میز کانفرنسوں کے موقع پر ریاستوں نے وفاق میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی تھی اس شرط سے کہ ان کے تاریخی حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد بالا دست قوت یا حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی من مانی دخل دہی کی کچھ روک تھام ہو سکے گی لیکن انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ بالا دست قوت کی دخل دہی کے اختیارات بدستور برقرار رکھے جائیں گے اور ان کے علاوہ اندیشہ ہے کہ وفاقی حکومت کا اقتدار بھی بعض امور کے متعلق قایم ہو جائے گا۔ پھر اس کے علاوہ برطانوی ہند کی جمہوری تحریکوں کی طرف سے بدظنی کے باعث والیان ریاست نے صاف طور پر اس کا اظہار کر دیا کہ وہ انفرادی طور پر جس دستاویز شرکت (انسٹرومنٹ آف اکسیشن) کے ذریعہ وفاق میں شریک ہوں گے اس کی نوعیت ایک معاہدہ کی سی ہونی چاہیے تاکہ وہ اس میں اپنے حقوق کے

تحفظ کی پوری طرح وضاحت کردیں اور ان کی حیثیت اور اختیارات کے متعلق آئندہ کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ والیان ریاست کے حقوق اور مراتب کا تحفظ کریگا۔ اس کا فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ وفاقی حکومت کے وزیروں کا کوئی فعل یا وفاقی مقننہ کا منظور کیا ہوا کوئی قانون ریاستوں کے ان حقوق کو متاثر تو نہیں کرتا جو انھیں معاہدوں اور تہ ناموں کے ذریعہ حاصل ہیں۔ لیکن مرکزی مقننہ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ دستاویز شرکت کے دائرے کے اندر کسی ریاست سے متعلق قانون سازی کرے۔ اگر وفاقی مقننہ کا بنایا ہوا کوئی قانون کسی ریاست کے باقی اختیارات کو جو اسے حاصل ہیں متاثر کرتا ہو یا والی ریاست کے حقوق اس سے متاثر ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں گورنر جنرل اپنی خصوصی ذمہ داریوں کے تحت اس کے حقوق کا تحفظ کرے گا۔ اگر گورنر جنرل یہ دیکھے کہ کسی ریاست میں وفاقی قوانین کا نفاذ جس کارکردگی کے ساتھ ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہورہا ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ والی ریاست کو مناسب ہدایات دے۔ اگر دستاویز شرکت کی توجیہ کے سلسلہ میں وفاقی حکومت اور کسی ریاست کے درمیان اختلاف ہو تو اس کا تصفیہ وفاقی عدالت کرے گی۔ وفاقی حکومت کو یہ اختیار ہوگا کہ ریاستوں میں ریاست کی عاملہ اور عہدہ داروں کے ذریعہ سے وفاقی قوانین کا نفاذ کرائے یا اگر وہ چاہے تو متعلقہ ریاست میں اپنے حکام مقرر کردے۔ وفاقی مقننہ اپنے اختیارات وضع قانون کسی ریاست میں اس حد بندی کے مطابق استعمال کرسکے گی جس کی صراحت دستاویز شرکت میں کردی گئی ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی ریاست سکہ سازی اور کرنسی کو وفاقی حکومت کے سپرد نہ کرے تو وفاقی مقننہ وفاقی کرنسی اور سکہ سازی کو اس ریاست کی حد تک رواج دینے پر اصرار نہ کرے گی، لیکن وفاق کے دوسرے اجزاء کو بھی اس بات پر مجبور نہیں کرسکے گی کہ ریاست مذکور کے سکہ یا کرنسی کو اپنے یہاں رائج کریں۔

یہ صحیح ہے کہ اگر وفاقی مقننہ ریاستوں میں ایسے قوانین کو نافذ کرنا چاہے جن کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جو دستاویز شرکت میں درج ہیں تو ایسی صورت میں متعلقہ ریاست اس معاملہ کو وفاقی عدالت میں پیش کرنے کی مجاز ہوگی۔ لیکن اگر وفاقی عدالت ریاست کے اس دعوے کو ناواجب قرار دے تو ریاست کچھ نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ ایوان والیان ریاست اور وزیروں کی کمیٹی نے ملک معظم کی حکومت کو اس جانب متوجہ کیا اور مطالبہ کیا کہ وفاقی مقننہ کے اختیار وضع قانون کی اس طرح سے حد بندی کی جائے کہ وہ ایسے امور کے متعلق کوئی قانون سازی نہ کر سکے جس کے لئے دستاویز شرکت کی رو سے وہ مجاز نہیں ہے۔

وفاقی عدالت کو ریاستوں سے متعلق مرافعہ کے جو اختیارات ہیں ان کے بموجب اگر وہ کوئی فیصلہ صادر کرے تو ریاست کے حکمران سے اس کی تعمیل کی درخواست کرے گی۔ اگر کوئی والی ریاست اس فیصلہ کی تعمیل سے انکار کر دے تو اس کی صراحت نہیں کی گئی کہ ایسی صورت میں وفاقی عدالت کیا چارہ کار اختیار کرے گی۔ وفاقی عدالت کو ریاستوں کے ہائیکورٹوں پر بھی کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا۔ ریاستوں کے ہائیکورٹوں کا رتبہ وہی ہوگا جیسے کسی آزاد غیر ملک کی اعلیٰ عدالت کا ہوتا ہے[1]۔

قانون دستور میں وفاقی حکومت کے اخراجات کی پابجائی کے لئے جو آمدنی کے ذریعے خاص کئے گئے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا براہ راست اثر ریاستوں کی آمدنی پر بھی پڑے گا۔ وفاقی حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ کروڑگری کا محصول ہے۔ دراصل سوائے ٹراونکور، کوچین اور ساحلی ریاستوں کے باقی سب ریاستیں بالواسطہ مرکزی حکومت کو کروڑگری ادا کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ پچھلے چند سال سے ریاستوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ انھیں کروڑگری کی آمدنی کا ایک حصہ واپس ملنا چاہئے اور

[1] Vardarajan, The Indian States and the Federation, p. 233

ٹبلر کمیٹی نے بھی اس دعوے کو حق بجانب بتلایا۔ ساحلی ریاستوں میں کچھ ایسی ہیں جنھوں نے بندرگاہیں بنانے پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی ہیں اور اب تک وہ درآمد پر اسی طرح محصول لگانے کی مجاز رہی ہیں جس طرح حکومت ہند درآمد پر محصول لگاتی ہے۔ ان حقوق کا احترام ضروری ہے جو اس ضمن میں معاہدوں کے ذریعہ ریاستوں کو حاصل ہوئے ہیں۔

کروڑگیری کے علاوہ نمک اور تمباکو پر بھی بعض ریاستیں محصول لگانے کا حق رکھتی ہیں۔ یہ دونوں محصول وفاقی حکومت کے لئے خاص کئے گئے ہیں ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند نے شکر اور دیاسلائی پر جب محصول (اکسائیس) لگائے تو ریاستوں سے اس ضمن میں ایک الگ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے ریاستوں کو ان کی حدود میں ان اشیاء کے صرف کی مناسبت سے رقم واپس کرنا تجویز ہوا۔ لیکن قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب اکسائیس کی جو تقسیم اجزا کے درمیان ہوگی اس کا تعین وفاقی مقننہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔[1]

کارپوریشن ٹیکس اور زاید محصول آمدنی بھی وفاقی مالیات کے ذریعوں میں شامل ہیں۔ کارپوریشن ٹکس وفاق قایم ہونے کے دس سال بعد ان ریاستوں میں جو وفاق میں شریک ہوگئی ہیں اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح برطانوی صوبوں میں ان ٹکسوں کی وصولی کا یہ طریقہ تجویز کیا گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ مرکزی حکومت انھیں براہ راست وصول کرے خود ریاستیں معینہ رقم کو مرکزی خزانہ میں داخل کر دیا کریں گی محصول آمدنی کی رقم کو مرکزی حکومت صوبوں پر تقسیم کر دیا کرے گی لیکن ریاستوں کو اپنے حصے سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں ریاستوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دستاویز شرکت کے ذریعہ بعض وفاقی محصولوں سے استثنا حاصل کر سکتی ہیں کہ بے اس کے ان کے لئے ناممکن ہوگا کہ اپنے بجٹ کو متوازن رکھ سکیں۔ اگر کسی ریاست کو اس بات کا پوری طرح

[1] Vardarajan, The Indian States and the Federation, p 115

اطمینان نہ ہو کہ جو محصول وفاقی حکومت نے شخصیتوں (کارپوریشنز) پر لگایا ہے وہ انصاف سے دور ہے تو وہ اس معاملہ کو وفاقی عدالت میں پیش کرنے کی مجاز ہوگی اور اس کے متعلق وفاقی عدالت کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے گا۔

جو ریاستیں وفاق میں شریک ہوں گی ان میں سے اگر کوئی حکومت ہند کو اس کی بالادستی کے سبب سے خراج کی رقم ادا کرتی ہوگی تو وفاق کے قیام کے بعد ۲۰ سال تک وفاقی حکومت اس سے کچھ وصول نہیں کرے گی۔ اگر کسی ریاست نے فوجی خدمت کے عوض حکومت ہند کو کچھ علاقے حوالے کئے ہیں تو ان کے معاوضہ میں وفاقی حکومت اس ریاست کو کچھ رقم ادا کر سکتی ہے۔ لیکن خراج سے دست کشی یا ریاستوں کو کسی رقم کی مستقل ادائی اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک کہ وفاقی حکومت مالی اعتبار سے اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ صوبوں کو آمدنی کے محصول (انکم ٹیکس) میں سے ان کا مقررہ حصہ رسدی نہ دینے لگے۔ ریاستوں کی شرکت کی دستاویزوں میں اس قسم کے تمام مسائل کا تعین کر دیا جائے گا جن کے مطابق وفاقی حکومت اور ریاستوں کے تعلقات تشکیل پائیں گے۔

قانون دستور کی رو سے وفاق اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ریاستوں کی کافی تعداد اس میں شریک ہونے پر راضی نہ ہو جائے جن کے تحت ہندوستان کی کل ریاستوں کی آبادی کا نصف ہو۔ اور وفاقی ایوان بالا کی نصف نشستیں جو ریاستوں کے لئے خاص کی گئی ہیں بھر نہ جائیں۔ ریاستوں کو وفاقی اسمبلی میں (۳۷۵) میں سے (۱۲۵) نشستیں اور کونسل آف اسٹیٹ میں (۲۶۰) میں سے (۱۰۴) نشستیں حاصل ہوں گی۔ اسطرح ان کی نمایندگی ایوان بالا میں ۴۰ فی صدی اور ایوان زیریں میں تقریباً ۳۳ فی صدی رہے گی۔ ریاست حیدرآباد کو اس کی آبادی رقبہ اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے دونوں ایوانوں میں دوسری ریاستوں سے زیادہ نمایندگی کا حق دیا گیا۔ چنانچہ ایوان بالا میں پانچ اور ایوان زیرین میں اس کے سولہ

نمایندے ہوں گے۔ وفاقی مقننہ میں جب ایسے معاملے پیش ہوں جن کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہو تو ریاستوں کے نمایندوں سے توقع کی جائے گی کہ وہ بحث میں حصہ نہ لیں۔

حکومت ہند کو تاریخی طور پر پہلے سے جو بالادستی کے حقوق حاصل ہیں وہ برقرار رہیں گے۔ وفاقی حکومت کا حکم ریاستیں صرف ان معاملوں میں مانیں گی جنھیں مشترک اغراض کے تحت انھوں نے وفاق کے حوالہ کر دیا ہوگا لیکن اگر وفاقی حکومت اور کسی ریاست کی حکومت میں اختلاف ہو گا تو وفاقی عدالت اس کے متعلق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ کے متعلق وفاقی حکومت دخل دینا یا قانون بنانا چاہتی ہے جس پر متعلقہ ریاست کو اعتراض ہے تو معاملہ وفاقی عدالت میں پیش کیا جا سکے گا جس کا فیصلہ قطعی تصور ہو گا۔

پچیسواں باب

برطانوی عہد میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی حالت

کسی ملک کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کا مدار اس تعلیمی نظام پر ہوتا ہے جو اس ملک میں رائج ہو۔ انگریزی عملداری کے قایم ہونے سے پہلے ہندوستان میں دو قسم کے تعلیمی نظام تھے۔ ایک ہندوؤں کا اور دوسرا مسلمانوں کا۔ لیکن ان کے علاوہ ایسے مدرسے بھی تھے جن میں ہندو اور مسلمان ساتھ ملکر ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چونکہ سرکاری زبان فارسی تھی اس واسطے ان مدرسوں میں اس زبان کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا اور دفتری ضرورتوں کے مدنظر انشاء کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انگریزی حکومت نے شروع میں ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ۱۸۳۳ء کے قانون منشور کے منظور ہونے کے بعد میکالے نے اس ضمن میں ایک یادداشت تیار کی جسے حکومت ہند نے قبول کرلیا۔ اس یادداشت کے بموجب مشرقی علوم کی سرپرستی کے بجائے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی ترقی پر حکومت نے اپنی آمدنی کا نہایت کم حصہ خرچ

کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میکالے کا خیال تھا کہ انگریزی زبان ہی کے ذریعے ہندوستانیوں کی ذہنی ترقی ممکن ہوگی۔

اگرچہ ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کو رائج ہوئے سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے لیکن انگریزی زبان ملک کی قومی زبان نہ بن سکی جیمز مل نے میکالے کی یادداشت پر تنقید کرتے ہوئے جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس نے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی یہ توجہ دلائی تھی کہ ہندوستانیوں کے اصول تعلیم کو یکایک اس طرح بدل دینے سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ ہندوستانی نوجوانوں پر انگریزی تہذیب و تمدن کا ہلکا سا اوپری رنگ چڑھ جائے گا جس کا کوئی گہرا اثر ان کی سیرت پر نہ ہوگا۔ اور انگریزی زبان کو حقیقی علوم کی تحصیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ملازمت حاصل کرنے کا ایک وسیلہ بنایا جائے گا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے انگریزی علوم کی تحصیل اس ملک میں عام طور پر اسی واسطے کی گئی کہ اس کے ذریعہ سے رزق کا دروازہ کھلتا تھا اور دنیاوی ترقی کے اسباب فراہم ہوتے تھے۔ باوجود اس امر کے کہ انگریزی حکومت نے اپنے وسیع اور موثر وسیلے انگریزی زبان کی ترویج کے لئے استعمال کئے لیکن پھر بھی پورے ملک میں صرف تھوڑے سے لوگ اس قابل ہو سکے کہ وہ اس زبان میں اپنے خیالات بے تکلف ادا کر سکیں۔ عوام اس زبان سے قطعاً ناواقف رہے۔ میکالے کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ عوام کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتوں کی تکمیل کرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرصے تک انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنے آپ کو ایک بالاتر مخلوق سمجھتے تھے اور جس طرح ملک میں اور بہت سی ذاتیں تھیں اسی طرح انگریزی تعلیم یافتوں کی ایک ذات بن گئی جو عوام سے کسی قسم کے ربط و تعلق کو اپنے لئے ذلت سمجھتی تھی۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں جو یونیورسٹیاں قایم ہوئیں وہ لندن یونیورسٹی کے نمونے کی

تھیں جن کا مقصد امتحان لینا تھا نہ کہ طلبہ کی تربیت اور ان کی سیرت کی تشکیل۔ پھر پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسیٹیاں بھی اسی اصول پر قایم ہوئیں ۱۹۱۸ء کے سیڈلر کمیشن نے اس تعلیمی نظام کو مضر بتلایا اور امتحان لینے والی یونیورسیٹیوں کے بجائے ایسی یونیورسیٹیاں قایم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جہاں طلبا، ایک قسم کی اجتماعی زندگی خاص فضا میں بسر کرسکیں اور اقامتی زندگی ان کی خاص خصوصیت ہو۔ چنانچہ علیگڈھ، بنارس اور عثمانیہ یونیورسٹی اسی اصول پر قایم کی گئیں جن میں امتحان کے ساتھ تربیت کا بھی پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دہلی، آگرہ، لکھنؤ، ڈھاکہ، میسور، آندھرا، انا ملے اور ٹراونکور میں یونیورسیٹیاں کھل جانے سے پچھلے پچیس تیس سال میں اعلیٰ تعلیم نے ملک میں بہت کافی ترقی کی ہے۔

سر چارلس وڈ کے ۱۸۵۴ء کے مراسلہ کے بعد ہندوستان میں ہر صوبہ میں ایک محکمۂ تعلیم قایم کر دیا گیا تھا جس کے ذمہ تعلیم کی مقامی ضرورتوں کی پابجائی قرار پایا تھا۔ صوبوں کے محکمۂ تعلیمات کے تحت وسطانی اور تحتانی تعلیم کو ترقی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اکثر صوبوں میں بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے تحت رکھی گئی۔ صوبوں کی حکومت ان کی مالی امداد کرتی تھی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام کو ابتدائی تعلیم دینے کا فرض حکومت نے جس طرح چاہیے تھا اس طرح پورا نہیں کیا۔ چنانچہ آج بھی ڈیڑھ سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد ملک میں تقریباً دس فی صدی لوگ ایسے ہیں جو پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ابتدائی تعلیم کے رواج پر خاص توجہ کی گئی ہے تاکہ قوم سے جہالت کو دور کیا جائے اور عوام کو اس قابل بنا یا جائے کہ وہ دنیا کے معاملوں کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں اور اپنی روٹی آپ کما سکیں۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں سب سے بڑا اور سب سے اہم تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جہاں اردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید اور مشرقی

ومغربی علوم وفنون کو اس طور سے ملایا جائے کہ موجودہ تعلیمی نظام کے نقائص دور ہو جائیں اور قدیم وجدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہوسکے اور علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی اور نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام جاری ہوسکے۔ اگرچہ تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی ہے تاکہ مغربی علوم وفنون کے چمنستانوں سے خوشہ چینی ممکن ہو۔ جامعہ عثمانیہ میں اُردو زبان کو جان بوجھ کر اس واسطے تعلیمی ذریعہ قرار دیا گیا کہ یہ زبان ایک مشترک ورثہ ہے جو وطنی بھائیوں کو اپنے بزرگوں سے ملا ہے اور جو بقول سر تیج بہادر سپرو وہ ناقابل تقسیم ہے۔ تعلیمی نفسیات کے ماہروں کے ہاں یہ امر مسلم ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی اور ذہنی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ وہ قوم خود اپنی مادری زبان کو حصول تعلیم کا ذریعہ نہ بنائے۔ بحمد اللہ کہ جامعہ عثمانیہ کا تجربہ امید سے زیادہ کامیاب رہا۔ اور اب یہ ایک تجربہ کی حد سے گزر کر ایک حقیقت حاضر بن گیا ہے جس کے اثرات کو اس کے مخالف بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ گزشتہ پچیس سال میں اس جامعہ کے فرزندوں نے علم وفن کے مختلف شعبوں میں جو شہرت اور ناموری پائی ہے وہ ان تعلیمی اصول کے صحیح ہونے کی ضمانت ہے جو اس جامعہ میں رائج کیے گئے ہیں۔ ان اصول کی کامیابی کی ایک اور بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں آج ان کی پیروی کی جارہی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ انگریزی حکومت کے توسط سے ہندوستان میں یورپ کے جدید خیالات کا گہرا اثر پڑنا شروع ہوا جس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ انگریزی تعلیم کے باعث ہندوستانیوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں جو عرصے سے آب بستہ کی طرح تھی نئی نئی لہریں اٹھنے لگیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں بنگال میں راجا رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنا ڈالی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندو جاتی کی بُری رسموں

کو ترک کیا جائے اور یورپ کے جدید معاشرتی اور تمدنی خیالات کو قبول کر لیا جائے اور انھیں اپنی زندگی میں اس طرح سمویا جائے کہ وہ بالکل فطری معلوم ہونے لگیں۔ اس تحریک سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بنگال اور شمالی ہند کے ہندوؤں میں معاشرتی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ ذات پات اور چھوت چھات کی سختی پہلے کے مقابلے میں کم ہونے لگی اور پست طبقوں کے انسانی حقوق کو تسلیم کیا جانے لگا۔ پست طبقوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنی اہمیت اور حیثیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں پست اقوام کے رائے دینے والوں کی تعداد کافی بڑھا دی گئی ہے جس کے سبب سے ان کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سیاسی حقوق ملنے سے انھیں دوسرے طبقوں کے برابر ہونے میں مدد ملے گی۔ اور آہستہ آہستہ ان میں سے افلاس اور جہالت دور ہو جائے گی۔ ان کی آبادی کا اندازہ پورے ملک میں چھ کروڑ کے قریب کیا گیا ہے ان کی زندگی سدھر لنے سے پورے ملک کو فائدہ ہو گا اور جوں جوں ان کا معیار حیات بلند ہوتا جائے گا اور ان میں تعلیم کی اشاعت ہو گی اسی قدر ملک کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائیگی۔ یہ مثل ان کے ضمن میں صادق آتی ہے کہ کسی زنجیر کی مضبوطی کا معیار اس کی سب سے کمزور کڑی ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے پست طبقوں کی جتنی ترقی ہو گی اتنی ہی ملک کی مجموعی ترقی میں مدد ملے گی۔

مسلمانوں میں سر سید احمد خاں نے انیسویں صدی عیسوی کے آخری تیس سالوں میں اسی قسم کی تحریک شروع کی تھی جیسی راجا رام موہن رائے نے کچھ عرصہ پہلے ہندوؤں میں کی تھی۔ اس تحریک کا بھی یہ مقصد تھا کہ مسلمان مغربی تعلیم و تمدن سے پورا فائدہ اٹھائیں اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جو عام پستی ان پر چھا گئی تھی اس کو دور کریں۔ اگر وہ مغربی تعلیم و تمدن کے اصول سیکھنے میں ملک کے دوسرے جتھوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے تو ان کا مستقبل نہایت تاریک ہو گا۔ پہلے پہل مسلمانوں کے پرانے خیال والے طبقے نے سر سید احمد خاں کی تحریک کی سخت مخالفت کی۔

لیکن آہستہ آہستہ ان کی اصلاحی تحریک کا اثر ہوا اور مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کی طرف اس لئے توجہ کی گئی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ملک کے دوسرے جتھوں کے مقابلہ میں پیچھے نہ رہیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد انگریزی تعلیم کے اثر سے ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کے اثر سے قومیت کا احساس پیدا ہوا تھا۔

غرض کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تعلیم پھیلنے سے بیداری آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یورپ کے تمدن کی اصل میں بنیاد یہی تنقید ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستانی اپنی قدیم معاشری رسموں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو گئے تاکہ زندگی کی ترقی میں رکاوٹ باقی نہ رہے۔ مگر اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ہر بات میں یورپ کی نقل اور تقلید کرنے لگا اور اپنے تمدن و تہذیب پر بھروسا باقی نہ رہا۔ لیکن اس قسم کے خیالات زیادہ دونوں تک باقی نہیں رہے۔ بہت جلد ہندوستان کے سمجھ والوں نے محسوس کر لیا کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی نقل سے ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ہر گروہ میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مغربی علوم و فنون حاصل کرنے اور اپنی معاشری اصلاح کرنے کے ساتھ اپنی تہذیب و تمدن پر بھروسہ کرنے کی تعلیم دی۔ غرض کہ اہل ہند میں اب ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے جو مغربی تمدن کی بعض خوبیاں ماننے کے باوجود اپنی ہر چیز اور اپنی ہر رسم کو حقیر اور برا نہیں خیال کرتا اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ اس کو اس کا احساس ہے کہ کسی قوم کی تاریخ ہی اس کے اجتماعی وجود کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ تاریخ محض واقعات اور حوادث کا بے معنی انبار نہیں بلکہ وہ وسیلہ ہے اجتماعی شعور اور سیرت کو قومی کرنے کا۔ تاریخ کے لگاتار تغیر اور تخلیق سے انسانی اداروں کی وحدتیں وجود میں آتی ہیں۔ اور پھر یہ بدل کر دوسری صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کی وحدت بھی برقرار رہتی ہے اور برابر تغیر بھی ہوتا رہتا

ہے جو زندگی کی خاص خصوصیت ہے۔ زندگی اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنے مستقل رہنے والے اور تغیر پذیر عنصروں میں ملاوٹ کرتی رہتی ہے۔ انفرادی ذہن کی طرح ایک اجتماعی ذہن بھی ہوتا ہے جو اپنے ساتھ ماضی وابستہ رکھتا ہے اور جس کی جلو میں قومی روایتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ انسان اپنے عملوں اور کوششوں کے معیار کو اخلاقی حیثیت سے بلند کرنے کے لئے انھیں روایتوں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یہ سانچہ تاریخ ہے جس کی بدولت عمل کو وقار اور قدر نصیب ہوتی ہے۔ اپنی تاریخ اور روایتوں کا دامن چھوڑ کر کوئی قوم اعلیٰ قسم کی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔

انگریزی تعلیم کے ذریعہ اہل ہند مغربی تمدن کے اصول سے واقف ہوئے۔ مغربی تمدن کی بنا تنقید پر قایم ہے جو سائنس کی روح ہے۔ سائنس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے وسیلوں کو ترقی دیتا اور فطرت کے چھپے ہوئے بھید معلوم کرتا ہے۔ گزشتہ چار سو برس میں یورپ والوں نے مشاہدہ و تجربے سے مظاہر فطرت کا کھوج لگایا اور اپنی ایجاد و تسخیر سے کائنات کے گوشہ گوشہ پر اپنا سکہ بٹھایا۔ سائنس یا علم فطرت شعوری یا غیر شعوری طور پر اس جماعت کو قوت عطا کرتی ہے جو اسکے قوانین پر قابو رکھتا ہو۔ مغرب والوں کا غلبہ اور تصرف محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں وہی بنیادی اسباب کارفرما ہیں جن کے باعث دوسرے تمدنوں نے تاریخ میں فضیلت حاصل کی۔ سائنس کی استقرائی تحقیق سے یورپ والوں نے قوت و تصرف حاصل کیا اور وہ ایک تجربے سے دوسرے تجربے تک پہنچے۔ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ ایجاد و تسخیر کی بے پناہ قوتیں سوتے سے جاگ اٹھیں۔ اور انسان کی ان سب رکاوٹوں کو ایک ایک کرکے دور کیا جو اس کے لئے سنگ راہ بنی کھڑی تھیں اور جن کی وجہ سے اشیا کے تعلقات میں عدم آہنگی پیدا ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندوستانی یورپ کی جدید سائنس کے اصول سے آشنا ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی کمزوری اور نامرادی سائنس سے ناواقفیت کی بناء پر ہے۔ چنانچہ سائنس کی تعلیم

کی طرف توجہ کی گئی۔ لیکن جتنی توجہ کرنی چاہیے تھی اتنی نہیں ہوئی اس لئے کہ حکومت کی پالیسی یہ نہیں تھی کہ ہندوستانی سائنس پڑھ کر اپنے ملک کی صنعت وحرفت کو ترقی دیں بلکہ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ اسے سستے داموں کلرک ملجائیں جو انتظام کی مشین چلانے میں مدد دے سکیں۔ لیکن اب کچھ عرصے سے ہندوستانیوں نے یہ بات محسوس کرلی ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ سائنس کے اصول عام طور پر زراعت اور صنعت وحرفت اور عملی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہ استعمال کئے جائیں۔ پچھلے سالوں میں ہندوستان میں بعض نامور سائنس داں پیدا ہوئے جن کے نام اس ملک کے باہر بھی عزت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ سر جگدیش چندر بوس، سر سی وی رامن، مگناتھ سہا اور کرشنن کے نام اس ضمن میں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

جدید تعلیم کے اثر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں کافی ترقی ہوئی۔ گزشتہ زمانے میں ہندوؤں کا ادب اور آرٹ ایک خاص ڈھرے پر چل رہا تھا اور اس میں بہ مقابلہ ذاتی اپج کے رسم ورواج اور تقلید پر زور دیا جاتا تھا مغربی تصنیفوں کے اثر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں نئے نئے طرز خیال رواج پا رہے ہیں۔ سب سے پہلے بنگالی ادب نے مغربی اثر کو قبول کیا۔ رابندرا ناتھ ٹیگور نے اپنی نظموں، ناٹکوں اور مضامین سے بنگالی زبان کو مالا مال کردیا۔ ان کی تصنیفوں کے ترجمے دنیا کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو مصنفوں میں رتن ناتھ سرشار، خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی اور شمس العلما آزاد نے زبان کو بڑی ترقی دی اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ زندگی کے سنجیدہ موضوعوں کے متعلق خیالات ادا کرسکے۔ اکبر الہ آبادی اور اقبال نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دئیے۔ اقبال نے اپنی شاعری کو ایسے بلند خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا کہ اس کی مثال دوسری زبانوں میں کم ملے گی۔ ٹیگور اور اقبال کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ دوسری دیسی

زبانوں میں بھی پچھلے پچاس سالوں میں اعلیٰ درجے کے ادیب، شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی اپنی مقامی زبانوں کی بڑی خدمت کی اور اس طرح عوام تک اعلیٰ خیالات پہنچائے۔

دیسی زبانوں کی ترقی میں اخباروں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ انگریزی حکومت نے شروع ہی سے دیسی زبانوں کے اخباروں پر بندشیں عائد کیں تاکہ وہ سیاسی خیالات کی اشاعت نہ کریں لیکن لبرل خیالات کے زیر اثر آہستہ آہستہ یہ بندشیں باقی نہیں رہیں اس وقت ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہزاروں اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ بعض رسالے نہایت بلند پایہ ہیں جن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ہندوستانیوں کے بہترین دل و دماغ اپنی مادری زبانوں کو ترقی دینے کی جانب متوجہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت ہے کہ ادب کے علاوہ علوم و فنون پر بھی دیسی زبانوں میں بلند معیار کے رسالے شائع ہوں کہ بغیر اس کے کسی زبان کی ترقی ادھوری رہتی ہے۔

عہد جدید میں ہندوستانیوں نے فنون لطیفہ میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ فن تعمیر میں انیسویں صدی میں انگریزی طرزوں کی نقالی کے سبب سے جو بد مذاقی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو رہی ہے۔ فن تعمیر کے متعلق یہ کہنا درست ہو گا کہ ہندوستانیوں نے پرانی طرزوں کو تو چھوڑ دیا ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسی طرز نہیں نکالی جو ان کی زندگی اور موجودہ حالات کی آئینہ دار کہی جا سکے اور جس کی بدولت زندگی کے جدید تقاضوں کی تکمیل ہو۔ لیکن یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ چاہے ہماری جدید عمارتوں کے طرز میں اگلے زمانے کی عمارتوں کے طرز کی تازگی اور قوت نہ ہو لیکن ان میں حفظان صحت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور جدید ضرورتوں کے لحاظ سے آرام کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ ابھی ہندوستانیوں کو فن تعمیر میں اپنا قومی طرز دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے جو حکومت کے محکمۂ تعمیرات کے بے جان اور بے کیف طرز سے یقیناً مختلف ہو گا اور جس میں ان کی زندگی کی نئی ضرورتوں اور حسن تناسب دونوں کا

پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ مصوری میں پچھلے دنوں اچھی خاصی ترقی ہوئی ہے اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی روایتوں کی رمزوایما کے ذریعہ ترجمانی کی جا رہی ہے۔ اب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اپنے گھروں کو ادنیٰ درجے کی یورپ کی چھپی ہوئی تصویروں سے آراستہ کرنا بُرا سمجھنے لگے ہیں۔ اجنٹہ اور مغل آرٹ کی طرف پھر نگاہیں پلٹ رہی ہیں اور قدیم استادوں کی رنگ آمیزیوں کے جلوے نظروں میں سما رہے ہیں۔ نندلال بوس اور چغتائی کی تصویریں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس ملک سے باہر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں۔

ملک کی مادی خوش حالی کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کی برطانوی عہد کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو ساتھ ہی افلاس اور غربت کا بھیانک سماں سامنے آجاتا ہے۔ عہد مغلیہ میں مختلف صدیوں میں یورپ سے جو سیاح اس ملک میں آئے انھوں نے یہاں کی دولت، زرخیزی اور خوش حالی کے ذکر میں اپنے سفرناموں کے صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں پھر آخر یہ سب دولت اور تمول عہد برطانیہ میں کیوں غائب ہو گیا؟ اس سوال کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس ملک پر ایسی حکومت چھاگئی جس کے پیش نظر محض نفع کمانا تھا۔ یہ حکومت ان تاجروں کی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں لگائے ہوئے اپنے سرمایہ پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ کہ وہ اس نفع کو اس ملک میں نہیں بلکہ انگلستان میں خرچ کرتے تھے۔ شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستانیوں کی اخلاقی اور ذہنی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ارباب بست وکشاد بس ایک خواہش رکھتے تھے اور وہ یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے ان کے سالانہ منافع کی فیصد شرح میں اضافہ ہو۔ انگریزی تجارت کے نفع کمانے کا راز یہ تھا کہ ہندوستان سے جہاں تک ہو سکے سستے داموں کی خام اشیا برآمد کی جائیں اور مصنوعات کی درآمد کی جائے۔ اس طرح نہایت سائنٹفک اور منظم طریقے سے ملک میں نفع کمانے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان

کا دنیا کے سب سے مفلس ملکوں میں شمار ہونے لگا۔

ہندوستان میں انسانی اور معاشی وسیلوں کی کمی نہیں ہے۔ زمین کی زرخیزی کی دور دور دھوم ہے لیکن باوجود اس کے خدا کی وہ مخلوق جو اس زمین پر بستی ہے اس کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہیں۔ یورپ کے گاؤں میں جن مکانوں میں جانوروں کو رکھتے ہیں ان کی حالت یقیناً ان مکانوں سے کہیں بہتر ہے جن میں ہندوستانیوں کا زیادہ حصہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں سائنٹفک ترقی اور مشینوں کے ایجاد سے زبردست صنعتی انقلاب ہوا۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل میں جو غیر معمولی تبدیلی ہوئی اس کی وجہ سے ساری دنیا ایک منڈی بن گئی معاشی قوتیں اب ایک دو ملک کو نہیں بلکہ براعظموں کو اپنے اثرات میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان بھی ان عالمگیر معاشی قوتوں کی زد میں آیا اور انگریزی قوم اس کا وسیلہ بنی۔ برطانوی سیادت کو اس ملک میں قایم ہونے اور حکمرانی کا ڈول ڈالتے ہوئے کم و بیش ایک صدی لگ گئی۔ اس عرصہ میں جدید معاشی قوتیں چپکے چپکے اپنا کام کرتی رہیں۔ اور ان کا اثر برطانوی حکومت کی جلو میں خوب مستحکم ہو گیا۔ پھر سڑکوں ریلوں اور جہازرانی کی سہولتوں کے باعث ہندوستان کی خام اشیا، یورپ کی منڈیوں سے قریب آگئیں اور یورپ کی پیداوار اور مبادلہ کے طریقے کی ہندوستانی صنعت و تجارت میں بھی کار فرمائی ہونے لگی۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ہندوستان کی خارجی تجارت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعمیرات (پی۔ ڈبلو۔ ڈی) قایم کر کے سڑکوں اور ریلوں کے قایم کرنے کی جانب خاص توجہ کی تاکہ ہندوستان کی خام اشیاء آسانی سے بندرگاہوں تک پہنچ سکیں جہاں سے انھیں لاد لاد کر انگلستان کے کارخانوں تک پہنچایا جا سکے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں انگلستان میں نئے کارخانے بڑی تعداد میں قایم ہو گئے جن کے منافع کا انحصار

اس امر پر تھا کہ وہ خام اشیاء کو زیادہ سے زیادہ مصنوعات کی شکل میں بدل دیں۔

انگریزی عملداری قایم ہونے کے پہلے ہندوستان کی مصنوعات یورپ جایا کرتی تھیں اور خشکی کے راستے سے ہندوستان کا مال ایشیا کے تمام ملکوں میں پہنچتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور ریشمی کپڑوں کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاکموں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے کپڑے کی صنعت کو ختم کیا تاکہ انگریزی کارخانوں کے سامان کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ اب انگلستان میں بجائے ہندوستانی کپڑے کے ہندوستانی روئی کی قدر کی جانے لگی۔ روئی کو ہندوستان سے لے جاکر اور کپڑا بناکر اس کو ہندوستان میں من مانے داموں بیچا جانے لگا۔ روئی کی مانگ بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ہند اور بمبئی کے علاقوں میں کاشتکاروں نے غلہ بونے کے بجائے وسیع پیمانہ پر روئی کی کاشت شروع کردی ہندوستان کے دور افتادہ گاؤں میں کاشت کرنے والے دیہاتی نے یہ پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ مقامی حالات کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا اثر اس کی روایتی زرعی معیشت پر پڑسکتا ہے۔ اب گویا ہندوستان تجارت کے عالمگیر اثرات سے آہستہ آہستہ متاثر ہو رہا تھا۔ ہندوستانی صنعتیں حکمرانوں کی غیر ہمدردانہ پالیسی اور اپنے روایتی طریق پیدائش کی کمزوری کے سبب سے مغربی صنعت کے آگے ہار مان چکی تھیں جو اعلیٰ پیمانہ اور سائنٹفک اصول پر منظم ہو چکی تھی۔ ہندوستانی صنعت کی کس مپرسی کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ دیسی درباروں اور امیروں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریزی عملداری کے قایم ہونے کے بعد تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا جو نیا طبقہ وجود میں آیا اس کا ذوق بہت کچھ انگریزی اثرات سے متاثر تھا۔ اس کی قدروں کا معیار بہت پست تھا۔ وہ دیسی صنعت کی عمدہ اشیاء کو چھوڑ کر انگلستان کی بنی ہوئی ادنیٰ چیزوں پر ریجھتا تھا اس واسطے کہ انگریز آقاؤں کو خوش کرنا ہر طرح ضروری تھا۔ جب ہندوستانی صنعت کی خود اپنے ملک میں قدر نہ رہی

تو صنعت کاروں اور کاریگروں نے بھی زراعت کی طرف توجہ کی کہ روٹی ملنے کا لے دے کر یہی ایک سہارا رہ گیا تھا۔ غرضکہ انگریزی صنعت کو ایک پورا براعظم اپنی مصنوعات کی نکاسی کے لئے مل گیا۔ حکومت کی سرپرستی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جی کھول کر خوب نفع کمایا اور انگلستان کی دولت میں بے شمار اضافہ ہوا ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا لیکن اس انقلاب کے حادثوں نے ہندوستانیوں کو اپنے حکمرانوں کے سامنے اور بھی زیادہ بے بس کر دیا۔ کمپنی کی بجائے تاج کی حکومت آئی تو بھی انھوں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ہندوستانی اس زمانے میں ایک طرح کے اخلاقی خلا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا رواج بڑھ رہا تھا لیکن نئے تعلیم یافتہ طبقے نے اپنی قدروں کی دنیا اب تک تعمیر نہیں کی تھی۔ مذہب اور روایتوں کے بندھن ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ ان کی جگہ لینے کے لئے اور زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے کوئی اصول حیات مرتب نہیں ہوئے تھے جس سے اخلاقی اور روحانی ڈھارس ملے۔ بہت دنوں بعد انیسویں صدی کے آخر میں اس خلا میں کمی پیدا ہوئی اور قومیت کی تحریک نے جنم لیا۔ لیکن پہلے پہل قومیت فکر و عمل کے لئے محرک نہیں بنی تھی۔ کچھ تعجب نہیں کہ ان حالات میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے حکمرانوں کی ہدایت اور رہبری کے محتاج تھے۔ چنانچہ معاشی زندگی میں بھی حکومت ہی کے اشارہ پر سب کچھ ہوتا نظر آتا ہے۔ شورشِ عظیم کے بعد تاج برطانیہ کی حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اگلی ایک صدی میں دیسی صنعتوں کی بربادی سے ہندوستانیوں کو جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی اس طور پر ہونی چاہئے کہ زراعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے انگلستان کے مفاد کو کسی طرح بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا اس واسطے کہ انگلستان سے مقابلہ مصنوعات کے ضمن ہی میں ہو سکتا تھا۔ لیکن خام اشیا اگر اچھی اور بہتات میں ملیں تو اس سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اگر ضمنی طور پر ہندوستان کے کسان کا بھی تھوڑا بہت نفع ہو جائے تو کیا ڈر

ہے۔ اگر اس کی حالت بہتر ہوگی تو لگان بڑھانا ممکن ہوگا جو حکومت ہند کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ خاص طور پر دکن کے روئی کی کاشت کرنے والوں نے اس نئی پالیسی سے فائدہ اٹھایا۔ روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے تجربہ گاہیں اور فارم قایم کئے گئے۔ سڑکوں اور ریلوں کا جال ان علاقوں میں بچھا دیا گیا جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی تاکہ بمبئی کی بندرگاہ تک سامان کے پہنچنے میں سہولت ہو۔ بعد میں عام کسانوں کو ملک کے ہر حصے میں کچھ سہولتیں فراہم کرنے کا حکومت نے فیصلہ کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۴ء میں حکومت ہند نے "ایگری کلچرل اسٹس لونس ایکٹ" منظور کیا تاکہ ضرورت مند کسانوں کو برائے نام سود پر قرضہ دیا جائے اور لگان کی رقم کے ساتھ کئی قسطوں میں اس رقم کو وصول کیا جائے۔ لیکن کسانوں کی مصیبتوں کا علاج گورنمنٹ فارم قایم کرنے یا تقاوی کے طریقے کو رواج دینے سے ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ ملک کے پورے نظام معیشت کو بدلا جائے جس کے لئے انگریزی حکومت آج تک تیار نہ ہوسکی اس واسطے کہ وہ متوسط طبقہ کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی جو برابر اس کی پشت و پناہ رہا ہے۔

سائنس نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ لیکن اب اسوقت ہندوستان میں ریلوے لائنوں کی مجموعی پیمائش تقریباً ۴۵ ہزار میل ہے اور ملک کے تمام بڑے بڑے شہر ان سے منسلک ہوگئے ہیں ابتدا میں انگریز سرمایہ داروں نے ریلوے کی کمپنیاں قایم کیں لیکن پھر حکومت ہند نے ان کمپنیوں کو خرید لیا اور خود ریلوے قایم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریلوں کی توسیع سے فوجی مدافعت کی سہولتوں اور عام نظم ونسق کی کارکردگی میں اضافہ ہوا۔ معاشی اعتبار سے یہ فائدہ ہوا کہ پورے ملک میں قیمتوں کی یکسانی ہوگئی۔ زراعت جو مدتوں سے خارجی اثرات سے بے تعلق تھی ریلوے کے ذریعہ عالمگیر معاشی قوتوں سے ہم آہنگ ہوگئی۔ ممکن ہے ایک غیر ہمدرد بدیسی حکومت نے اس وسیلہ کو نفع کمانے کے لئے استعمال کیا ہو لیکن ایک قومی حکومت

اس ذریعہ سے ملک کی خوش حالی بڑھانے کا کام لے سکتی ہے۔ قومی تجارت کے علاوہ بین الاقوامی تجارت کا دارمدار ریلوں کی وسعت پر ہے لیکن ہندوستان کی ریلیں ملک کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں۔ اس کمی کا اندازہ دوسرے ملکوں سے مقابلہ ہی سے ممکن ہے۔ مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں سو مربع میل میں ۲ء ۸ میل ریلوے لائن موجود ہے اور ہندوستان میں سو مربع میل میں صرف ۲ء ۲ میل ریلوے لائن ہے۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان ایک براعظم ہے۔ اس ملک کی مادی ترقی کا دارمدار اس پر ہے کہ رسل ورسائل کی سہولتوں کی زیادتی ہو۔ سڑکوں اور ریلوں ہی کے ذریعہ دیہاتی علاقوں کا شہروں سے اتصال کیا جاسکتا ہے تاکہ ملک کی پیدائش دولت کے وسیلوں کو ترقی ہو۔

دنیا کے اکثر دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی صنعتوں کے مرکز جو گزشتہ پچاس سال میں خود ہندوستانیوں کی کوششوں کی بدولت قائم ہوئے ہیں شہروں میں واقع ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ جاپان کی صنعتوں کی طرح ہندوستان میں عدم مرکزیت کی پالیسی اختیار کی جائے تاکہ پورے ملک میں خوش حالی پھیلے۔ گھریلو صنعتوں کی ترقی سے یہ ممکن ہے کہ زراعت اور صنعت میں توازن قایم رہے اور پیدایش دولت کے یہ دونوں وسیلے ایک دوسرے کے حریف نہ بن جائیں۔ گھریلو صنعتوں کے ذریعہ صنعت اور زراعت میں توازن قایم کرکے قومی دولت کی تقسیم میں مساوات کا اصول سامنے رہنا چاہیے تاکہ یہ نہ ہو کہ امیروں کی دولت بڑھے اور غریبوں کی مفلسی۔ اعلیٰ صنعتوں کے ساتھ اگر گھریلو صنعتوں کی ترقی ہو تو ملک کی دولت میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہی حصہ دار نہ بنیں گے بلکہ چھوٹے سرمایہ والے بھی استفادہ کرسکیں گے اسطرح یہ ممکن ہوگا کہ بڑے بڑے صنعتی شہروں میں زیادہ آبادی ہو جانے سے جو معاشرتی اور دوسری بیسیوں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ پیدا نہ ہوں گی اور پورے ملک کے معاشی وسیلوں کو حرکت میں لایا جاسکے گا۔

جیسا کہ ابھی اوپر بتلایا گیا ہے انگریزی عملداری میں ہندوستان کی تجارت

کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ملک سے خام اشیا برآمد کی جائیں اور مصنوعات کی درآمد ہو۔ ہندوستان کی بیرونی تجارت کو ۱۸۶۹ء کے بعد سے بڑی ترقی ہوئی اس لئے کہ نہر سوئیز کے کھل جانے سے یہ ملک انگلستان کی منڈیوں سے کئی ہزار میل قریب آگیا۔ تجارت کی یہ ترقی گزشتہ سو سال میں برابر جاری رہی ہے چنانچہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً ۵۶ کروڑ روپیے کی برآمد ہوئی اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کے پانچ سالوں میں ۳۵۴ کروڑ روپیے کی برآمد ہوئی اور اسی عرصہ میں ۲۵۱ کروڑ روپیے کی درآمد ہوئی۔ ہندوستان کی تجارت انیسویں صدی کے آخر تک زیادہ تر انگلستان ہی سے تھی لیکن بیسویں صدی کے شروع میں امریکہ، جرمنی اور جاپان سے بھی وسیع پیمانے پر بیرونی تجارت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

ہندوستان کی قومی آمدنی باوجود رسل و رسائل کی سہولتوں اور بیرونی تجارت کی ترقی کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کا پیدائش دولت کا معیار پست اور جو کچھ بھی دولت ملک میں موجود ہے اس کی تقسیم ناقص ہے۔ دولت کا بڑا حصہ تھوڑے سے طبقہ کے پاس محدود ہے۔ اور جو تھوڑی سی دولت باقی رہ جاتی ہے اس سے آبادی کا بڑا حصہ گزربسر کرتا ہے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی دولت کے مقابلے میں ہندوستان کا افلاس اور زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ مثلاً جاپان میں فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ۲۱۷ روپیے ہے۔ جرمنی میں ۶۳۴ روپیے، فرانس میں ۶۳۶ روپیے، انگلستان میں ۱۰۹۲ روپیے اور اور ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۰۵۳ روپیے۔ برخلاف ان ملکوں کے ہندوستان کی فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط صرف ۸۲ روپیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالباً افریقہ کے چند ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے کسی دوسرے ملک کا اتنا پست معیار حیات نہیں جتنا کہ ہندوستان کے لوگوں کا ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت کپڑے کی صنعت ہے۔ سودیشی تحریک کی وجہ سے اس صنعت نے خوب ترقی کی۔ اس صنعت

کے مرکز بمبئی، احمد آباد، ناگپور اور شولاپور ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد یہ صنعت غیر معمولی طور پر بڑھی اور پھیلی۔ ۱۹۲۷ء کے بعد جاپان کے مقابلہ کی وجہ سے دیسی کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے کو تامین (پروٹکشن) حاصل ہے۔ ۱۹۳۷ء میں سارے ہندوستان میں کپڑے بنانے کے کارخانوں (ملوں) کی تعداد ۳۷۰ تھی۔ اس صنعت کا پورا سرمایہ ہندوستانیوں کا ہے اور اس کا انتظام بھی پورے طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کپڑے کے بعد سن (جوٹ) کی صنعت نے بنگال میں خوب ترقی کی۔ اس کے سو کارخانے ہیں لیکن اس صنعت کا سرمایہ اور انتظام زیادہ تر انگریز سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی جمشید پور میں قایم ہوئی۔ اس صنعت کو بھی باہر کے ملکوں کے مقابلہ میں ۱۹۲۴ء سے تامین (پروٹکشن) حاصل ہے۔ ٹاٹا کے اس کارخانے نے ملک کی لوہے اور فولاد کی ضرورتوں کو بڑی حد تک مہیا کر دیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے سے وسیع ملک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ابھی ایسے لوہے اور فولاد کے کئی کارخانے قایم کرنے ہوں گے۔ کوئی ملک اس وقت تک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ ہر قسم کی مشینیں خود نہ بنانے لگے اور اس ضمن میں دوسروں کا دست نگر نہ رہے۔

ہندوستان کی دوسری صنعتیں جنھوں نے پچھلے پچیس سال میں اچھی خاصی ترقی کی ہے یہ ہیں چمڑا، کاغذ، شکر، دیا سلائی اور سیمنٹ۔ ۱۹۲۱ء کے مالیاتی کمیشن کی سفارش پر تامین کے ذریعہ سے ان سب صنعتوں کو بیرونی ملکوں کے مقابلہ سے بچایا گیا ہے۔ کیونکہ بے اس کے ان کا پنپنا مشکل تھا۔ محصولوں کو مقرر کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک ٹیرف بورڈ قایم کر دیا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ ملکی صنعتوں کی ترقی کے متعلق حکومت کو وقتاً فوقتاً مشورہ دیتا رہے اور انھیں دوسرے ملکوں کے مقابلے سے بچانے کی تدبیریں کرتا رہے۔ لیکن تامین (پروٹکشن)

کے علاوہ صنعتوں کی ترقی کے لئے بنک کاری (بنکنگ) اور مارکٹنگ کی اعلیٰ پایہ کی تنظیم درکار ہے جس کی ہندوستان میں بہت کمی محسوس کی گئی ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم عام کی جائے تاکہ لوگوں میں پیدائش دولت کی عملی صلاحیتیں ترقی پائیں۔

غرضکہ اخلاقی اور مادی نقطۂ نظر سے ہندوستان نے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود اچھی خاصی ترقی کی ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی اس دستوری اور سیاسی ترقی سے بھی مطمئن نہیں ہیں جو پچھلے پچاس برس میں ہوئی ہے۔ وہ دنیا کی نظروں میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سیاسی بیداری کے ابتدائی زمانے میں وہ اس بات کو اہمیت دیتے تھے کہ انھیں بھی حکومت کے نظم ونسق میں برابر کا شریک بنایا جائے۔ لیکن اب ان کی اقدار (ویلوز) اور طرز فکر میں زبردست تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہ اب اپنے ملک کو بالکل خود مختار دیکھنا چاہتے ہیں جس طرح کہ دنیا کے دوسرے آزاد ملک ہیں۔ وہ اب ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے لئے آمادہ ہیں جو آزادی کی وجہ سے انھیں اٹھانا پڑے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اب بغیر کسی دوسری قوم کے سہارے کے وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ زندگی کی دشواریوں سے بچنے والی قوموں کا یہ مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی آزاد اور موثر اکائی کو کھو دیتی ہے۔ لیکن جو قوم زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو وہ اپنی زندگی کے اندرونی جوش سے نئے نئے حالات سے بخوبی مطابقت کر سکتی ہے اور اپنے مستقبل کو اپنے ماضی کی طرح شاندار بنا سکتی ہے۔ ہندوستانی اب اس کے لئے تیار ہو چکے ہیں کہ آزادی کی فضا میں جو بھی دشواریاں پیش آئیں ان سے عہدہ برآ ہوں اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کی طرح دنیا میں ایسا باعزت مقام حاصل کریں جس کے وہ مستحق ہیں۔

تمّت

اشاریہ

تاریخ ہند

عہد جدید

(ا)

(ب)

(پ)

(ڈ)

(ش)

(ص)

(ط)

ع

غ

(ف)

(ق)

گ

ل

م

(ھ)

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY No. 5192 Date 25.8.49 SRINAGAR

صحت نامہ

تاریخ ہند

عہد جدید

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۵۳	۱۴	نفع اندازی	نفع اندوزی	۲۴۱	۹	اسٹیونس	اسٹیونسن
۷۳	۱۲	کی	اکیں	۲۵۱	۱	جودپور	جودھپور
۷۵	۱۲	گی	کی	۲۵۳	۲۴	لارڈ ولزی	لارڈ ولزلی
۷۶	۱۶	لا	لا	۲۵۶	۱۹	جے کوبنز	جے کوبز
۷۷	۲۱	یہ دولت	بدولت	۲۵۸	۲۵	اڈمیرل رینبر	اڈمیرل رینیر
۸۳	۲۰	امارشیس	مارشیس	۲۶۲	۱۰	کارنولس	کارنوالس
۱۰۶	۲	کھا	لکھا	۲۶۹	۷	دوآنہ	دوآبہ
۱۳۰	۱۰	مصببت	مصیبت	۲۶۹	۱۳	تراس	تراش
۱۳۶	۱۴	بیچ	بیچ	۲۷۷	۱۶	بٹاویہ	بٹاویہ
۱۴۱	۵	مرھٹے	مرہٹے	۳۲۰	۱۵	راجپونانہ	راجپوتانہ
۱۴۳	۱۰	سرجان لنڈے	سرجان لنڈسے	۳۷۷	۲	جن کوجی سندھیا	جنکوجی سندھیا
۱۶۳	۱۵	سالٹ	سالسٹ	۳۸۹	۵	لفٹنٹ ایڈورز	لفٹنٹ ایڈورڈ
۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴	۱۷، ۱۲، ۱۶، ۲۴	مہاوجی	مادہوجی	۴۰۳	۱۴	تن	متن
				۴۲۹	۱۰	بارشمیں	مارشمین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۴۵۲	۷	سر ہنری رالنس	سر ہنری لارنس	۴۹۷	۱۷	طبیب جی	طیّب جی
۴۵۳	۱۳	(سنہ ۱۷۶۹ء تا سنہ ۱۷۷۲ء)	(سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۸۷۲ء)	.	.	.	.

تمّت

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 5192
Date 25.8.49
SRINAGAR